JEAN SAUSAN
PRINCESS
سنگین سماجی اور مذہبی پابندیوں میں جکڑی عرب شہزادی کی رنگین داستان
پرنسس
جین سوسن

The Princess

مصنفہ: جین ساسن

ترجمہ: محمد احسن بٹ

نگارشات پبلشرز

24- مزنگ روڈ، لاہور
فون 7322892 فیکس 7354205

الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ 40- اردو بازار، لاہور
فون 5014066 فیکس 7354205

e-mail:nigarshat@yahoo.com
www.nigarshatpublishers.com

پس منظر

میں جس ملک کی شہزادی ہوں وہاں آج بھی بادشاہی نظام رائج ہے۔ میں اپنا حقیقی نام ظاہر نہیں کر سکتی البتہ اس کتاب میں مَیں نے قلمی نام ''سلطانہ'' اختیار کیا ہے۔

میرا تعلق سعودی عرب کے شاہی خاندان سے ہے۔ کہنے کو میں آزاد پیدا ہوئی تھی لیکن جب مجھے شعور آیا تو مجھ پر یہ تلخ حقیقت کھلی کہ میں اَن دیکھی زنجیروں میں بندھی ہوئی ایک بے بس اور لاچار لڑکی ہوں۔ میں اپنے بچپن کے ابتدائی برسوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ ابتدائی عمر کے اس حصے میں میرا ننھا سا ذہن یہ بات ہرگز نہیں جانتا تھا کہ اس ملک میں مردوں کی حکومت ہے، زندگی کے ہر شعبہ پر ان کا غلبہ ہے، اور اس ملک میں کسی لڑکی کی کوئی حیثیت نہیں، چاہے وہ شاہی خاندان سے ہی تعلق رکھتی ہو۔ 1891ء کا سال آلِ سعود کے لیے منحوس ثابت ہوا۔ اس سال انہوں نے ایک لڑائی میں شکست کھائی اور اپنا علاقہ نجد چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔

جس وقت بادشاہ عبدالعزیز کے والد نے اسے اور اس کی بہن نورہ کو اونٹ کی خورجین میں چھپا کر بھاگنے میں اپنی خیریت جانی تو اس وقت بادشاہ عبدالعزیز ایک چھوٹا بچہ تھا۔ دو سال تک آلِ سعود نے صحرا کی خاک چھانی۔ اس کے بعد ریاست کویت میں جا کر پناہ لی اور وہاں رہتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالنے اور مضبوط بنانے کی

کوششیں کیں۔ بالآخر ستمبر 1901ء میں پچیس سالہ عبدالعزیز اپنا علاقہ حاصل کرنے کی نیت سے واپس آیا۔ اس نے دشمن کو مختلف محاذوں پر شکست دی۔ 16 جنوری 1902ء کو آل سعود اور آل رشید کے درمیان فیصلہ کن لڑائی ہوئی۔ اس لڑائی میں آل رشید کو بری طرح شکست ہوئی۔

بادشاہ عبدالعزیز ایک زیرک انسان تھا۔ اس کے علم میں تھا کہ جب تک وہ عرب کے صحرائی قبیلوں کو اپنے ساتھ نہیں ملائے گا تب تک وہ اپنے دشمن آل رشید کو شکست نہیں دے سکے گا۔ اس نے ان صحرائی قبائل کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے ایک زبردست چال یہ چلی کہ ان صحرائی قبائل میں شادیاں کیں۔ یوں اس نے تقریباً تین سو خواتین سے شادی کی جن کے بطن سے پچاس لڑکوں اور 80 لڑکیوں نے جنم لیا۔ ہر صحرائی قبیلے نے اپنی بیٹیوں کا اور اپنا شاندار اور محفوظ مستقبل دیکھتے ہوئے عبدالعزیز کو اپنا داماد بنا لیا۔ یوں عبدالعزیز نے دانائی کی بدولت ان جنگجو قبائل کی وفاداری حاصل کر لی اور ان کے دلوں کو بھی جیت لیا۔ عبدالعزیز کو اپنی بیویوں میں سے سب سے زیادہ محبت اور پیار حسا سدیری (Hassa Sudairi) سے تھا۔

سعودی عرب کا موجودہ بادشاہ فہد بن عبدالعزیز ہے۔ وہ بادشاہ عبدالعزیز کی سب سے پیاری اور چہیتی بیوی حسا سدیری (Hassa Sudairi) کا بیٹا ہے۔ میں یعنی پرنسس سلطانہ آل سعود کے عظیم رہبر' بادشاہ عبدالعزیز کی جائز اولادوں میں سے ایک ہوں۔ میں جب بھی ماضی میں جھانکتی ہوں تو مجھے سب سے پہلے اپنے اوپر کیے جانے والے تشدد کی یاد آتی ہے۔ وہ میرے ذہن پر آج تک نقش ہے۔ جب میں چار سال کی ایک چھوٹی اور معصوم بچی تھی تو میری ماں نے میرے گال پر تھپڑ مارا تھا۔ کیوں؟ یہ وہ واحد نمایاں یاد ہے جس کو میں آج تک نہیں بھلا سکی ہوں۔ یہ تشدد سوالیہ نشان بن کر میرے ذہن پر نقش ہے۔ اس وقت میں نے خود سے دو سال بڑے بھائی علی سے گویا اس طرح التجا کی تھی کہ جیسے وہ ایک دیوتا ہو۔ میں اس تلخ یاد کو بتیس سال گزرنے کے بعد بھی بھلا نہیں پائی اور اس تھپڑ کی جلن کو اسی طرح محسوس کرتی ہوں۔

میرے ذہن میں مختلف خیالات وسوالات نے جنم لینا شروع کر دیا کہ اگر مجھ سے صرف دو سال بڑا بھائی علی ہماری طرح ہی گوشت پوست کا انسان ہے تو پھر اسے دیوتا کیوں سمجھا جاتا ہے؟ درحقیقت عرب معاشرہ آج بھی انہی توہمات کا شکار ہے جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آ کر ختم کیا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے آنے سے پہلے عرب معاشرہ میں لڑکی کا پیدا ہونا نحوست تصور کیا جاتا تھا جبکہ لڑکے کا پیدا ہونا بہادری مردانگی اور خوشی کی بات سمجھی جاتی تھی۔ لڑکی کو پیدا ہوتے ہی مار دینا معمولی بات سمجھی جاتی تھی۔ اس جدید دور میں بھی عرب اپنے ہاں لڑکی کی پیدائش کو نحوست تصور کرتے ہیں۔ یوں جس گھر میں دس بیٹیاں اور ایک بیٹا ہو وہاں ہر وقت نحوست اور خوف کی حکمرانی ہوتی ہے۔ ہر بار جب میری ماں حاملہ ہوتی تو ہمیشہ لڑکا پیدا ہونے کی دعائیں مانگتی۔ یہاں تک کہ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو جاتا۔ مگر ہر بار اس کی دعائیں رائیگاں گئیں۔ لڑکے کی بجائے ایک کے بعد ایک لڑکی اس کے بطن سے جنم لیتی رہی۔ یہاں تک کہ میری ماں مایوس ہو گئی۔ اس کے اندیشے اس وقت صحیح ثابت ہوئے جب میرے والد نے ایک اور نوجوان لڑکی سے شادی کر لی کہ وہ اس کے لیے لڑکا پیدا کرے۔ جب اس نئی دلہن نے تین لڑکوں کو جنم دیا تو اسے میرے والد نے طلاق دے کر رخصت کر دیا کیونکہ اس سے مطلوبہ مقصد حاصل کر لیا گیا تھا۔ ہمارے ہاں جس کے لڑکے زیادہ ہوتے ہیں اسے بیٹوں کے معاملے میں امیر مرد سمجھا جاتا ہے' یوں زیادہ بیٹوں کے والد ہو جانے پر میرے والد امیر ہو گئے' مگر ان تمام لڑکوں میں میرا بھائی علی چونکہ سب سے بڑا تھا' اس لیے اسے سب پر برتری حاصل رہی۔ سب بھائی اور بہنیں اس کا احترام کرتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ میں ظاہری طور پر اس کی عزت کرتی مگر اندر ہی اندر اس سے شدید نفرت کرتی تھی۔

1946ء میں جنگ عظیم کے بعد ملک میں تیل کے ذخائر ختم ہو چکے تھے۔ برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل نے بادشاہ عبدالعزیز کو ایک انتہائی قیمتی رولز رائس کار تحفے میں دی۔ اس زمانے میں میرے والد نے میری ماں سے شادی کی تو اس وقت

میری ماں کی عمر صرف بارہ سال تھی جبکہ میرے والد بیس سال کے تھے۔ میرے والد ایک انتہائی سنگدل اور بے رحم آدمی تھے۔ اس کے برعکس میری معصوم ماں ایک نرم دل عورت تھیں۔ ان دونوں کے افسوس ناک ہنی مون کے نتیجے میں میری ماں نے سولہ بچوں کو جنم دیا، جن میں سے گیارہ بچے زندہ رہے۔ یہ سب کے سب جوان ہو چکے ہیں۔ مگر ان گیارہ افراد میں سے دس عورتیں، مردوں کے ظلم و ستم کا شکار ہیں۔ اس گھرانے کا واحد بیٹا، جو ایک سعودی ولی عہد اور بزنس مین بھی ہے، اپنی چار بیویوں اور بے شمار لونڈیوں کے ساتھ عیاشی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ معاشرے میں عورتوں سے جو سنگدلانہ رویہ روا رکھا جاتا ہے اس کا الزام ہرگز اسلام کو نہیں دینا چاہیے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو بچیوں، لڑکیوں اور عورتوں سے پیار، محبت اور نرمی والا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے۔ جتنے حقوق اور مقام اسلام میں عورتوں کو حاصل ہیں وہ کسی اور مذہب یا نظام میں نہیں ہیں۔ مگر مردوں نے ہمیشہ عورتوں کو ان کے حقوق اور مقام دینے کے معاملے میں اسلامی ہدایات پر عمل نہیں کیا بلکہ من مانیاں کی ہیں اور آج تک کر رہے ہیں۔

سعودی عرب میں بادشاہی نظام رائج ہے۔ اس شاہی نظام میں آج بھی حوا کی بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔ اس کے برعکس سعودی مرد کو لامحدود اختیارات حاصل ہیں۔ سعودی معاشرے میں بچپن ہی سے بیٹیوں کی برین واشنگ کی جاتی ہے کہ تم ہر حال میں خواتین سے برتر ہو۔ تمہارے سامنے خواتین کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ بے شک وہ تمہاری بہنیں ہی کیوں نہ ہوں۔ خواتین کا پہلا اور آخری مصرف صرف مردوں کی دل جوئی ہے۔ اس کے علاوہ سعودی والد اپنے بیٹے کے سامنے اپنی بیوی اور بیٹیوں کی بے عزتی کرتا ہے۔ انہیں ذرا ذرا سی باتوں پر مارتا پیٹتا ہے۔ یوں بیٹا بچپن سے لے کر مرتے دم تک عورت سے صحیح برتاؤ نہیں کرتا وہ اپنے آپ کو مالک تصور کرتا ہے اور عورت کو ایک معمولی سی "شے" یا ذاتی جاگیر سمجھتا ہے۔ عمر بھر کی رفیق کبھی نہیں! میرے ملک میں عورت کی قدر کوئی نہیں کرتا، حتیٰ کہ ایک حقیقی والد اور بھائی بھی۔ والد ساری زندگی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا ہے، بھائی ہر وقت ڈانٹتا اور تذلیل کرتا

رہتا ہے' اور جب لڑکی رخصت ہو کر دوسرے گھر جاتی ہے تو اس کی یہ خوش فہمی پہلے دن ہی ختم ہو جاتی ہے کہ اب وہ سکھ کا سانس لے سکے گی۔ اپنے گھر کو وہ اپنا گھر نہیں کہہ سکتی کیونکہ وہ خاوند کا گھر کہلاتا ہے اور خاوند' جو کہ سعودی معاشرے ہی کا ایک فرد ہوتا ہے' وہ بھی اپنی بیوی کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھتا ہے۔ یوں سعودی بیٹیوں کی زندگی اسی عذاب میں گزرتی ہے۔ ہمارے ملک میں خواتین کی ولادت اور وفات کا کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جاتا' کیونکہ ہمارے ہاں آج بھی بچی کی ولادت کو باعثِ شرم اور نحوست تصور کیا جاتا ہے۔

معزز قارئین! میں اس کتاب میں آل سعود کی ایک مظلوم شہزادی کی زندگی کی تلخ سچائیوں کو بیان کروں گی۔ یہ تلخ سچائیاں میری ان ابتدائی یادداشتوں میں سے ہیں جنہیں میں نے گیارہ سال کی عمر سے ایک ڈائری میں محفوظ کیا ہوا ہے۔ ان تلخ سچائیوں کی مدد سے میں عرب کی ان مظلوم خواتین کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کروں گی جنہیں اپنے ساتھ روا رکھے والا ناروا سلوک بیان کرنے کا موقع ہی نہیں مل پایا۔

یہ بظاہر ناممکن بات لگتی ہے کہ آل سعود کے محل کی کوئی حقیقت انتہائی سخت شاہی حفاظتی نظام کے ہوتے ہوئے دنیا کے سامنے آ جائے' لیکن میں اس کتاب کے ذریعے جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ سو فیصد سچ ہے۔

حصہ اول

پہلا باب

ہر انسان کے نزدیک اس کا بچپن ایک قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی خوشگوار سنہری یادوں کو تازہ کر کے خوش ہوتا ہے اور جب بھی اس کی کوئی ناخوشگوار سیاہ یاد تازہ ہوتی ہے وہ غمگین ہو جاتا ہے۔

وہ لوگ بہت خوش نصیب ہوتے ہیں جن کا بچپن خوشگواریوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مگر میرا بچپن دوسرے بچوں جیسا ہرگز خوشگوار نہ تھا۔ مجھے آج بھی وہ بات اچھی طرح یاد ہے جب میرے بڑے بھائی علی نے اپنے سرخ سیب کھا لینے پر مجھ پر تشدد کیا۔ چونکہ مین نے مرد کی برتری کو ٹھیس پہنچائی تھی۔ میرے بھائی نے مجھے تھپڑ مارا اور بوٹ کی دو تین ٹھوکریں ماریں۔ اس کے بعد وہ مجھے مزید سزا دینے کی غرض سے عمر کو بلانے چلا گیا۔ عمر ہمارے والد کا مصری ڈرائیور تھا۔ ہم تمام بہنیں عمر سے بھی تقریباً اتنی ہی ڈرتی تھیں جتنی علی اور اپنے والد سے۔

میری بہنوں نے خوفزدہ ہو کر گھر کے مردوں کے غصے سے بچنے کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دیا۔ جس وقت علی اور عمر تیزی سے اندر آئے تو مجھے اس بات کا یقین تھا کہ انہیں ہی حق بجانب سمجھے جائے گا۔ میں چھوٹی سی عمر میں ہی ایک حقیقت پا گئی تھی کہ علی جو کچھ جائز و ناجائز کام کرے گا اس کو کچھ نہیں کہا جائے گا اور اس کی ہر جائز و ناجائز بات تسلیم کی جائے گی۔ اس کے باوجود میں نے بڑے فخریہ اور فاتحانہ انداز سے علی کی طرف دیکھا۔

اس کے بعد جو کچھ میرے ساتھ ہوا۔ وہ عرب معاشرے میں عام بات ہے۔ بیٹے اور بیٹی کا معاملہ اگر والد کی عدالت میں آئے تو بیٹے کے قصوروار ہونے کے باوجود بیٹی ہی کو قصوروار ٹھہرایا جاتا ہے۔ جب مجھے والد کے سامنے پیش کیا گیا تو علی کو بولنے کی اجازت دی گئی مگر مجھے جواب دینے سے منع کر کے میرے حق سے محروم کر دیا گیا۔ جب میں نے اس زیادتی کو محسوس کیا تو میرے اندر اچانک حوصلہ اور بولنے کی قوت پیدا ہوئی اور میں نے اپنے آپ کو حق پر جانتے ہوئے زور زور سے بولنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر میرے والد اور بھائی کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا' کیونکہ جس معاشرے میں خواتین کو رائے دینے کا کوئی حق حاصل نہ ہو' بچپن کے ابتدائی سالوں میں ہی عورتیں اپنے ہونٹ بند رکھنا سیکھ جاتی ہیں۔ میں نے چونکہ اس کی خلاف ورزی کی تھی سو میرے والد نے مجھے بہت برا مارا اور سزا کے طور پر میرے سارے کھلونے علی کو دے دیئے اور علی کو ایک خصوصی اختیار بھی حاصل ہو گیا کہ آئندہ کھانے کی میز پر میری پلیٹ میں کھانا وہ ڈالے گا۔ علی نے میرے ساتھ مفتوحہ دشمنوں جیسا سلوک روا رکھا۔ کھانے کی میز پر وہ میری پلیٹ میں ہڈیاں ڈال دیتا۔ یوں میں ہر رات بھوکی سوتی۔ علی نے مزید ستم یہ کیا کہ میرے کمرے کے دروازے پر ایک غلام کو کھڑا کر دیا تاکہ گھر کے دوسرے افراد میرے کمرے میں کھانا نہ بھیج دیں۔ آخر ایک دن علی اس تشدد سے اکتا گیا' لیکن اس وقت سے' کہ جب علی صرف نو برس کا تھا' میں اسے اپنا دشمن سمجھنے لگی تھی۔

ہم ایک بہت بڑے محل میں رہتے تھے' جو سنٹرلی ایئر کنڈیشنڈ تھا۔ دیگر عربوں کی طرح ہمارے محل کے بھی دو حصے تھے: زنان خانہ اور مردان خانہ۔ محل کی دوسری منزل مردان خانہ کے لیے مخصوص تھی۔ میرے ابو اور بھائی علی اسی حصے میں رہتے تھے جبکہ خاندان کی خواتین کے لیے محل کی فرشی منزل مخصوص تھی۔ یہی ہمارا زنان خانہ تھا۔ ہماری خدمت پر مامور نوکر اس محل کے باغ کی پچھلی سمت میں واقع نہایت خستہ حال کمروں میں رہتے تھے۔ چونکہ میرے اندر تجسس کا مادہ زیادہ ہے اسی وجہ سے میں اکثر چپکے سے زنان خانہ سے نکل کر سب کی نظروں سے بچ کر مردان خانہ جاتی اور کمروں

میں جھانکتی، جہاں سے ترکی تمباکو اور وسکی کی بو آرہی ہوتی تھی۔ یہ بو مجھے ہمیشہ بری لگتی تھی۔ اسے سونگھنے سے میری حالت بہت خراب ہو جاتی تھی۔ میں سوچتی تھی کہ پتا نہیں اسے پینے سے کیا حال ہوتا ہو گا؟ اس وقت میں یہ سوچا کرتی اور پھر تیزی اور احتیاط کے ساتھ واپس فرشی منزل پر زنان خانے میں آجاتی تھی۔ جب میں پونے تین سال کی تھی اس وقت ہمارے راہنما شاہ عبدالعزیز اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ 1953ء کی بات ہے۔ شاہ عبدالعزیز کے انتقال سے ملک مین ایک سیاسی خلا پیدا ہو گیا، جسے ان کے جانشین شاہ سعود نے، جو کہ میرے چچا تھے، پورا کرنے کی کوشش کی۔ مگر میرے چچا شاہ سعود جانشینی کے قابل نہ تھے۔ وہ انتہائی عیاش اور نااہل آدمی تھے۔ ان کی عیاشی اور نااہلی کی وجہ سے ملک کا سیاسی اور معاشی بحران ختم ہونے کی بجائے تیزی سے بڑھتا چلا گیا جس کی وجہ سے حکمران خاندان کو شدید خطرات لاحق ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی ملک کا حکمران نااہل ہو تو اس کے خاندان کو ہر وقت اس کا تختہ الٹنے کا خطرہ رہتا ہے۔ مجھے تو دوسرے ممالک کے حکمرانوں کا زیادہ علم نہیں، البتہ ہمارے ہاں ایسے حکمرانوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے اس کا اندازہ آپ اس واقعے کو پڑھ کر لگا سکتے ہیں۔

یہ 1963ء کی بات ہے۔ اس وقت میری عمر سات سال تھی جب ہمارے محل کے مردان خانے میں شاہی خاندان کے تمام افراد جمع ہوئے۔ اس سے پہلے جب کبھی کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا تو اکثر ہمارے محل میں میرے والد، بھائی، ماموں، چچا اور ان کے بیٹے جمع ہو کر اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ اس دوران دیگر ملکی معاملات بھی زیر بحث آتے تھے۔ ایک بات یاد رکھئے گا کہ عرب مرد کبھی بھی اپنی عورتوں سے مشورہ نہیں لیا کرتے اور نہ ہی ان کی رائے کو قبول کرتے ہیں۔ عرب عورتوں کو مردوں کے معاملات میں دخل دینے کی قطعی اجازت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ان کی محفلوں میں کبھی بھی شریک نہیں ہوتی تھیں۔ سات پردوں میں چھپی ہوئی اور بے کیف زندگی ہمارا مقدر تھی۔ ہم عورتیں بے بس تھیں، کچھ کر بھی نہیں سکتی تھیں۔ میں نے اس سات پردوں میں چھپی ہوئی اور بے کیف زندگی کو ختم کرنے کا عزم کر لیا تھا اگرچہ ابھی اس

کے لیے موزوں وقت نہیں آیا تھا مگر میری نفرت نے میرے عزم کو پختہ کر دیا تھا۔
اسی عزم کے تحت میں اور میری بہنیں ان محفلوں کو چوری چھپے دیکھا کرتی تھیں۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ اسے جس کام کے کرنے سے منع کیا جائے وہ اسے لازمی کرتا ہے۔ تجربہ اور پھر تجسس انسان کی فطرت ہے۔ اسی تجربہ اور تجسس نے مجھے اور میری بہنوں کو یہ اقدام اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔ نااہل جانشین کا مسئلہ حل کرنے کے لیے آج ہمارے محل کے مردان خانے میں شاہی خاندان کے تمام افراد جمع تھے۔ ہمارے نظریں پورے اجتماع پر گھوم رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ہماری نظریں خوبصورت ذہین اور معصوم شہزادے فیصل پر پڑیں اور وہیں جم گئیں۔ فیصل ہمارے خاندان کے تمام مردوں سے زیادہ عقلمند اور اعلیٰ خوبیوں کے مالک تھے۔ اس موقع پر جب خاندان کے دوسرے افراد اپنی اپنی رائے دے چکے تھے، تو فیصل نے بزرگوں سے بولنے کی اجازت مانگی جو کہ انہیں فوراً مل گئی۔

شہزادہ فیصل نے کہا کہ شاہ سعود کے جانشین بننے سے ملک کے سیاسی اور معاشی بحران کا خاتمہ نہیں ہوا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ شاہ سعود اس سیاسی اور معاشی بحران کو اپنی حکمت عملی سے ختم کرتے مگر شاہ سعود کو اپنی عیاشیوں سے فرصت ملتی تو وہ اس طرف توجہ دیتے۔ ان کی وجہ سے نہ صرف عوام تنگ آ چکے ہیں بلکہ آل سعود بھی تنگ آ گئے ہیں۔ اور انہیں اپنے قبیلہ (خاندان) سے نکالنے کی باتیں گردش کر رہی ہیں۔ اس کے علاوہ انہیں تخت سے ہٹانے کے بارے میں عوامی ذہن تیار ہو چکا ہے۔ اس وقت ملک کا اقتدار شدید خطرے کا شکار ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ اگر تیل سے حاصل شدہ دولت کا اختیار ان کے ہاتھوں میں ہوتا تو شاہی خاندان کی حد سے بڑھی ہوئی فضول خرچیوں کا خاتمہ ہوتا اور اس سلسلے میں شہزادوں کے لیے باوقار بندوبست کیا جاتا۔

اس تجویز کے پس منظر میں شہزادہ فیصل کا تخت چھن جانے کا خوف تھا۔ یہ تجویز میرے چچا سعود کی حکومت کے خاتمہ کے لیے تھی۔ اس اجلاس میں شریک افراد نے اگرچہ کھل کر اس تجویز کی حمایت نہیں کی مگر جب میرے چچا شاہ سعود کو اس اجلاس

کے منعقد ہونے اور شاہ فیصل کی تجویز کا پتا چلا تو اس نے مایوسی کے عالم میں ایسا قدم اٹھالیا جس کے مضمر اثرات سے وہ ہرگز آگاہ نہ تھا۔ یہی قدم اس کو ہمیشہ کے لیے اقتدار سے محروم کر گیا۔ اس نے شاہ فیصل کو دھمکی آمیز خط لکھ دیا اور یہی خط اسے لے ڈوبا کیونکہ بدوی قانون کے مطابق ایک بھائی دوسرے بھائی کو دھمکی دے سکتا ہے' نہ اس کی بے عزتی کر سکتا ہے۔ جب شاہ سعود نے شہزادہ فیصل کے خلاف طاقت کا مظاہرہ کیا تو شہزادہ فیصل نے اس کا مقابلہ نہایت ہی ہوشیاری اور عقلمندی سے کیا اور یہ معاملہ شاہی خاندان کے بڑوں اور مملکت کے علمائے کرام پر چھوڑ دیا کہ وہ مملکت سعودی عرب کے مفاد کی خاطر مناسب قدم اٹھائیں۔

شاہی خاندان کے بزرگوں اور ملک کے علمائے کرام کے متفقہ فیصلے کے بعد شاہ سعود کو تخت سے اتار دیا گیا اور شاہ فیصل کو تخت پر بٹھایا اور مملکت سعودی عرب کی فرمانروائی کا تاج پہنا دیا گیا۔ شاہ فیصل کے دورِ حکومت میں ان کی چہیتی بیوی نے جن کا نام عفت تھا' کی اجازت اور بھرپور حوصلہ افزائی سے مملکت سعودی عرب کی تاریخ میں پہلی مرتبہ تعلیم عامہ بالخصوص خواتین کی تعلیم کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کیے گئے۔

میں پہلے چچی عفت کا تعارف کرانا چاہتی ہوں۔ یہ 1932ء کی بات ہے موسم گرما میں ہمارے چچا شاہ فیصل سیر و سیاحت کی غرض سے ترکی گئے۔ وہاں انہوں نے ایک حسین و جمیل لڑکی کو دیکھا تو اپنا دل ہار بیٹھے اور اس کے ساتھ فوراً ہی نکاح بھی کر ڈالا۔ نکاح کے بعد چچی عفت کی خصوصیات کھل کر سامنے آئیں تو شاہ فیصل ان کے مزید معترف ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ فیصل نے اپنے دور حکومت میں اپنی چہیتی بیوی عفت کی خواتین کی تعلیم کے فروغ کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے' ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی اور مکمل ساتھ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ چچی عفت شاہی خاندان کی بیگمات کو یہ تحریک دینے میں کامیاب رہیں کہ وہ اپنی بچیوں کو تعلیم دلوائیں۔ جلد ہی شاہی خاندان کے ایک گھرانے نے اپنے محل میں ایک حصہ اسکول کے لیے وقف کر دیا جہاں شاہی خاندان کی بچیاں آکر تعلیم حاصل کرنے لگیں۔ بچیوں کو تعلیم دینے کے لیے آل سعود کی

سات شاخوں نے خصوصی طور پر ابوظہبی سے استانی کو بلوایا اور اسکول میں تعینات کیا۔

اس اسکول کے بارے میں اور اس سے پہلے چچی عفت کی بچیوں کے لیے تعلیم کی باتیں سن سن کر ہمارا بھی دل چاہتا تھا کہ ہم بہنیں بھی تعلیم حاصل کریں۔ مگر نہ جانے کیوں میرے والد کو خواتین کی تعلیم سے خدا واسطے کا بیر تھا۔ چچی عفت نے میری والدہ کو بچیوں کی تعلیم دلوانے کی تحریک دی۔ تاہم میری والدہ جب بھی میرے والد سے بات کی انہوں نے انکار کر دیا۔ اس طرح تقریباً ایک سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس عرصہ میں ملک بھر میں چچی عفت کی تحریک تعلیم نسواں کو بڑی پذیرائی ملی۔ ملک سے باہر بھی انہوں نے تعلیم نسواں کے فروغ میں ہر مشکل حالات اور رکاوٹوں کا بڑی بہادری اور ثابت قدمی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک بھر میں تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے جا بجا نئے اسکول کھلتے چلے گئے۔ عوام کے ساتھ ساتھ خواص کی اکثریت بھی اس طرف مائل ہو گئی۔ یہ صورتحال دیکھ کر میرے والد کا سخت رویہ نرم ہو گیا اور بالآخر ایک دن انہوں نے چچی عفت اور والدہ کے مسلسل دباؤ پر ہاں کر دی۔ یوں ہم پانچوں بہنوں کو اسکول جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ دن ہمارے لیے خوشی کا یادگار تاریخی دن تھا۔ ہم پانچوں بہنیں باقاعدگی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے لیے روزانہ اسکول جایا کرتی تھیں۔ کلاس میں ہمارا سولہ لڑکیوں کا گروپ تھا۔ ہماری استانی بہت ہی مشفق اور مہربان خاتون تھی۔ وہ ہم سب کو بڑے پیار و محبت کے ساتھ اور کبھی کبھار ہلکی سی سرزنش کے ساتھ پڑھایا کرتی تھی۔ وہ ہمیں اکثر کہا کرتی تھی کہ زندگی میں کبھی بھی مشکل حالات سے مت گھبرانا بلکہ ان مشکل حالات کا بہادری اور عقلمندی کے ساتھ مقابلہ کرو۔ یہ زندگی مسلسل جدوجہد کا نام ہے، اسی لیے تم سب زندگی بھر مسلسل اپنے مقصد کے حصول کے لیے جدوجہد کرتی رہنا۔

استانی کی ان باتوں کو میں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا۔ باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے میرے ارادے مزید پختہ ہو گئے تھے۔ میں اپنی چچی عفت کی عظمت کو سلام کرتی ہوں جن کی مسلسل کوششوں کی بدولت مجھے اور دیگر سعودی خواتین کو باقاعدہ

تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ میں چچی عفت کے بلند کردار اور مضبوط شخصیت سے اتنی متاثر تھی کہ میں نے ارادہ کر لیا کہ میں بھی ان کی طرح بلند کردار اور مضبوط شخصیت کی مالک بنوں گی۔

زیادہ اولاد کے ساتھ ساتھ میرے والد انتہائی دولت مند تھے۔ ان کا شمار امیر ترین افراد میں ہوتا تھا۔ مگر یہ بھی یاد رکھئے گا کہ وہ اپنی دولت صرف بیٹوں بالخصوص اپنے بڑے بیٹے علی پر لٹایا کرتے تھے۔ ہمیں اس سے محروم رکھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ہماری دلی خواہش پر علی کی خواہش کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ اس کا ثبوت یہ واقعہ ہے کہ ایک روز میں نے اپنے والد سے نہایت مؤدب ہو کر اپنے لیے سونے کا ہار لانے کو کہا تو انہوں نے بڑی نخوت کے ساتھ میری درخواست کو ٹھکرا دیا اور آئندہ کوئی فرمائش کرنے سے بھی منع کر دیا۔ اگرچہ مجھے سونے کا ہار نہ ملنے کا دکھ نہیں ہوا تاہم میرے والد جس برے انداز سے میرے ساتھ پیش آئے اس رویّے نے مجھے غمگین کر دیا۔ پھر اس دن جب میرے والد اپنے چہیتے بیٹے علی کے لیے خصوصی طور پر مارکیٹ گئے اور وہاں سے خالص سونے کی امپورٹڈ رولیکس گھڑی خرید کر لائے تو میرے دل و دماغ پر عجیب بے کیفی سی طاری ہونے لگی۔ انہوں نے علی کو بڑی محبت کے ساتھ گھڑی پہنائی اور پیار کیا۔ اس منظر کو دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ کیا تھا کہ وہ علی کی گھڑی کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی سونے کا ہار لے آتے اور اسی طرح مجھے بھی پیار کرتے! واہ ری عرب شہزادی کیسی ہے تیری قسمت!! یہ سوچ کر میں تاسف سے دھیرے سے ہنس پڑی۔ اس بات کو ہوئے دوسرا ہفتہ ہو گا کہ ایک دن جب میں ٹہلتے ہوئے تالاب کی طرف آئی تو وہاں تالاب کے کنارے لگی ہوئی میز پر علی کی وہی سونے کی رولیکس گھڑی کو دیکھا جو انجانے میں وہاں پر علی بھول گیا تھا۔ گھڑی کو دیکھ کر میرے اندر دبا ہوا حسد اور نفرت کا طوفان باہر آ گیا اور میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے ایک پتھر اٹھایا اور گھڑی کا حشر نشر کر دیا۔ گھڑی پرزے پرزے ہو گئی۔ میری اس حرکت کو کسی نے نہیں دیکھا تھا کیونکہ اس وقت وہاں پر کوئی نہ تھا۔

اس عمل کے بعد اس وقت مجھے بہت سکون محسوس ہوا جب میرے والد' علی کو گھڑی کی صحیح حفاظت نہ کرنے پر ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے مگر اس وقت میرا سکون غارت ہو گیا جب اگلے ہفتے ویسی ہی دوسری گھڑی میرے والد لے کر آئے۔ یہ دیکھ کر میرے اندر انتقام کی آگ مزید بھڑک اٹھی۔

ہمارے خاندان کے گھٹن زدہ ماحول میں رہنے والی خواتین' جن میں میری بہنیں بھی شامل ہیں' کسی سزا یافتہ قیدی کی طرح زندگی گھسٹ گھسٹ کر اور خاموشی کے ساتھ بسر کر رہی تھیں۔ ایسے بدتر حالات کی وجہ سے میری بہنیں کم گو تھیں۔ مگر میں نے ان بدتر حالات کے سامنے بچپن ہی سے ہتھیار نہ ڈالے تھے ان حالات کا میں بچپن ہی سے بڑی حوصلہ مندی اور جرأت کے ساتھ مقابلہ کرتی چلی آ رہی تھی اور ان حالات نے مجھے بہت منہ پھٹ اور روایت شکن لڑکی بنا دیا تھا۔ میں نے بچپن میں اپنے والد کی شفقت' نرمی' پیار اور محبت حاصل کرنے کے مثبت اور منفی طریقے اپنا کر جتنی بھی کوششیں کیں افسوس کی بات ہے کہ میرے دونوں طریقوں سے کی جانے والی کوششیں ناکام ہوئیں۔ میں بدنصیب ان کی ہلکی سی میٹھی مسکراہٹ بھری توجہ تک حاصل نہ کر پائی۔

میرا بھائی علی اگرچہ دیگر انسانوں کی طرح برائیوں اور اچھائیوں کا مجموعہ تھا مگر اس میں ظلم کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جو میں کبھی بھی بھلا نہ پاؤں گی۔ ظالم کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ کمزوروں' بے بسوں اور مجبوروں پر ظلم و ستم ڈھا کر اپنی تسکین پوری کرتا ہے۔ ہمارے مالی کا ایک معذور بیٹا تھا۔ جس کا نام سامی تھا۔ سامی کے لمبے لمبے بازو اور عجیب و غریب شکل کی ٹانگیں تھیں۔ علی کا زور اس پر خوب چلتا تھا۔ بے چارے کے ساتھ جو ظلم و ستم کرتا تھا وہ بیان سے باہر ہے۔

علی اپنے دوستوں کے سامنے اس بچے کو بندر کی طرح چلنے پر مجبور کرتا اور سب کے ساتھ مل کر قہقہے لگاتا تھا۔ اس نے اور اس کے دوستوں نے کبھی بھی غریب اور معذور سامی کے آنسوؤں کی پروا نہ کی تھی۔ علی کی طرح اس کے دوستوں میں ظلم کا عنصر نمایاں تھا۔ بس' کمزور اور مجبور انسانوں کے ساتھ وہ معصوم جانوروں کو بھی اپنے ظلم کا

نشانہ بناتا تھا۔ جہاں کہیں اس کو بلی کے بچے نظر آتے تو وہ انہیں پکڑتا اور پنجرے میں قید کر لیتا اور ان کی ماں کے آنے کا انتظار کرتا۔ جب ان بچوں کی ماں ڈھونڈتی ہوئی وہاں آتی اور پنجرے میں اپنے بچوں کو بند دیکھ کر تکلیف سے چلاتی اور پنجے مارتی تو یہ دیکھ کر علی خوشی سے اچھلتا کودتا اور باقاعدہ جشن مناتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمیں اتفاق سے ایک کتے کا بچہ ملا جو کہ اپنی ماں سے بچھڑ گیا تھا۔

وہ بھوک لگنے کی وجہ سے بلک رہا تھا۔ ہم اسے اٹھا کر گھر لے آئے اور اسے بوتل کا دودھ پلایا۔ اس طرح ہم تمام بہنیں بشمول میری والدہ بھی اس بچے کا خاص خیال رکھتیں۔ باسم کو دودھ پلانے کے لیے ہم نے باری کا نظام بنایا ہوا تھا۔ پلے کا نام ہم نے باسم رکھا تھا۔ عربی زبان میں باسم کے معنی ہیں "مسکراتا چہرہ۔" یہ نام سبھی کو بہت پسند آیا تھا حتیٰ کہ پلے کو بھی۔ جب بھی ہم اسے باسم کہہ کر اپنی طرف بلاتے وہ فوراً دوڑ کر آتا۔ ہماری خصوصی توجہ سے باسم چند دنوں میں صحت مند نظر آنے لگا۔ ہم نے اس کے لیے خصوصی طور پر لباس تیار کروایا (جمع شدہ پرانے کپڑوں کی مدد سے)' اسے پہنایا اور ننھے منے بچوں کو سیر کرانے والی ہتھ گاڑی (پرام) میں بیٹھنا بھی سکھا دیا۔ بے شک یہ حقیقت ہے کہ مسلمان کتوں سے اس انداز میں پیش نہیں آتے' لیکن شاید ہی کوئی مسلمان کسی جانور کو دکھ تکلیف اور پریشانی میں مبتلا کرنے کے بارے میں سوچے گا۔ ایک دن ہم حسب معمول باسم کو پرام میں بٹھا کر سیر کرا رہے تھے اور آپس میں ہنس بول رہے تھے۔ اس وقت ہمیں علم نہ تھا کہ یہ خوشی لمحاتی ہے' عارضی ہے۔ اچانک علی اپنے دوستوں کے ساتھ اسی جگہ آن ٹپکا۔

علی کی نظر جب پرام میں بیٹھے باسم پر پڑی تو اس نے فوراً فیصلہ سنایا کہ باسم سے وہ خود کھیلے گا اور زبردستی ہم سے باسم کو لینے کی کوشش کی' تو میں اور میری بہنیں اس پر جھپٹ پڑیں اور خوب چیخیں اور چلائیں۔ جب میرے والد نے یہ شور وغل سنا تو مطالعہ گاہ سے باہر آ گئے۔ ان کے باہر آتے ہی علی بھاگ کر ان کے پاس گیا اور بتایا کہ وہ باسم کو لینا چاہتا ہے۔ اس کی بات سنتے ہی میرے والد نے یہ حکم دیا کہ ہم بہنیں

باسم کو علی کے حوالے کر کے اندر جائیں۔ ہم بہنوں نے بے بسی اور مجبوری سے آنسوؤں بھری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور یہ جان کر کہ ہمارے احتجاج کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا خاموشی اختیار کر لی۔ جس وقت علی پلے کو اپنی بغل میں دبا کر خوشی سے اچھلتا ہوا دوستوں کے ہمراہ چلا تو صدمے کے مارے ہماری چیخیں نکل گئیں۔ پھر جب اسی روز میرے علم میں یہ بات آئی کہ علی نے پلے کے بلکنے سے تنگ آ کر اسے چلتی کار سے باہر اچھال دیا تھا تو اس وقت میرے دل میں علی کے لیے نفرت مزید پختہ ہو گئی تھی۔ گھر کے کسی فرد میں بھی علی کو ان بری اور ظالمانہ حرکات سے منع کرنے کی ہمت نہ تھی اور میرے والد کو اس میں کوئی عیب بھی نظر نہیں آتا تھا۔ الٹا شکایت کرنے والے کی شامت آ جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ سب کے دلوں میں علی کے لیے نفرت بھری ہوئی تھی۔ سب کے دلوں سے علی کے لیے بددعائیں نکلتی تھیں۔ اس بات کی نہ تو میرے والد کو پروا تھی اور نہ میرے بھائی کو۔ ہمارے ہاں گھر کی سربراہی مرد کیا کرتے ہیں' عورت کو سربراہ تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اگر گھر کا سربراہ اپنی اولاد بالخصوص بیٹوں کی صحیح تربیت نہ کر سکے تو اس کا قصوروار والد کو بھی ٹھہرایا جائے گا۔ میں یہ سمجھتی ہوں کہ گھر کے معاملات اگر شوہر اپنی بیوی کے ساتھ مل کر چلائے تو وہ گھر جنت کا نمونہ بن سکتا ہے۔ مگر میں جس ملک کی باشندہ ہوں وہاں تو ہر سمت مردوں کی حکمرانی اور غلبہ ہے۔ اور وہ اتنے انا پرست ہیں کہ کبھی بھی عورت کو اپنے برابر نہیں لائیں گے۔ میں یہ بھی اچھی طرح جانتی ہوں کہ ہمارے دین اسلام میں مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کو بھی بلند مقام حاصل ہے اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں قرآن مجید کا ایک بڑا حصہ مخصوص ہے۔ اگر مسلمان مرد مسلمان عورتوں کو ان کے حقوق اور مقام نہیں دیتے تو اس میں ان کا قصور ضرور ہے مگر دین اسلام کا ہرگز نہیں۔

جیسا کہ میں شروع میں بتا چکی ہوں عرب معاشرے میں کم عمر لڑکیاں شادی ایسے مقدس بندھن کی آڑ میں اپنے سے دگنی عمر کے مردوں کی بوالہوسی کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔ خود میرے والد نے جب وہ بیس سال کے تھے میری ماں سے جب اس کی عمر سولہ

تھی شادی کی تھی۔ مگر مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میرے والد اپنی بیٹیوں کی شادیوں کے معاملے میں شاید دیگر عرب مردوں سے مختلف ہیں۔ مگر جلد ہی یہ اس خوش فہمی ختم ہو گئی۔

ہم سب کے علم میں یہ بات آئی کہ ہم بہنوں میں سے سب سے زیادہ خوبصورت' دبلی پتلی اور لمبی قد' ملائی جیسی رنگ و روپ' بڑی بڑی چمکتی دمکتی آنکھوں والی سولہ سالہ سارہ کی شادی جدہ کے ایک امیر ترین بوڑھے تاجر سے ہو رہی ہے اور یہ کہ ہماری پیاری بہن سارہ اس کی تیسری بیوی ہو گی۔ میں یہ حقیقت بھی تسلیم کرتی ہوں کہ میری بہن سارہ ہم سب بہنوں میں خوبصورت ترین تھی اس کے حسن کے چرچے گھر آنے والی خواتین کے ذریعے ان کے مردوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر مرد اس سے شادی کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ تاہم اس کا مطلب یہ تو نہ تھا کہ ہمارے والد اپنے سگے خون کے ساتھ اتنا بے رحمانہ سلوک کرتے۔

اس کی شادی ایک مکروہ شکل والے بوڑھے سے کی جا رہی ہے جس کی عمر 62 سال ہے۔ یہ سب سن کر مجھے بہت دکھ ہوا کیونکہ میری شوخ و شنگ بہن اس خبر سے بہت اداس ہو گئی تھی۔ اس منحوس خبر کو سن کر اس کے خواب کہ وہ فنون لطیفہ کی تعلیم اٹلی سے حاصل کرے' اس کے بعد وہ جدہ میں پہلی آرٹ گیلری کھولے۔ مگر افسوس اس کے یہ خواب اب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے۔ سارہ نے جب والدہ سے یہ منحوس خبر سنی تو خوب روئی پیٹی' چیخی چلائی۔ میری والدہ نے بھی میرے والد سے اس بے رحمانہ فیصلے پر بہت احتجاج کیا۔ مگر میرے والد بھی دوسرے بے رحم مردوں کی طرح نکلے۔ ہم سب کے احتجاج کے باوجود انہوں نے ہماری ایک نہ سنی۔ وہ ہمیشہ پختہ فیصلے کرتے تھے اور پھر ایک بار فیصلہ کرنے کے بعد پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ سارہ کی حالت زار دیکھ کر بجائے میرے والد کا دل پسیجتا الٹا مزید سخت ہو گیا۔ میں یہ صورتحال دیکھ کر بہت حیران تھی اور افسوس کر رہی تھی کہ جو سلوک وہ سارہ جیسی فرمانبردار لڑکی کے ساتھ کر رہے ہیں وہ تو میری جیسی بدتمیز' منہ پھٹ اور مشکل لڑکی کے ساتھ ہوتا تو یہی سمجھا جاتا کہ اس کی شادی کر کے اس نے اپنی جان چھڑائی گئی ہے۔ کیونکہ جتنا تنگ میں نے اپنی فیملی کو کیا اتنا

بہت ہی کم کسی نے کیا ہوگا۔ میں نے انتقاماً علی کی نئی مرسیڈیز کار کے انجن میں مٹی ڈال کر اس کو بیکار کر دیا تھا۔ ایک دفعہ موقعہ پا کر میں نے اپنے والد کی تجوری سے کافی سارے ریال چوری کر لیے تھے' اور اسی طرح میں نے ایک روز چپکے سے علی کے کمرے میں گھس کر اس کے جمع شدہ سونے کے سکوں کو اٹھایا اور ایک گڑھا کھود کر اس میں چھپا دیا۔ میری ان حرکتوں سے میرے گھر والے ہمیشہ پریشان رہتے۔ میں اپنی بہن سارہ سے بہت زیادہ محبت کرتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی جان بھی دے سکتی تھی۔ اس واقعے نے تو گویا سارہ کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ اس کے اندر چھپی ہوئی قوت جب سامنے آئی تو ہم سب حیران رہ گئے۔

سارہ روزانہ والد کے آفس جا کر پیغام چھوڑ آتی کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ اس میں اتنی ہمت آ گئی تھی کہ وہ اپنے ہونے والے خاوند کے آفس پہنچ گئی۔ اتفاق سے وہ وہاں نہ تھا۔ وہ پیرس گیا ہوا تھا۔ اس نے اس کے ہندوستانی سیکرٹری کو پیغام دیا کہ اپنے مکروہ شکل والے باس سے کہنا کہ میں (یعنی سارہ) اس کے ساتھ ہرگز شادی نہیں کروں گی۔ جب ان تمام باتوں کا میرے والد کو پتا چلا تو انہوں نے اس خیال سے ٹیلیفون کنکشن کاٹ ڈالا کہ وہ رابطہ نہ رکھ سکے۔ انہوں نے سارہ کے اس کے کمرے سے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی۔ یہاں تک کہ اس کی شادی کا وقت آ گیا۔

خاندان کی بدنامی کے خوف سے انہوں نے سارہ کو مدہوش کرنے والے ٹیکے لگوائے جس کی وجہ سے سارہ ہر وقت چپ چاپ رہتی تھی۔ ہر وقت صرف آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہتی' مگر زبان کو حرکت نہ دے پاتی۔ اسی حالت میں اس کی بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔ سارہ کی آنکھیں رخصتی کے وقت میرے اوپر ٹکی ہوئی تھیں جیسے وہ مجھ سے مدد کی امید کر رہی ہو۔ سارہ کی شادی اور رخصتی' یہ ایسا عجب حادثہ تھا جس کی وجہ سے گھر کے مردوں کے سوا تمام خواتین سکتے میں تھیں اور سب اپنی بے بسی پر خون کے آنسو رو رہی تھیں۔ المیہ تو یہ ہے کہ اس سانحہ کا شکار صرف ہمارے گھرانہ کی عورتیں

نہیں ہیں بلکہ سعودی عرب کی تمام مظلوم خواتین ایسے ہی حالات سے گزرتی ہیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان کے اس دکھ کا مداوا بھی کوئی نہیں کرتا۔

سارہ کی شادی کو تین مہینے گزر گئے۔ اس سارے عرصہ میں میرے والد نے ہم لوگوں کو سارہ کے گھر جانے نہیں دیا تھا۔ مگر یہ پابندی زیادہ عرصہ قائم نہیں رہ سکی۔ پانچواں ہفتہ ہوا تھا کہ ایک منحوس خبر ہمیں ملی کہ ہماری پیاری بہن سارہ نے اوون میں سر ڈال کر خودکشی کرنے کی کوشش کی جو کہ خوش قسمتی سے ناکام ہوگئی اور اب وہ جدہ کے ایک کلینک میں داخل ہے۔ یہ خبر سن کر ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ ہم فوری طور پر ایک نجی جہاز میں بیٹھ کر جدہ پہنچے اور سیدھے سارہ کے پاس گئے۔ وہ زندہ تھی مگر کسی لاش کی مانند ساکت نظر آ رہی تھی۔ اس بھیانک حادثہ کی وجہ سے اس کا چہرہ زرد ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس وقت اس کا خاوند وہاں نہ تھا مگر اس کی ماں بدصورت چڑیل کی شکل والی بڑھیا وہاں موجود تھی۔ وہ اپنی کرخت آواز میں ہماری پیاری بہن سارہ کو برا بھلا کہہ رہی تھی، میری والدہ نے یہ دیکھا تو انہیں بہت غصہ آیا کہ ایک تو میری بیٹی اتنے خوفناک حادثے سے گزری ہے اور یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کے بجائے الٹا کوسنے دے رہی ہے۔ میری والدہ نے اسے خوب لتاڑا۔ یہ صورتحال دیکھ کر اس نے بھاگنے میں عافیت سمجھی۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ سارہ کو اس حالت میں دیکھنے کے باوجود ہمارے والد کو سارہ کے ساتھ ذرا بھی ہمدردی نہیں ہو گی اور الٹا ہم سب ان سے سزا پائیں گے۔ جب تیسرے دن سارہ کا خاوند وہاں آیا اور اس نے آتے ہی اپنی ''ملکیت'' (بیوی) کو واپس لے جانے کا مطالبہ کیا تو اس کے آنے پر میری والدہ کو اپنی بیٹی کے کرب کا احساس ہوا کہ سارہ کا خاوند تو ہم جنس پرست ہے۔

اپنی بیٹی کی اس روحانی اذیت کے شدید احساس نے انہیں ذہنی طور پر مفلوج کر دیا یہاں تک کہ ہمارے والد بھی بیٹی کے کرب کو جان کر بے چین ہو گئے۔ لیکن وہ اپنے داماد کی اس بات کے قائل تھے کہ بیوی خاوند کی ملکیت ہوتی ہے۔ اسی وجہ کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے والد نے اپنا فیصلہ سارہ کے خاوند کے حق میں دیا جب میری والدہ نے یہ

فیصلہ سنا تو وہ غصے اور رنج کی شدت سے کانپنے لگیں اور میری بہن سارہ نے یہ کہتے ہوئے بستر سے اترنے کی کوشش کی کہ اس زندگی سے تو موت ہی بہتر ہے۔

اس نے کہا کہ اگر اسے اس کے شوہر کے ساتھ بھیجنے کی کوشش کی گئی تو وہ اپنے آپ کو ختم کر ڈالے گی۔ سارہ کے روحانی کرب کے شدید احساس نے میری والدہ میں قوت پیدا کر دی اور انہوں نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ بیٹی کے دفاع میں چٹان بن کر کھڑے ہو کر کہا کہ ''میری پیاری بیٹی کبھی بھی اس منحوس' انسانیت کے درجے سے خارج شخص کے گھر میں پاؤں نہیں رکھے گی'' اور اگر کسی نے ایسا کرنے کی کوشش بھی کی تو وہ بادشاہ اور علماء کرام کی کونسل سے درخواست کرے گی۔

جب میرے والد نے یہ سنا تو انہوں نے میری والدہ کو طلاق دینے کی دھمکی دی۔ مگر میری والدہ نے نہایت اطمینان' تحمل مزاجی اور استقلال سے کہا کہ ان کے دل میں جو کچھ ہے وہ کریں مگر وہ اپنی بیٹی کو کبھی اس عفریت کے حوالے نہیں کریں گی۔ میرے والد حیرت کے مارے آنکھیں جھپکانے سے قاصر تھے۔ حیرانی سے وہ اپنا منہ بھی بند کرنا بھول گئے تھے۔ میری والدہ کے پختہ عزم کو دیکھ کر اور شاید اس خاندانی مسئلے میں حکومت کی مداخلت پسند نہ کرنے کی وجہ سے انہوں نے پہلی مرتبہ ہتھیار ڈالے۔ ادھر سارہ کے شوہر میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شاہی خاندان سے ٹکر لے سکے۔ اس لیے وہ بھی تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد سارہ کو طلاق دینے پر راضی ہو گیا۔

اپنی پیاری بہن سارہ کے اس تلخ ترین تجربے نے میرے اندر ایک نیا عزم پیدا کر دیا کہ زمانۂ قدیم سے لے کر اس جدید کمپیوٹر دور تک عورت کے ساتھ مرد نے ہمیشہ زیادتیاں کی ہیں اور کرتا چلا آ رہا ہے۔ مرد نے جب بھی عورت کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا' مرد کی بجائے عورت ہی کو قصور وار سمجھا گیا اور مرد کو ہمیشہ سے ہی ''معصوم'' سمجھا جاتا ہے۔ مرد غیر اخلاقی کاموں میں ملوث ہو تو کہا جاتا کہ وہ تو مرد ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ یعنی مرد کسی عورت کے ساتھ زنا کرے تو معصوم ہے یا کسی لڑکے کے ساتھ لواطت کرے تو بھی معصوم ہے۔ ''مرد'' ہونے کے ناطے وہ یہ سب کام کرنے کا حق رکھتا

ہے۔ اگر عورت سے زنا کا فعل سرزد ہو جائے تو اس کو گناہگار اور جہنمی قرار دیا جاتا ہے اور موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ اگر عورت اپنے ہم جنس پرست خاوند کو راہ راست پر لانے کی کوشش بھی کرے تو بھی اس کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہی تضاد ازل سے مرد اور عورت کے درمیان چلا آ رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ کے مرد کی بھی جبلت دنیا کے دیگر مردوں سے مختلف نہیں ہے، ایک ہی جیسی صورتحال ہے۔ چونکہ ہمارے والد بھی روایتی سوچ کے مالک ہیں تو ان کے ذہن پر بھی یہ بات نقش تھی کہ میری بیٹی کے ساتھ جو سلوک اس کے شوہر نے روا رکھا یہ اس کی بیٹی کی کوئی غلطی ہے اس کے مرد کا کوئی قصور نہیں ہے۔ بہرحال ہم سارہ کو لے کر واپس گھر آ گئے۔ اس المناک حادثے نے میری والدہ اور سارہ کو اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا۔ اس وجہ سے ہمارے گھر کا ماحول شدید تناؤ کا شکار تھا۔ ہماری بہن نورہ نے اس صورتحال کو بھانپا اور سارہ کی بھلائی کی خاطر میرے والد کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ سارہ اور والدہ کو یورپ کی سیر و سیاحت کے لیے بھیج دیں۔ تاکہ ان کا ذہنی تناؤ کم ہو جائے۔ مگر میری والدہ کی حالت اس قابل نہ تھی کہ وہ اس طویل سفر پر روانہ ہو سکتیں۔ اس حادثے نے تو جیسے ان کی بولنے کی قوت ختم کر دی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ گم سم رہتی تھیں۔ البتہ انہوں نے نورہ اور میرا حوصلہ بڑھایا کیونکہ وہ خود بھی چاہتی تھیں کہ سارہ اس حادثہ کو خوفناک خواب سمجھ کر بھول جانے کی کوشش کرے اور ذہنی تفریح کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ ملک اٹلی کی سیر کرے۔

یورپ کی سیر و سیاحت کے تصور سے ہم بہت خوش تھے مگر اس اطلاع نے ہماری ساری خوش فہمی ختم کر دی کہ ہمارے والد کے مطابق چونکہ عورتوں کی حفاظت کے لیے ایک محافظ اور نگران ہونا ضروری ہے اس لیے علی اور ہادی ساتھ جائیں گے۔ یہ سن کر تو میرے تن بدن میں علی کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور میں نے ٹھان لی کہ میں علی کو خوب بے عزت کروں گی۔ میں نے اس کا سر کو ڈھانپنے والا رومال اور ڈوری اٹھائی اور بھاگ گئی۔ غصے کی حالت میں مجھے یہ بات بھی یاد نہ رہی کہ اگر کسی

سعودی مرد کے اسکارف کو کوئی عورت چھو لے تو اسے بہت برا سمجھا جاتا ہے۔

یہ دیکھ کر علی غصہ سے چلایا اور میرے پیچھے بھاگا اور چیخا کہ وہ والد سے میری شکایت کرے گا۔ چونکہ میں بھی غصے میں تھی اس لیے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور دوڑتی ہوئی غسل خانے میں گھسی اور اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ اس ہنگامے میں علی شدید زخمی ہوا۔

اس کے چیخنے چلانے کے باوجود کوئی بھی نوکر اس کی مدد کے لیے نہیں آیا کیونکہ اس کی حرکتوں سے سب نالاں تھے۔ علی کی چیخیں اور سسکیاں سن کر وہ یہی سمجھے تھے کہ میں اس کی پٹائی کر رہی ہوں، پھر بھی انہوں نے علی کی مدد نہ کی۔ اسی دوران میں نے علی کے سر کو ڈھانپنے والے رومال کو ٹائلٹ میں بہا دیا لیکن ڈوری ٹائلٹ میں پھنس گئی۔ یہ دیکھ کر علی مجھ پر جھپٹ پڑا اور ہم دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے اور لڑتے ہوئے فرش پر آ پڑے۔ اس کے باوجود بھی لڑائی جاری رہی۔ لیکن اس وقت مجھے علی پر برتری حاصل ہوگئی جب میں نے اس کا پنجہ پکڑ کر موڑ دیا، اس پر علی بری طرح چلا اٹھا، علی کی چیخیں اور اس کی آنکھوں سے بہتے ہوئے آنسوؤں نے میرے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا۔ میری والدہ نے آ کر علی کو میرے غصے سے بچایا۔

اب میں یہ سوچ رہی تھی کہ میں نے تو اپنا غصہ علی پر اتار دیا اور سب کے سامنے اس کی بے عزتی کر دی مگر والد کے غصے اور مار سے مجھے کون بچائے گا؟ اس خیال کے آتے ہی میرا ذہن تیزی کے ساتھ کام کرنے لگا۔

پھر اچانک میرے ذہن میں، آنے والے طوفان سے بچنے کے لیے ایک منصوبہ آیا جس پر میں نے فوری عمل کر ڈالا۔ ادھر جب میری والدہ اور مصری ڈرائیور عمر، علی کی مرہم پٹی کروانے کے لیے اسے کلینک لے گئے تو میں موقعہ غنیمت جان کر علی کے کمرے میں گھسی اور اس کا خفیہ ''خزانہ'' ڈھونڈنے لگی۔ یہ خفیہ خزانہ درحقیقت فحش تصاویر اور سلائیڈز تھیں۔

سعودی عرب میں رائج قانون کے مطابق اس قسم کا مواد رکھنا ناقابل معافی

جرم ہے۔ بے شک دنیا بھر کے نوجوان لڑکے اس قسم کا مواد اکٹھا کرتے ہیں مگر ہمارے ہاں اس کی سخت ممانعت ہے۔ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جاتی ہیں اور بھاری جرمانے لگائے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل مجھے اس خفیہ خزانہ کا پتا چلا تھا۔ علی نے ان سلائیڈز پر اپنا نام لکھا ہوا تھا تاکہ دوسرے دوستوں سے اس کی اشیا مل نہ جائیں۔ ان سلائیڈز کو دیکھ کر مجھے بڑی سخت کراہت آئی۔ ان سلائیڈز میں مرد اور عورتیں گندی حرکتیں کر رہے تھے۔ کچھ تصاویر میں خواتین اور جانوروں کا جنسی ملاپ دکھایا گیا تھا۔

علی نے اس ممنوعہ مواد کو گھر والوں کی نظروں سے بچانے کے لیے اپنے اسکول نوٹس والے صندوق میں رکھا ہوا تھا۔ تلاشی کے دوران علی کے کمرے سے شراب کی سات بوتلیں بھی ملی۔ میں نے یہ تمام اشیاء ایک بڑے لفافے میں رکھیں۔ اس وقت میرے چہرے پر ایک بھرپور مسکان تھی۔ سعودی عرب ایک بے حد روایتی مسلمان ملک ہے، پورے ملک میں جا بجا مساجد کا جال بچھا ہوا ہے۔ اسی طرح ہمارے محل کے نزدیک بھی ایک شاندار اور سنگ مرمر سے بنی ہوئی مسجد تھی۔

ظہر کے بعد جب مسجد خالی ہو گئی تو میں اپنے منصوبے کے مطابق مسجد کے اندر گئی۔ ہمارے ملک کی مساجد میں عورتوں کے جانے پر پابندی ہے۔ اگرچہ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خواتین کو مسجد میں داخلہ سے منع نہیں فرمایا البتہ ان کے فرمان کے مطابق عورت کا اپنے گھر پر ہی نماز ادا کرنا سب سے افضل عمل ہے۔

گرمیوں میں نمازِ ظہر کے بعد قیلولہ کیا جاتا ہے۔ یوں قرب و جوار میں کوئی نہ تھا۔ اس لیے میں خاموشی سے مسجد میں گھس گئی اور لفافے کو مسجد کے اندر بنے ہوئے منبر پر رکھ دیا اور چپکے سے لوٹ آئی۔ میری اس حرکت سے کوئی آگاہ نہ ہو سکا۔ جب شام کے وقت تین مطاوی (مذہبی رہنما) ہمارے دروازے پر آئے تو اس وقت تک ابو گھر واپس نہیں آئے تھے۔ مطاوی کے آنے کا علم مجھے ان کے شور و غل سے ہوا۔ میں نے اور میری تین فلپائنی خادماؤں نے سیڑھیوں کے اوپر سے نیچے دیکھا تو نیچے کا منظر

دیکھتے ہی میں مسکرا اٹھی۔ کیونکہ مطاوئ عمر سے تیز آواز میں کسی معاملے پر بحث کر رہے تھے۔

انہوں نے اپنے ہاتھوں میں کچھ رسالے اور کتابیں وغیرہ پکڑی ہوئی تھیں۔ تمام غیرملکی اور ان سے زیادہ سعودی عرب کے شہری' مطاوئ کے پاس بہت زیادہ اختیارات ہونے کی وجہ سے ڈرتے تھے یہاں تک کہ شاہی خاندان کے افراد بھی ان کی عقابی نگاہوں سے خودکو بچانے کی کوشش کرتے تھے۔

مطاوئ کو دیکھ کر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا کہ آج سے دو ہفتے پہلے ہماری ایک فلپائنی ملازمہ گھٹنوں تک لمبا اسکرٹ پہن کر بازار چلی گئی تھی۔ مطاوئ تو اسے اس حالت میں دیکھ کر غصہ سے لال پیلے ہو گئے اور انہوں نے اسے چھڑیوں سے خوب پیٹا اور اس پر بس نہ کیا بلکہ اس کی ننگی ٹانگوں پر سرخ رنگ کر دیا۔ ہماری ملازمہ کی ٹانگیں ابھی تک سرخ اور اس کی جلد بھدی دکھائی دیتی تھی۔

جب اس نے بھی مطاوئ کو دیکھا تو خوف کے مارے میرے پلنگ کے نیچے یہ کہتے ہوئے گھس گئی کہ ہوسکتا ہے یہ اسکرٹ پہننے کے جرم میں میرے تعاقب میں آئے ہوں۔ اس کی بات سن کر میں دھیرے سے مسکرا اٹھی لیکن میں نے اسے اپنا بھید دینا مناسب نہ سمجھا۔ اتنی ہی دیر میں علی اور امی کلینک سے واپس آ گئے تھے۔ علی کی حالت اتنی خراب تھی کہ اسے اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ عمر نے بڑے گھبرائے ہوئے انداز میں ابو کو فون کیا اور مطاوئ کے گھر آنے اور علی کا جرم بتایا۔ مطاوئ چند ممنوعہ اشیاء بطور نمونہ عمر کے پاس چھوڑ کر گئے تھے جبکہ ثبوت کے طور پر باقی اپنے پاس محفوظ کر لی تھیں۔ جب علی نے ان اشیاء کو دیکھا تو اس کا رنگ اڑ گیا اور اسے اپنے جرم کا احساس ہوا۔ اس کی حالت بڑی خراب ہوگئی۔ اس وقت کمرے میں مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

بالآخر علی نے ہمت کرتے ہوئے نخرے اور بظاہر بے پروائی سے کہا کہ یہ معمولی سے مطاوئ مجھے گرفتار نہیں کر سکتے' کیونکہ میں شہزادہ ہوں کوئی معمولی انسان

نہیں۔ اتنے میں ابو غصے سے پھنکارتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے ممنوعہ اشیاء کو دیکھا۔ انہوں نے وہسکی کو بڑی حقارت سے ہنکارتے ہوئے ایک طرف پھینک دیا' اس لیے کہ تمام شہزادوں کے پاس شراب تو ہوتی ہے' مگر جب انہوں نے روشنی کی طرف بلند کر کے سلائیڈز کو دیکھا تو وہ غصے سے پاگل ہو گئے اور امی اور مجھے کمرے سے نکال دیا۔ پھر ہم نے علی کو پڑنے والی ضربوں کی آوازیں اور دلدوز چیخیں سنیں۔ وہ علی کو بری طرح پیٹ رہے تھے۔

1967ء میں یہ واقعہ پیش آیا اس وقت شاہ فیصل مملکتِ سعودی عرب کے فرمانروا تھے۔ وہ شہزادوں کی غیر اخلاقی حرکتوں کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس معاملے میں وہ اپنے بڑے بھائی شاہ سعود کی طرح نرم ہرگز نہ تھے۔ ابو علی کو مار پیٹ کر ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ مطاوئی کا ایک گروہ آ دھمکا۔ باوجود اس کے کہ پرنس علی نے ایک سنگین جرم کا ارتکاب کیا تھا مگر مطاوئی اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ جب تک بادشاہ کی طرف سے اجازت نہیں ملتی تب تک پرنس علی کو گرفتار کر سکتے تھے نہ ہی اسے عدالتوں میں گھسیٹ سکتے تھے۔ اگر علی کوئی عام شہری یا غیر ملکی ہوتا تو اس کو یقیناً کافی عرصہ تک جیل میں سزا بھگتنا پڑتی اور کوڑے کھاتا مگر علی خوش نصیب تھا کہ اس کا تعلق خاندانِ سعود سے تھا۔ کافی رات بیت جانے تک مطاوئی اور ابو کے درمیان پرنس علی کو سزا دینے کی بات چیت ہوتی رہی۔ یہ ساری گفتگو ہم نے بھی سنی۔

اس قسم کا ایک واقعہ پہلے سے ہمارے علم میں تھا۔ ہمارا ایک فلپائنی ڈرائیور تھا۔ اس کا ایک بھائی الریاض میں ایک اطالوی تعمیراتی کمپنی میں ملازم تھا۔ چار سال پہلے اسے ایک ایسی ہی بلیو فلم رکھنے کے جرم میں پکڑا گیا تھا۔ اسے سات سال کی سزا ہوئی تھی اور ہفتے میں ایک دن یعنی جمعہ کو دس کوڑوں کی سزا بھی ملی تھی۔ اسے ہر جمعہ کو سرِعام نکال کر دس کوڑے مارے جاتے تھے۔ ہمارا فلپائنی ڈرائیور اس سے ملاقات کے لیے جایا کرتا تھا۔ اس نے ایک دن بتایا کہ کوڑے کھا کھا کر میرے بھائی کا جسم کالا ہو گیا ہے' لگتا ہے کسی روز وہ سزا مکمل ہونے سے قبل ہی مر جائے گا۔

اگرچہ علی کا جرم ثابت تھا۔ تاہم مطاوئی اور ابو کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا۔ ابو نے مسجد کے لیے ایک بھاری رقم مطاوئی کے حوالے کر دی اور یوں پرنس علی اس الزام سے بری ہو گیا۔ البتہ مطاوئی نے علی کے لیے یہ لازم کیا کہ وہ ایک سال تک روزانہ پانچ مرتبہ نماز کے لیے ان کے پاس حاضری دیا کرے گا۔ اس کے علاوہ اس کو قانونی دستاویز پر ایک ہزار مرتبہ ''اللہ سب سے بڑا ہے اور میں نے شیطان مغرب کا غیر اخلاقی اور گمراہ کن راستہ اختیار کر کے اللہ کو ناراض کیا ہے'' الفاظ تحریر کرنے ہوں گے اور آخری شرط یہ کہ علی کو اس شخص کے بارے میں بتانا ہو گا جس سے اس نے یہ سلائیڈز اور میگزین حاصل کیے ہیں۔ علی نے انہیں بتایا کہ وہ کسی غیر ملک کے دورے پر گیا تھا تو وہاں سے یہ میگزین اپنے ساتھ لے کر آیا تھا اور سعودی کسٹم نے پرنس سمجھ کر اس کی تلاشی نہ لی' البتہ سلائیڈز اس نے ایک غیر ملکی دوست سے خریدی تھیں۔ علی نے اس غیر ملکی کا پتہ مطاوئی کو بتا دیا۔ بعد میں ہمیں پتا چلا کہ اس غیر ملکی کو کوڑے لگا کر ذلیل و خوار کر کے ملک سے نکال دیا گیا تھا۔ اس سارے واقعہ کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ میری اس بے وقوفانہ حرکت سے علی کو تو خاص سبق نہ ملا لیکن دوسرے بے گناہ لوگ مفت میں مارے گئے۔ اس ہنگامے کے نتیجے میں میرا علی کے ساتھ برا رویہ اور اس کے رومال والا معاملہ دب کر رہ گیا اور یوں میں ابو کے عتاب سے صاف بچ نکلی۔

سارے ہنگامے کے برپا ہونے کے باوجود ہمارا اٹلی اور مصر کی سیر و سیاحت کا پروگرام تعطل کا شکار نہ ہوا۔ مگر اب میرے دل میں سیر و سیاحت کا جوش و ولولہ سرد پڑ گیا تھا۔ البتہ تمام تیاری مکمل تھی۔ اس سفر پر جانے کے لیے ہم کل گیارہ افراد تھے۔ ہم سب تقریباً چار ہفتے کے لیے ملک سے باہر جا رہے تھے۔ ان گیارہ افراد کے گروپ میں میں' سارہ' نورہ' احمد اور ان کے تین بچے (دو بچوں کو وہ گھر چھوڑ آئے تھے) علی' اس کا دوست ہادی اور دو فلپائنی نوکرانیاں شامل تھیں۔ گیارہ افراد کا یہ گروپ گھر سے ائیرپورٹ چھ لیموزین کاروں میں بیٹھ کر گیا۔

علی کا دوست ہادی' عمر میں میرے بھائی سے صرف دو سال بڑا تھا اور

الریاض کی مذہبی درسگاہ میں مطاوئ بننے کے لیے تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ہادی عموماً گھر کے بڑوں کی موجودگی میں جب بھی باتیں کرتا تو دورانِ گفتگو قرآن مجید کی آیات کے حوالے دیتا۔ وہ ان کے سامنے اپنے آپ کو نیک' شریف اور پرہیزگار مسلمان بنا کر دوسروں کو مرعوب اور متاثر کرتا۔ اس کے ظاہری روپ کو دیکھتے ہوئے میرے ابو کو اس پر کامل اعتماد تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر ہادی ان کے بچوں کے ساتھ رہے گا تو بچوں پر اچھا اثر پڑے گا اور مکار ہادی' جو کہ عرب مردوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ تھا' کھلے الفاظ میں اپنا موقف بیان کرتا کہ عورت پاؤں کی جوتی ہے' عورتوں کو گھر کی چاردیواری کے اندر رہنا چاہیے اور مزید یہ کہ روئے زمین پر جو گناہ اور برائی ہو رہی ہے اس کے پیچھے عورتوں کا ہاتھ ہے۔

جب ہم لوگ گھر سے ائیرپورٹ کی طرف جا رہے تھے تو میری ماں' جو کہ پچھلے چند دنوں سے بہت کمزور اور افسردہ نظر آ رہی تھی' ہمارے ساتھ نہ آئی بلکہ اس نے گھر ہی میں ہمیں الوداع کیا۔ اس وقت انہوں نے نقاب پہنا ہوا تھا اور میں ان کی مضطرب آنکھوں میں آنسو' چہرے پر اداسی اور بے چینی اور ان کے ہونٹوں پر مچلتے ہوئے ان کے سوالات کو پڑھ سکتی تھی۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ وہ علی کے کرتوتوں سے تنگ تھیں۔ مگر وہ ایک عورت تھیں۔ میں پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ عرب معاشرہ میں عورت چاہے ماں ہو یا بیٹی یا بہو یا بیوی' اس کی کوئی عزت نہیں کرتا نہ باپ' نہ شوہر' نہ ہی بیٹے۔ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ عورت کو اس کا جائز مقام دیا۔ اس کو اسلام میں بڑا مقام حاصل ہے۔ عرب مرد عورتوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھے ہوئے ہیں وہ اسلام کی تعلیمات کے خلاف ہے۔

الریاض سے قاہرہ کا سفر ہم نے السعودیہ ائیرلائنز کے ذریعے طے کیا۔ سفر بہت خوشگوار گزرا۔ جلد ہی ہمارا جہاز قاہرہ کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر اترا۔ قاہرہ ہوائی اڈے کے عملے نے خوبصورت مسکراہٹوں اور خیر مقدمی کلمات سے ہمارا استقبال کیا۔ جلد ہی ہم ہوائی اڈے سے باہر آ گئے۔ اپنے ملک کی حدود سے جیسے ہی ہمارا جہاز

باہر نکلا تو مجھے ایک عجب سا سکون ملا، شاید وقتی طور پر آزاد ہونے کا! قاہرہ کی بلند وبالا مغربی طرز تعمیر کی عمارتوں، قدیم تاریخی اہمیت کے فرعونوں کے اہراموں، چوڑی سڑکوں، قدیم طرز تعمیر کے مکانات اور کھنڈروں کو دیکھ کر میرے دل میں قاہرہ کی عظمت کا احساس پیدا ہوا۔ جب میں نے وہاں کی عورتوں کو مغربی ملبوسات میں گاڑیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا تو مجھے یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئی کہ مصر کی عورتیں مردوں کے تسلط سے آزاد ہیں۔ مجھے خود پر اور دیگر سعودی عورتوں پر افسوس ہوا کہ اس جدید دور میں بھی ہم سعودی خواتین جہالت کے دور میں قید ہیں۔

مگر پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ جس طرح آج ہماری مصری بہنیں آزاد ہیں انشاء اللہ کل ہم سعودی خواتین بھی آزاد ہوں گی۔ قاہرہ ہی وہ باعظمت شہر ہے جہاں مجھے قدرت نے بالغ ہونے کا خوشگوار احساس دیا۔ ہر لڑکی پر یہ وقت لازمی آتا ہے جب وہ لڑکی سے عورت بنتی ہے۔ وہ ڈر اور اضطراب کے ملے جلے جذبات لیے اپنے جسم کے مخصوص حصہ سے نکلنے والے خون کا انتظار کرتی ہے۔ جب وہ لڑکی سے عورت بنتی ہے تو اس کے لیے عبا اور نقاب لازم ہو جاتا ہے۔ اس دور سے گزرنے والی ہر لڑکی کے تاثرات یکساں ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس کیفیت میں پا کر گناہگار سمجھتی ہیں اور اس کیفیت کے بارے میں شرم اور جھجک کے باعث کسی سے کچھ نہیں کہہ پاتی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ اس خون کے بارے میں غلط تصورات رکھتی ہیں اور یوں ان کے اندر نفسیاتی مسائل جنم لیتے ہیں، جن کی وجہ سے بعد میں جب ان کی شادیاں ہوتی ہیں تو وہ ذہنی وجسمانی عوارض کا شکار ہوتی ہیں یوں ان کی ازدواجی زندگی بگڑ جاتی ہے۔ جن لڑکیوں کی مائیں سمجھدار ہوتی ہیں اور ان کا رویہ اپنی بچیوں کے ساتھ دوستانہ ہوتا ہے تو ایسی ماؤں کی بچیاں جب اس مخصوص دور میں پہنچتی ہیں تو وہ اپنی تمام کیفیت اپنی ماؤں کو بلا جھجک بتا دیتی ہیں۔

اس موقع پر ان کی مائیں سمجھ داری سے کام لیتی ہیں اور اپنی بچیوں کو اس بارے میں سمجھاتی رہتی ہیں یوں شادی کے بعد ان کی ازدواجی زندگی صحیح گزرتی ہے۔

البتہ میں آج تک مردوں کی اس عادت کو سمجھ نہیں پائی کہ کل تک ایک لڑکی، جب نابالغ تھی اور بغیر پردے کے رہتی تھی تو وہ اس پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے گزر جاتے تھے مگر جیسے ہی وہ لڑکی بالغ ہوتی ہے اور نقاب و عبا پہن کر پردہ دار ہو جاتی ہے تو وہی مرد حضرات اس کی ایک جھلک دیکھنے کو ترستے ہیں۔ نفسیاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو مرد ایک عجب مخلوق ہے، جس کو مکمل سمجھنا ناممکن ہے۔

اپنے وطن سے دور ہونے کی وجہ سے ہمیں رسمی پابندیوں سے چھٹکارہ ملا ہوا تھا۔ جب میری بہن سارہ کو میری اس تبدیلی کا پتا چلا تو اس نے مجھے اپنے ساتھ لگایا اور کافی دیر تک سینے سے لگائے رکھا۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب مجھے گھر کی دیواروں سے باہر آنے نہیں دیا جائے گا۔ باہر کی دنیا میرے لیے ممنوع ہو گئی تھی۔

قاہرہ میں ہماری رہائش کا بندوبست احمد نے کیا تھا۔ اس نے ایک تین منزلہ لگژری اپارٹمنٹ لے رکھا تھا جو کہ قاہرہ شہر کے درمیان میں واقع تھا۔ تیسری منزل پر احمد اور اس کی بیوی نورہ منتقل ہو گئے۔ میں، سارہ، نورہ کے تین بچے اور ہماری دو فلپائنی نژاد نوکرانیوں نے دوسری منزل سنبھال لی تھی اور جبکہ ہادی، علی اور ان کے مصری نژاد محافظ نے فرشی منزل پر ڈیرہ جمانا مناسب جانا۔

دورانِ قیام قاہرہ میں ایسے ایسے صدمات ہمیں پہنچے جو کہ ہماری سوچوں سے بعید تھے۔ لوگوں کے منافقانہ طرزِ عمل کو دیکھ کر تو خاص طور پر زبردست جھٹکے لگے۔

جب ایک روز ہم لوگ قاہرہ کے ایک مشہور نائٹ کلب میں جانے لگے تو ہادی یہ دیکھ کر سخت سٹپٹایا کہ ہم بھی ان کے ساتھ نائٹ کلب جائیں گی۔ اس پر اس نے علی کے ساتھ تلخ کلامی کی۔ اس نے نہایت متانت اور بردباری کے ساتھ شاہی خاندان کے اقدار کے گرتے ہوئے معیار پر ایک جامع بیان دیا اور یہ بھی دھمکی دی کہ جب ہم واپس گھر جائیں گے تو وہ ہمارے والد سے میرے اور سارہ کے نائٹ کلب جانے کے حوالے سے ضرور شکایت کرے گا۔ دوسری طرف اس کا اپنا اخلاقی عمل یہ تھا کہ وہ نائٹ کلب کی ناچتی ہوئی رقاصاؤں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور ساتھ ساتھ

بے ہودہ تبصرے بھی کر رہا تھا۔ ہمارے سامنے ہی یہ بار بار کہہ رہا تھا: ''اگر میرے پاس اختیار ہوتا تو ان رقاصاؤں کو ننگی مجسموں کا روپ دے دیتا۔'' علی بھی بھوکی نظروں سے دیکھتے ہوئے خلاف تہذیب باتوں میں مصروف تھا۔ یہ وہ پہلا ہلکا سا جھٹکا تھا جو میں نے اور سارہ نے برداشت کر لیا لیکن اگلے روز جو ذہنی صدمہ علی اور ہادی کی طرف سے ہمیں ملا وہ نا قابل بیان ہے۔

ہم دونوں بہنیں شاپنگ کرنے کے لیے بازار چلی گئیں اور وہاں سے وقت سے پہلے اپنے اپارٹمنٹ لوٹ آئیں۔ جیسے ہی ہم اپارٹمنٹ میں داخل ہوئیں تو ہمیں ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی زخمی اپنے زخموں کی تکلیف سے دبے دبے انداز میں چیخ رہا ہو اور سسکیاں لے رہا ہو۔ میں نے سارہ کی طرف اور سارہ نے میری طرف حیرانی اور خوف سے دیکھا۔ ہم ان چیخوں کا پیچھا کرتے ہوئے جس کمرے تک پہنچیں وہ ہادی وعلی کا کمرہ تھا۔ جو اس وقت کھلا ہوا تھا۔ جیسے ہی ہم نے دباؤ ڈال کر دروازہ کھولا اندر کا منظر دیکھ کر ہم شرمندگی اور دہشت کے مارے ٹھٹک کر رہ گئیں۔ ہادی ایک ایسی بچی کے ساتھ' جو بمشکل آٹھ سال کی ہو گی' زنا کر رہا تھا اور علی نے اس بچی کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ پورے کمرے میں خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔ یہ فعل سرانجام دیتے ہوئے ہمارا بھائی علی اور ہادی کمینگی سے ڈھٹائی سے ہنس رہے تھے۔

سارہ نے جب یہ غیر اخلاقی حرکات دیکھیں تو اس پر ہسٹیریائی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ چیختی چلاتی ہوئی اوپر کی طرف دوڑی۔ مگر علی و ہادی جنہوں نے ہمیں دیکھ کر اس فعل بد کو ترک نہ کیا تھا' شرمندہ ہونے کی بجائے غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے۔ انہوں نے مجھے دھکا دے کر نیچے گرا دیا اور پھر کمرے سے باہر نکال دیا۔

غصے' غم اور صدمے سے چور میں سارہ کے پیچھے گئی اور کمرے میں پہنچ کر دروازہ بند کر دیا۔ پھر ہم دونوں بہنیں دیر تک ایک دوسرے سے لپٹ کر روتی اور سسکتی رہیں اور اس سارے عرصہ میں ہمارے کانوں میں بچی کی دل ہلانے والی چیخیں گونجتی رہیں۔ جب مجھ سے برداشت نہ ہوا تو میں اپنے کمرے سے نکل کر دوبارہ نیچے جانے

کی غرض سے جب سیڑھیوں کی طرف بڑھی کہ اسی اثنا میں گھنٹی کی آواز آئی۔ میں نے نیچے جھانکا تو دیکھا کہ علی دروازہ کھول رہا تھا۔

دروازے پر چالیس سال کے لگ بھگ عمر کی ایک مصری عورت کھڑی تھی۔ علی نے اسے اندر آنے کو کہا۔ جب وہ اندر آئی تو علی نے اسے پندرہ مصری پونڈز دیئے اور پوچھا کہ کیا اس کے پاس اور بچیاں ہیں؟ مصری عورت نے ہاں کہا اور اگلے روز آنے کے لیے ہامی بھری۔ اس عورت نے سسکیاں لیتی ہوئی بچی کا ہاتھ پکڑا اور دروازے سے باہر چلی گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کے جذبات کا اثر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

علی اور ہادی اپنے اس بے ہودہ' گھناؤنے فعل اور موقعۂ واردات پر یہ فعل سرانجام دیتے وقت رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر بھی یہ ظاہر کر رہے تھے کہ جیسے کچھ ہوا نہ ہو۔ اس موقع پر جب میں نے تیز آواز میں ہادی سے کہا کہ وہ کیسے اپنے آپ کو مطاوئی بننے کا اہل ثابت کرے گا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے زور سے قہقہہ لگایا اور پھر بری طرح ہنسنے لگا۔ میں نے علی کی طرف رخ کیا اور اس سے کہا کہ میں اس واقعہ کے بارے میں تم دونوں کی ابو سے شکایت کروں گی تو علی نے بے پروائی سے میری دھمکی کو یہ کہہ کر اڑا دیا کہ ''جاؤ! تم اپنا یہ شوق بھی پورا کرلو۔'' اس کے بعد اس نے جو الفاظ ادا کیے انہوں نے میرے پاؤں تلے سے زمین سرکا دی۔ میں بے یقینی اور حیرت کے مارے اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے تکتی رہی۔

علی کا کہنا کہ ابو نے خود اسے ایک ایسے بندے کا پتا بتایا تھا کہ جو کہ قاہرہ میں ایسی خدمت فراہم کرے گا اور یہ کہ جب بھی ابو قاہرہ آتے ہیں تو وہ بھی اسی قسم کی 'خدمت' سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

یہ الفاظ نہیں تھے' دہکتے ہوئے انگارے تھے جنہوں نے میری سماعت' بصارت اور روح کو جھلسا کر رکھ دیا۔ میں حیرانی' شرم اور دکھ سے آنکھیں پھاڑے ہوئے بھائی کا چہرہ دیکھ رہی تھی' آج کے دن رونما ہونے والے ان بھیانک واقعات کو میں

ہمیشہ کے لیے بھولنا چاہتی تھی۔ کاش! بچپن کی آغوش میں پناہ ملتی! کل تک میں قاہرہ کو بھی غربت سے پاک خوشحال اور ترقی یافتہ شہر سمجھتی تھی لیکن آج مجھے اپنی اس سوچ کو ترک کرنا پڑا۔ غربت کے دیو نے اس عظیم شہر کی عظمت کو بھی اپنے جبڑوں میں دبایا ہوا تھا۔

اگلے روز میں نے اسی مصری عورت کو ایک اور کم عمر بچی کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں پایا۔ میں اس کی سمت اس سوچ کے ساتھ بڑھی کہ وہ کیسی ظالم ماں ہے جو اپنی کمسن اور معصوم بچیوں کو جسم فروشی پر مجبور کرتی ہے۔ اس عورت نے میری نیت کو شاید بھانپ لیا تھا' اس لیے وہ فوراً ہی اپارٹمنٹ سے چلی گئی۔

اس مسئلہ پر سارہ اور میں نے نورہ کے ساتھ کافی دیر تک بحث کی۔ اس مسئلہ نے میری راتوں کی نیند برباد کر دی۔ میرے ذہن میں مختلف قسم کے خیالات وسوالات ابھرتے رہتے تھے۔ ہر وقت اس کے بارے میں سوچتے رہنے سے میرے سر میں درد رہنے لگا تھا۔

نورہ اور سارہ بھی اس صورتحال کی وجہ سے ٹینشن میں رہتی تھیں۔ نورہ نے ٹھنڈی آہ بھری اور دکھ بھرے لہجے میں بولی کہ میں نے اس صورتحال کو جب احمد کے سامنے رکھا تو اس نے بتایا ہے کہ دنیا بھر میں یہی صورتحال ہے۔ نورہ کی بات سن کر میں نے بھڑکتے ہوئے کہا کہ اگر مجھے اس قسم کے حالات پیش آتے تو میں فاقوں کے ہاتھوں مر جانا بہتر سمجھتی۔ اس پر نورہ بولی کہ ''جن لوگوں کا پیٹ ہمیشہ سے بھرا رہتا ہے انہیں یہ باتیں کرنا آسان لگتا ہے۔''

جلد ہی ہم نے غربت کے عفریت کے چنگل میں پھنسے ہوئے قاہرہ کو خدا حافظ کہا اور اٹلی چلے گئے۔ وہاں ہم نے اس کے تین عظیم تاریخی شہروں روم' فلورینس اور وینس کی سیر وسیاحت کی۔ علی اور ہادی کی وہی سرگرمیاں اٹلی میں بھی جاری رہیں۔ بے شک اٹلی پاپائے اعظم کا مسکن ہے اس کے باوجود اس مذہبی ملک کا حال بھی خراب ہے۔ یہاں تک کہ حسین وجمیل عورتیں ہر اس شخص کی منتظر ہوتی ہیں جس کی جیب بھاری ہو۔ میرا بھائی علی تو تھا ہی برا مگر ہادی کے دوہرے طرز عمل نے میرے دل کو توڑ کر رکھ

دیا۔

آخرکار ہم لوگ اپنے وطن واپس لوٹ آئے۔ وطن کی سرزمین میں داخل ہوتے ہی میں نے اپنے آپ کو مستقبل میں پیش آنے والے ناخوشگوار حالات کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔ جس وقت میں نے اپنے وطن کی سرزمین کو چھوڑا تھا اس وقت میں نابالغ تھی اور جب میں نے دوبارہ اپنے وطن کی سرزمین کو چھوا تو میں بالغ ہو چکی تھی۔ میری عمر 14 سال تھی۔ میں جانتی تھی کہ اب مستقبل میں قسمت میرا ساتھ نہیں دے گی۔ آج ہی سے میں ساری زندگی اپنے وطن کے معاشرتی وسماجی قانون کے خلاف ایک زبردست جدوجہد میں مصروف رہوں گی۔ جب میں ان خیالات اور عزائم میں گھری اپنے گھر آئی تو میرا دکھ اور مستقبل میں پیش آنے والے خدشات وقتی طور پر اڑن چھو ہو گئے کیونکہ میری پیاری ماں زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ ماں کو اس حالت میں دیکھ کر سارہ اور میں سسکیاں لیتے ہوئے رونے لگیں۔

جس وقت ہم اٹلی کی سیروسیاحت کر رہے تھے اس دوران میری ماں کی کمر اور گردن میں تکلیف شروع ہوئی تھی۔ طبی معائنوں سے یہ علم ہوا کہ ان کی ریڑھ کی ہڈی پر رسولی نکل آئی ہے۔ اسی دوران ماں نے ہمیں بتایا تھا کہ ہمارے سیاحت پر جانے سے پہلے انہیں خوابوں کے ذریعے اس دنیا کی قید سے رہائی کی خوشی مل چکی تھی۔ اس بیماری نے زیادہ وقت نہیں لگایا اور بالآخر ماں کے خواب سچے ثابت ہوئے۔ آخری وقت ماں نے ہم سب پر الوداعی نظر ڈالی اور کچھ کہنے کے لیے لب ہلائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ چل بسی۔ مرتے وقت بھی ماں کے چہرے پر ایک انوکھا سا سکون اور وقار جھلک رہا تھا۔ ماں کو کفن میں لپیٹ کر لیموزین کار کی پچھلی نشست پر رکھ دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ عمر بھی اس موقعہ پر افسردہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ ہمارے ہاں کے رواج کے مطابق عورتوں کو میت کے ہمراہ قبرستان جانے کی اجازت نہیں، لیکن غم اور رنج سے چور سارہ اور میں نے ضد پکڑ لی کہ ہم بھی ماں کے الوداعی سفر میں ضرور شرکت کریں گی۔ ہم دونوں بہنیں میت کے ساتھ

اس شرط پر قبرستان گئیں کہ وہاں جا کر ہم نہ تو اپنے بال نوچیں گی اور نہ ہی سینہ کوبی کریں گی۔

ہم نے بڑے ضبط کے ساتھ ماں کو لحد میں دفناتے ہوئے دیکھا۔ اس وقت میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں خوب زور زور سے چیخوں چلاؤں مگر والد سے کیا گیا وعدہ سامنے آ گیا تھا۔ ماں کے بغیر ہمیں گھر سونا سونا لگتا تھا۔ ابو بھی اس افسوسناک واقعہ کی وجہ سے اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارتے تھے مگر جلد ہی انہوں نے گھر میں زیادہ وقت گزارنے کے لیے اور اپنی تنہائی بانٹنے کے لیے ایک حل تلاش کر لیا۔ اس بارے میں ہمیں ہمارے بھائی علی سے پتا چلا کہ ہمارے والد صاحب دوبارہ شادی کر رہے ہیں۔ ہمارے ہاں کے امیر ہوں یا غریب' مرد حضرات کا چار چار شادیاں کرنا ہمارے لیے تو ایک عام سی بات ہے' مگر غیر ملکیوں کو اس بات کا علم ہوتا ہے تو انہیں حیرت کا جھٹکا لگتا ہے۔

ہمارے والد صاحب جس لڑکی سے شادی کر رہے تھے' اس کا تعلق اپنے ہی شاہی خاندان سے تھا اور وہ لڑکی عمر میں مجھ سے ایک سال بڑی تھی۔ اس لڑکی کا نام راندہ تھا۔

ماں کو فوت ہوئے صرف چار ماہ ہوئے تھے کہ ہمارے والد نے دوسری شادی کر لی۔ اس شادی میں میرے سوا سب گھر والے شریک ہوئے۔ میں نے اس شادی کی کسی بھی رسم میں شرکت نہ کی۔ اس صورتحال پر میری حالت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ میرے دل و دماغ اس نئی صورتحال کو قبول نہیں کر پا رہے تھے۔ مجھے اپنے والد پر سخت غصہ آ رہا تھا اور ان کی نئی نویلی بیوی راندہ کے خلاف میرے دل میں سخت نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ مگر یہ نفرت کا طوفان اس وقت ختم ہو گیا جب میں نے دلہن کا افسردہ چہرہ اور اس کی آنکھوں میں بے بسی اور خوف دیکھا۔ اس کے ہونٹ ڈر کی شدت سے لرز رہے تھے۔ راندہ کی بے بسی اور خوف کو دیکھ کر میرا غصہ اور نفرت ٹھنڈے ہو گئے۔ مجھے راندہ پر ترس آیا اور اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا کہ کیا میں یہ نہیں جانتی تھی کہ ہم عورتیں سعودی

معاشرہ کی قیدی ہیں، جہاں اپنی مرضی نہیں چلتی بلکہ سعودی مردوں کی مرضی چلتی ہے۔

جب والد صاحب اپنی نئی نویلی دلہن کو لے کر ہنی مون منانے کے لیے یورپ چلے گئے تو میرے دل میں ابو کے خلاف بچپن سے بویا ہوا نفرت کا بیج ایک تناور پودا بن گیا۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ میں اب کبھی بھی ابو کو معاف نہیں کروں گی اور ان کی نئی بیوی اور اپنی سوتیلی ماں کو بھی عورتوں کے حقوق اور آزادی کی جدوجہد میں شامل کر کے رہوں گی۔

ٹھیک چار ہفتے بعد ابو اور راندہ یورپ سے واپس آئے تو ہمارے محل میں منتقل ہو گئے۔ جب سے راندہ یورپ سے لوٹی تھی تب ہی سے وہ اپنے خیالوں میں گم کہیں کھوئی ہوئی رہتی تھی۔ وہ ضرورت کے علاوہ زیادہ بات نہیں کرتی تھی۔ والد صاحب کا زیادہ وقت اس کے ساتھ گزرتا تھا۔ بیچاری راندہ ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے کسی کھلونے کی مانند بے جان سی زندگی بسر کر رہی تھی۔

راندہ کے ان حالات کو دیکھ کر میں بہت رنجیدہ ہوئی۔ بالآخر میں نے عورتوں کی آزادی اور حقوق کے لیے راندہ اور اپنی دو دوستوں کے ساتھ مل کر ایک کلب بنایا جس کا نام ''آزاد ہونٹ'' رکھا۔ ہم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھیں کہ جو قدم ہم نے اٹھایا ہے اس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں صرف موت ہے مگر ہم نے سوچا کیوں نہ اپنی سی ایک کوشش کر کے دیکھی جائے۔ اس کلب کے قیام میں میری مددگار دونوں سہیلیوں ،جن کے نام نادیہ اور وفا تھے، اگرچہ شاہی خاندان سے کوئی ربط نہ تھا البتہ وہ سعودی عرب کے دارلسلطنت الریاض کے انتہائی امیر اور بااثر گھرانوں کی لڑکیاں تھیں۔ میری ان دو دوستوں میں سے صرف نادیہ ایسی خوش نصیب تھی کہ اس کا والد اسے اعلیٰ تعلیم دلوانے کا خواہش مند تھا اور اس کی اکثر و بیشتر باتیں مان بھی لیتا تھا۔

البتہ نادیہ کے برعکس وفا بدنصیب تھی وہ اپنے ہی گھر میں کسی قیدی کی مانند زندگی کے دن کاٹ رہی تھی۔ اس کی وجہ اس کا اپنا باپ تھا جو کہ الریاض کا ایک بااثر مطاوئی تھا۔ وفا جب صرف سات سال کی تھی تو اسے عبا پہننا پڑی۔ جیسے جیسے اس کی عمر

بڑھتی گئی ویسے ویسے وہ سخت سے سخت پابندیوں میں جکڑتی گئی۔ ان پابندیوں نے وفا کو سعودی روایات اور سماجی اقدار کا باغی بنا دیا۔ پھر اس کی ماں بھی چوری چھپے اس کی حمایت کرنے لگی۔ جب بھی وفا' نادیہ اور میرے ساتھ گھر سے باہر شاپنگ کے بہانے جاتی تو اگر اس کا والد گھر آ جاتا اور اس کے بارے میں پوچھتا تو اس کی بیوی (وفا کی ماں) اسے یہ کہنے میں برائی نہ سمجھتی کہ وفا اپنے کمرے میں قرآنِ مجید کی تلاوت کر رہی ہے جبکہ اس وقت ہم ڈرائیور عمر کو دھوکا دے کر نامحرم مردوں کے ساتھ بات چیت اور ہنسی مذاق کر رہی ہوتی تھیں۔ اور ہمیں ایسا کرنے میں بہت تسکین ہوتی تھی۔

نادیہ اور وفا کو غیر ملکیوں سے پیار بھری باتیں کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہم یہ حرکتیں اپنے اوپر لگنے والی بے جا پابندیوں کے خلاف احتجاجاً کرتی ہیں۔ سعودی عرب کے فرسودہ قوانین اور رسوم و رواج نے اس بے چاری لڑکیوں کے ذہنوں کے ساتھ ساتھ دلوں کو بھی زنگ آلود کر دیا تھا۔ وہ اپنے سیاہ مستقبل کو روشن دیکھنے کی خواہش مند تھیں۔

ان پابندیوں میں جکڑی نجانے کتنی ہی ایسی لڑکیاں قانون توڑنے پر مجبور ہو چکی تھیں۔ اگرچہ ان کو اس حقیقت کا بخوبی علم تھا کہ اگر ان کا راز کھل گیا تو صرف اور صرف موت ہی ان کا مقدر بنے گی۔ پھر جلد ہی یہ راز کھل گیا۔ نادیہ اور وفا دھر لی گئیں۔ درحقیقت پچھلے کئی روز سے کسی نے ان کی شکایت مطاوئ کو کر دی تھی' جس کی بنا پر ان کی خفیہ نگرانی ہو رہی تھی۔ بالآخر طبی معائنے کے اس نتیجے میں کہ ان کی دوشیزگی برقرار تھی' انہیں آزاد کر دیا گیا البتہ ان کے والدین' مورال کمیٹی اور مذہبی کونسل اس بات پر غصے میں تھے کہ انہوں نے اپنے ڈرائیور کے وقت پر نہ آنے پر غیر ملکی مرد سے لفٹ لی تھی۔ (یہ من گھڑت کہانی وفا اور نادیہ نے حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے انہیں سنائی تھی)۔

آخرکار پکے ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے مورال کمیٹی نے وفا اور نادیہ کو تین ماہ کی قید کے بعد ان کے والدین کے حوالے کر دیا' تاکہ وہ اپنے طور پر بھی انہیں مناسب

سزا دے سکیں۔ وفا کے والد نے اس کو اتنی بڑی سزا دی کہ وفا کے ساتھ ساتھ میری روح بھی کانپ اٹھی۔ اس نے اس کی شادی دور دراز کے چھوٹے سے گاؤں کے ایک ترپین سالہ بدو بوڑھے کے ساتھ کر دی جو کہ وہاں کا مطاوئی تھا۔ سترہ سالہ وفا اس کی تیسری بیوی بنی۔ وفا کے والد نے یہ شادی اتنی جلدی طے کی کہ بہت سارے لوگوں کو شرکت کا موقع ہی نہ ملا۔ ادھر نادیہ کے والد نے غصیلے انداز میں کہا کہ جب تک وہ نادیہ کے لیے کسی سخت ترین سزا کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر پاتا تب تک وہ اس سے بات نہیں کرے گا۔

اس سارے واقعہ کو صرف چند ہی روز گزرے تھے کہ ابو نے مجھے اور راندہ کو بلوایا۔ ہم دونوں کی حالت بڑی پتلی ہو رہی تھی۔ ہم یہ ہرگز نہیں جانتی تھیں کہ آنے والے لمحات میں کیا ہونے والا ہے! ابو نے ہمیں بتایا کہ کل نادیہ کا باپ اس کو تالاب میں ڈبونے جا رہا ہے' اور اس ساری کارروائی کو اس کا پورا خاندان دیکھے گا۔ یہ خبر سن کر ہم دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔ ابو نے راندہ سے وفا اور نادیہ کی شرمناک حرکتوں میں میری شرکت کے بارے میں پوچھا تو میں نے صوفے سے اٹھتے ہوئے انکار کرنے کی کوشش کی مگر ابو نے چلاتے ہوئے مجھے واپس صوفے پر دھکیلا اور راندہ کی طرف مڑے۔

راندہ خوف اور شرمندگی کے مارے خوب روئی پیٹی اور وہ واقعہ لفظ بہ لفظ سنا دیا جب وہ میرے ہمراہ عبا خریدنے کے لیے بازار گئی تھی اور ہم نے کار پارکنگ اسٹینڈ میں ایک غیر ملکی مرد سے بات چیت کی تھی۔ ابو کا چہرہ یہ سن کر حیرت و صدمے سے پہلے پیلا ہوا پھر غصے سے سرخ ہو گیا۔ پھر انہوں نے ہمارے سامنے گرل کلب کے کاغذات رکھ دیئے اور اس کے بارے میں پوچھا۔ ان کے اس انکشاف پر کہ نادیہ نے انہیں گرل کلب کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ راندہ چپ کی چپ رہ گئی اور مجھے بھی زندگی میں پہلی مرتبہ اس موقعہ پر خاموش ہونا پڑا۔ ابو نے خاموشی سے کلب کے کاغذات اپنے بریف کیس میں رکھے اور راندہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا: ''آج میں

تمہیں آزاد کرتا ہوں' میری طرف سے تمہیں طلاق دی جاتی ہے۔ تمہارا والد تمہیں لینے کے لیے جلد ہی ڈرائیور بھیج دے گا اور آج کے بعد تم کبھی بھی میرے بچوں سے نہیں مل سکتیں۔''

ابو راندہ کو یہ سب باتیں سنا کر میری طرف پلٹے اور میرے خوف میں مزید اضافہ کرتے ہوئے بولے: ''تم میری بیٹی ہو! تمہاری ماں ایک باکردار اور معزز خاتون تھیں' اگر تم وفا اور نادیہ کے ان شرمناک کرتوتوں مین ذرا سی بھی ملوث ہوتیں تو میں تمہیں زمین میں زندہ دفن کر دیتا' اب تم صرف اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ میں جلد ہی تمہارے لیے مناسب رشتے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' ابو بڑی سنجیدگی اور تحکمانہ انداز میں اپنی بات کہتے ہوئے تھوڑا سا ٹھہرے' پھر مخاطب ہوئے: ''سلطانہ! تمہارا مستقبل اطاعت کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ زندہ رہنا چاہتی ہو تو تم اطاعت قبول کر لو' تمہارے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔''

بچپن سے لے کر جوان ہونے تک میں جن صدمات سے دوچار ہوئی ان سے میری ہمت کیا پست ہوتی الٹا میں اپنے خیالات اور مقصد حیات کی تکمیل کے لیے مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی اور یہ بھول گئی کہ کبھی کبھار مضبوط سے مضبوط تر انسانوں کو ایسے سخت ترین صدمے جھیلنے پڑتے ہیں جو ان کو توڑ دیتے ہیں۔

راندہ کی اچانک رخصتی' وفا کی شادی اور نادیہ کی المناک موت ایسے سانحے تھے کہ جنہوں نے میری ہمت کو توڑ دیا۔ میرا کسی چیز میں یا کام میں جی نہیں لگتا تھا۔ مجھ پر کاہلی اور سستی طاری تھی۔ میں اکثر بیشتر بیڈ پر لیٹی رہتی تھی۔ اٹھنے کو دل نہیں کرتا تھا۔ میری ملازمائیں میری حالت اور میرے دکھ کو اچھی طرح سمجھتی تھیں اس لیے ہر وقت میری دلجوئی میں لگی رہتی تھیں کیونکہ میں بھی (دوسری سعودی عورتوں کے برعکس) ان کے دکھ درد میں شریک رہتی تھی۔

مجھے زندگی کی طرف واپس لانے کے لیے میری فلپائنی ملازمہ مرسی اپنے ملک فلپائن کی کہانیاں سنایا کرتی تھی جس سے میرے خیالات کو جلا ملتی۔ ایک روز باتوں ہی

باتوں میں اس نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ ہماری فیملی میں گھریلو ملازمہ کے طور پر کام کر کے اتنی رقم جمع کرنا چاہتی تھی جس سے وہ واپس اپنے ملک فلپائن جا کر نرسنگ کی تعلیم حاصل کر سکے کیونکہ اس وقت ساری دنیا میں فلپائنی نرسوں کی مانگ بہت زیادہ تھی اور فلپائن میں تو یہ ایک منافع بخش پیشہ سمجھا جاتا ہے۔ مرسی نے بتایا کہ وہ بی۔ اے کے بعد واپس سعودی عرب آ کر یہاں کے کسی اچھے ہسپتال میں بطور نرس کام کرنا چاہے گی۔ یہ سب بتا کر وہ چند لمحوں کے لیے اپنے خیالات میں کھوگئی اور پھر تھوڑی دیر بعد مسکراتی ہوئی کہنے لگی کہ یہاں پر ایک فلپائنی نرس کو ماہوار تین ہزار آٹھ سو ریال تنخواہ ملتی ہے جبکہ ہماری ملازمہ کے طور پر کام کرتے ہوئے اسے ماہوار دو سو ڈالر کی بجائے ایک ہزار ڈالر ماہوار تنخواہ ملے گی۔ امیدوں' امنگوں' آرزوؤں' خواہشوں کے ملے جلے جذبات میں بہتے ہوئے اس نے بتایا کہ اتنی زبردست تنخواہ کے ساتھ وہ فلپائن میں آباد اپنے خاندان کی بہتر انداز میں مالی مدد کرنے کے قابل ہو جائے گی۔

جب وہ صرف تین سال کی تھی تو اس کا والد فوت ہو گیا۔ یوں ان کی زندگی بڑی مشکل سے گزرنے لگی۔ اس کی ماں ایک ہوٹل میں ڈبل شفٹ ویٹرس کا کام کرتی تھی۔ وہ ایک عقل مند اور کفایت شعار خاتون تھی۔ اس نے اپنی فیملی کی کفالت کے ساتھ اپنے بچوں کی تعلیم پر خاصی توجہ دی۔ مرسی کے نرسنگ اسکول میں داخلے سے دو برس قبل اس کا بھائی' جس کا نام ٹونی تھا' ایک حادثہ میں اپنی دونوں ٹانگیں گنوا بیٹھا۔ یوں تمام جمع پونجی اس کے علاج معالجے پر خرچ ہو گئی اور مرسی کا نرسنگ اسکول میں داخلہ نہ ہو سکا۔

مرسی کی غم ناک کہانی سن کر میں اپنے غم بھول گئی اور خوب آنسو بہائے۔ اس طرح کئی ہفتے گزر گئے۔ پھر ایک روز مرسی نے مجھے میڈلین نامی اپنی دوست کی بڑی افسوسناک کہانی سنائی جس سے مجھے اپنے ملک کی اخلاقی قدروں پر شک ہونے لگا کہ آیا یہ واقعی وہی اسلامی قدریں ہیں' جن کا سعودی زور شور سے پرچار کرتے ہیں! ہرگز

نہیں، میرے ملک میں تیسری دنیا کی عورتیں جنسی خواہشات کا سامان سمجھی جاتی ہیں۔

میڈلین، مرسی کی بچپن کی سہیلی تھی۔ میڈلین بھی ایک انتہائی غریب لڑکی تھی۔ وہ اتنے غریب تھے کہ زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے اکثر وہ اپنے صوبے کو منیلا سے ملانے والی سڑک پر بھیک مانگتے تھے۔ میڈلین دیگر فلپائنی لڑکیوں کی طرح ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ جب وہ اٹھارہ سال کی تھی تو اس نے مرسی کے ایک پرانے کوٹ سے ایک خوبصورت لباس تیار کیا اور فلپائن کے دارلحکومت منیلا جا پہنچی۔ جلد ہی اسے ایک ایجنسی کی مدد سے سعودی عرب کے دارلسلطنت الریاض میں ملازمہ کی حیثیت سے نوکری ملی۔ جاتے وقت میڈلین جہاں بہت خوشی تھی وہاں ان جانے حالات کی وجہ سے خوفزدہ بھی تھی۔ مگر مرسی نے اسے گلے لگا کر تسلی دی کہ وہ خود بھی اسی ایجنسی کے توسط سے سعودی عرب میں کوئی نوکری حاصل کرنے کی کوشش کرے گی اور جب اسے اس ملک میں نوکری ملی تو جلد ہی وہ میڈلین سے ملاقات کرے گی۔ یوں دونوں سہیلیاں زیادہ دور نہیں ہوں گی۔

میڈلین کو سعودی عرب گئے چار ماہ گزر گئے مگر مرسی کو اس کی کوئی اطلاع کہیں سے بھی نہیں ملی تھی۔ مرسی بہت پریشان تھی۔ اس کو بھی سعودی عرب میں نوکری مل گئی تھی اور اتفاق سے الریاض شہر میں نوکری ملی تھی۔ مگر پریشانی کے عالم میں اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ اپنی دوست کو کہاں اور کیسے ڈھونڈے؟ مرسی نے بات آگے بڑھاتے ہوئے جو کچھ کہا وہ سن کر میں شدت غم و رنج سے سن ہو کر رہ گئی کہ میرے وطن میں فلپائنی ملازمین اور دوسرے غیر ملکیوں کے ساتھ بہت برا رویہ روا رکھا جاتا ہے۔ بات بات پر ان کی سب کے سامنے بےعزتی کی جاتی ہے اور مارنا پیٹنا بھی روزمرہ کا معمول ہے۔ اس نے مزید انکشاف کیا کہ ابو کی دوسری بیوی نے ایک پاکستانی ملازمہ کو بغیر کسی وجہ کے سیڑھیوں پر سے دھکا دے کر گرا دیا تھا جس کی وجہ سے اس بےچاری کے سر میں سخت چوٹیں آئیں وہ شدید زخمی ہوئی، لیکن اسے اس کے ملک پاکستان واپس بھیج دیا گیا۔ اسے دو مہینے کی تنخواہ بھی نہیں ملی، بلکہ روانگی کے وقت اسے صرف پچاس

ریال بطور خیرات دے کر ملک سے نکال دیا گیا۔

سعودی عرب میں غیر ملکی عورتوں کے ساتھ جسمانی و جنسی تشدد کے واقعات کو دبا دیا جاتا ہے۔ مرسی جب یہ سب انکشافات کر رہی تھی تو اس کے لہجے سے شکستگی جھلک رہی تھی۔ خواتین کے حقوق اور آزادی کے لیے میرے دل و دماغ میں جو تڑپ تھی وہ مرسی کے انکشافات سے اور زیادہ جلا پا رہی تھی۔ جب مرسی نے میری دلچسپی کو بھانپا تو اس نے مجھے میڈلین کے بارے میں مزید بتایا۔

میڈلین نے رخصت ہوتے وقت مرسی کو اپنا پتا بتایا تھا۔ جب مرسی سعودیہ آئی اور ہمارے ہاں اسے نوکری ملی تو وہ بہت خوش تھی کیونکہ وہ اپنی دوست کے قریب آن پہنچی تھی۔ اگرچہ میڈلین ضلع الملاز میں رہتی تھی اور مرسی النصریہ میں رہتی تھی اور ہمارے محل سے میڈلین کے مالک کے گھر تک کار کے ذریعے جانے کے لیے صرف تیس منٹ لگتے تھے۔ لیکن ہمارے ہاں تو بازار جانے کے لیے مہینے میں ایک مرتبہ شاپنگ کی اجازت ہوتی تھی اور مرسی کا محل سے باہر نکلنا ناممکن سی بات تھی۔ مرسی کی ان باتوں نے میرے تجسس کو مزید ہوا دی۔ میں اس موقع پر خاموش نہ رہ سکی اور اس سے پوچھا: ''آخر تم کس طرح میڈلین کے پاس الملاز پہنچی تھیں؟''

مرسی کو اس بات پر خوشی تو ہوئی کہ میں اس کی باتوں میں گہری دلچسپی لے رہی ہوں مگر میرے اس سوال پر وہ پہلے تو ہچکچائی' پھر اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور بولی ''آپ کے ہاں جو فلپائنی نژاد ڈرائیور ہے جس کا نام انتونیو ہے وہ مجھ سے اور میں اس سے بہت محبت کرتے ہیں۔ اسی نے مجھے ضلع الملاز لے جانے کا وعدہ کیا۔''

مرسی کی یہ بات سن کر میں ہنس پڑی اور کہنا کہ ''تم مصری ڈرائیور عمر کی شکرے جیسی آنکھوں سے خود کو کس طرح بچا لیتی تھیں؟''

''جب بھی مصری ڈرائیور عمر طائف جاتا تھا تو ہم دونوں اس موقعہ سے خوب فائدہ اٹھایا کرتے تھے'' مرسی نے یہ انکشاف ہنستے کم اور زیادہ جھینپتے ہوئے کیا۔

مرسی اور انتونیو بڑی مشکل سے میڈلین کے بتائے ہوئے پتا کے مطابق

میڈلین کے محل پہنچے تو...... یہاں تک پہنچ کر مرسی نے سانس لینے کے لیے اپنی بات کو ادھورا چھوڑا تو میں اس کی بات سننے میں اتنی مگن تھی کہ اس کا منہ تکنے لگی۔ مرسی نے میری آنکھوں میں مچلتے ہوئے سوالات کو پڑھا۔ پھر اس نے تھوک نگلتے ہوئے بات کو مزید آگے بڑھایا۔ اس موقعہ پر وہ بات کرتے ہوئے جذبات سے مغلوب تھی۔ اس نے گھبراتے ہوئے بتایا کہ میری ہمت تو محل کی بیرونی حالت کو دیکھ کر جواب دے گئی تھی۔ سو میں کار میں ہی بیٹھی رہی۔ انتونیو نے محل کی گھنٹی بجائی۔ کافی دیر تک مسلسل گھنٹی بجائے جانے پر بالآخر اس خستہ حال محل کے زنگ آلود لوہے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک یمنی بوڑھا نوکر نکلا۔

انتونیو نے ٹوٹی پھوٹی عربی میں اپنے آنے کا مقصد بیان کیا مگر وہ یمنی بوڑھا نہ مانا اور جانے کے لیے مڑا۔ اس موقعہ پر مرسی نے ہمت باندھی اور کار باہر نکلی اور پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا اور روتے ہوئے اس بوڑھے نوکر کو بتایا کہ وہ میڈلین کی سگی بہن ہے اور ایک شاہی خاندان کے ہاں کام کرتی ہے۔ اس نے جھوٹ میں مزید رنگ بھرنے اور زیادہ اثر پیدا کرنے کے لیے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لفافے کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا کہ یہ خط فلپائن سے میری ماں نے بھیجا ہے کہ وہ شدید بیمار ہے اور مرنے والی ہے اور اسے میڈلین سے صرف چند منٹ کے لیے بات کرنے دی جائے تاکہ وہ ماں کا آخری پیغام اسے پہنچا سکے۔ یہ سن کر بوڑھا سوچ میں پڑ گیا اور انہیں باہر انتظار کرنے کو کہہ کہ دوبارہ محل کے اندر غائب ہو گیا۔ ہمیں اس بات کا علم تھا کہ بوڑھا اندر جا کر میڈلین سے اس کی بہن کے بارے میں ضرور پوچھے گا۔ بالآخر کچھ وقت بیت جانے کے بعد وہی یمنی بوڑھا کسی بھوت کی طرح نازل ہوا اور صرف مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ اس اعصاب توڑ کہانی کے اس سنگین موڑ پر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے
"کیا تمہیں اس طرح تن تنہا اندر جاتے وقت ڈر نہیں لگا' میں تمہاری جگہ ہوتی تو فوراً مدد کے لیے پولیس کو بلا لیتی۔" میں نے پریشانی کے عالم میں مرسی سے پوچھا۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور کہا کہ اس ملک کی پولیس غیر ملکیوں کی کوئی مدد نہیں کرتی' یہاں کی پولیس

صرف طاقتور کا ساتھ دیتی ہے۔ مجھے مرسی کی اس بات پر صد فیصد یقین تھا کہ وہ بالکل صحیح کہہ رہی ہے۔ سعودی عرب مردوں کا ملک ہے یہاں کا قانون اور قانون کے رکھوالے بھی اپنی مرضی چلاتے ہیں۔ یہاں کی خواتین حتیٰ کہ میں ایک شہزادی ہوتے ہوئے بھی پولیس کی گرفت سے محفوظ نہیں تھی۔

میں مرسی کی دوست میڈلین کی کہانی کے الجھے ہوئے پہلوؤں کو جاننے میں محو ہو چکی تھی۔ پھر مرسی نے بات کا سلسلہ جوڑا۔ محل کی اندرونی حالت بیرونی حالت سے زیادہ خراب تھی۔ ہر طرف گندگی ہی گندگی پھیلی نظر آ رہی تھی۔ گھر والوں کے استعمال کا تالاب تک پانی سے خالی تھا اور اس تالاب میں بلی کے تین مرے ہوئے بچوں کے ڈھانچے پڑے ہوئے دکھائی دیئے۔ شاید بلی نے ان بچوں کو اسی تالاب میں جنم دیا ہوگا اور پھر وہ انہیں یہاں سے نکالنے میں ناکام رہی ہوگی۔ پانی کی قلت اور یقیناً گھر والوں کی توجہ نہ ملنے کی وجہ سے پودے سڑ رہے تھے۔ ایک پنجرہ بھی نظر آیا جس میں کچھ پرندے اسیر تھے جو بہت ہی سست اور اداس دکھائی دے رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ماحول کی سنگینی کا ان پر اس بری طرح اثر ہوا تھا کہ وہ میٹھے راگ الاپنا تک بھول چکے تھے۔ اس بوڑھے نے مرسی کو ایک کمرے میں جانے کا اشارہ کیا اور خود چلا گیا۔ مرسی نے جیسے ہی کمرے کے اندر قدم رکھے بے اختیار ٹھٹک گئی کیونکہ اندر سے گندی سڑی ہوئی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرا رہی تھی۔ مرسی بڑی خوفزدہ ہوئی اور اس نے کانپتی ہوئی آواز میں میڈلین کو پکارا۔ اچانک مرسی نے میڈلین کو تاریک راہداری سے آتے ہوئے دیکھا۔ پہلے تو میڈلین اسے ایک لمحے کے لئے پہچان نہ پائی اور جب اسے پہچانا تو بھاگ کر اپنی جگری دوست کے گلے سے جا لگی۔ کافی دیر تک دونوں آپس میں لپٹی رہیں۔ ایک طویل مدت تک کی جدائی اور پھر اس طرح عجیب و غریب ماحول میں ملاپ، نجانے وہ کتنی دیر تک سکتے کی سی کیفیت میں مبتلا رہیں؟

میں سانس روکے ہوئے مرسی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس کی کہانی میں گم تھی۔ مرسی کی میڈلین سے ملاقات کا سنا تو مجھے یک گونہ اطمینان محسوس ہوا ورنہ

مجھے یہ توقعات تھے کہ شاید مرسی اپنی دوست میڈلین کو کسی غلیظ دری پر زندگی اور موت کی جدوجہد میں مبتلا پائے گی۔

''پھر کیا ہوا؟'' میں نے بڑی بے چینی سے کہا' اب میں فوری طور پر اس کہانی کے انجام تک پہنچنا چاہتی تھی۔ اس موقع پر مرسی کی آواز نہایت دھیمی ہو گئی۔ لگتا تھا جیسے اسے ان پرانی یادوں کو جوڑنے اور بیان کرنے میں سخت اذیت سے گزرنا پڑ رہا ہو۔

''میڈلین مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔''

مرسی کہانی کا سلسلہ پھر سے جوڑتے ہوئے بولی اور پھر زاروقطار رونے لگی۔ میں نے تسلی دینے کی خاطر اس کے بالوں کو سہلایا اور اس کی پشت کو تھپتھپاتے ہوئے اس کی ہمت بڑھائی اور حوصلہ دیا اور کہا کہ وہ آگے بتائے اس کے ساتھ کیا پیش آیا اور کس طرح کے حادثات سے گزری؟ میڈلین نے آنسو پونچھے اور مرسی کو اپنے اوپر بیت جانے والی دلدوز کہانی سنائی:

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں پہلی بار سعودی عرب آئی۔ مجھے لینے کے لیے ایئرپورٹ پر دو یمنی نوکر آئے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے میرے نام کا پلے کارڈ اٹھایا ہوا تھا۔ پلے کارڈ پر اپنا نام پڑھا تو فوراً ان کی طرف بڑھی اور اپنا تعارف کروایا۔ انہوں نے کوئی جواب دیئے بغیر مجھے اشارے سے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ میں ان خشک مزاج یمنیوں کے ساتھ ہو لی کیونکہ میرے پاس کوئی دوسرا راستہ ہی نہ تھا۔ رات ہو چکی تھی جب یمنی نوکروں کے ساتھ میں مطلوبہ محل پہنچی۔ گھر والے حج کی غرض سے مکہ گئے ہوئے تھے اور رات ہونے کی وجہ سے مجھے محل دیکھنے کا موقع نہ ملا اور تھکن کی وجہ سے بھی میں جلد سو گئی۔ جب صبح ہوئی اور میں سو کر اٹھی اور میری نظر اپنے کمرے پر پڑی تو میں حیران رہ گئی۔ میرا کمرہ قدیم دور کے بوسیدہ' گندگی سے اٹے ہوئے تنگ و تاریک کمرے کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ رات کے کھانے کے برتن کھلے پڑے تھے اور ان میں لال بیگ اور کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔ کمرے کے ساتھ ایک تنگ سا غسل خانہ بھی تھا مگر شاور بند تھا۔ ٹونٹیوں سے بھی پانی کم کم آ رہا تھا۔ غسل کا ارادہ ترک

کرتے ہوئے میں نے سنک پر رکھے ہوئے غلیظ صابن کے بچے کھچے ٹکڑوں کو کراہت سے اٹھایا اور ان کی مدد سے منہ دھویا۔ مجبوری تھی سو ان سے کام چلایا۔ پریشانی کے عالم میں میرے دل سے یہ ندا نکلی کہ یاالٰہی میرے دل کی دھڑکنوں کو بند کر دے، مجھے ذلت سے بچالے۔ اسی سمے ایک بڑھیا کمرے میں آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر باورچی خانے میں لے گئی۔ اس نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ دے دیا۔ اس کاغذ پر میرے ذمے جو کام تھے وہ درج تھے۔ کھانے پکانے، صفائی کرنے میں باورچی کی مدد کرنا، گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کرنا میرے فرائض میں شامل تھا۔ بوڑھی عورت نے اشارے سے مجھے کہا کہ میں خود اپنے لیے ناشتہ تیار کروں۔ چنانچہ میں نے ناشتہ خود تیار کیا کھایا پیا اس کے بعد فرش اور برتنوں کو صاف کر کے گویا اپنے پہلے دن کے فرائض کا آغاز کر دیا۔

میرے علاوہ مزید تین عورتیں پہلے سے ملازم تھیں۔ ایک ساٹھ سالہ ہندوستانی بوڑھی باورچن تھی، دوسری سری لنکن عورت اور تیسری بنگالی عورت۔ باقی دونوں عورتوں کی عمریں تقریباً پچیس سال تھیں۔ البتہ سری لنکا کی عورت پرکشش اور تیکھے نقوش کی حامل تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت آئینے کے سامنے گزرتا تھا۔ وہ بے چینی سے اپنے مالک اور دیگر افراد کی واپسی کا انتظار کرتی۔ اس کے برعکس دیگر دوسری عورتیں اپنی موجودہ زندگی سے تنگ آ چکی تھیں اور خود کو قیدی سمجھ کر رہائی کے بارے میں سوچتی رہتی تھیں۔

ایک روز سری لنکن ملازمہ کا یہ حکم سن کر میرے حواس اڑ گئے اور میں گرتے گرتے بچی کہ میں اپنی پشت اس کی طرف کر کے سیدھی تن کر کھڑی ہو جاؤں۔ مجبوراً میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی تو اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے کولہوں پر رکھے اور بولی: میڈلین شاید تم مالک کے ذوق پر پورا نہ اتر سکو گی، البتہ مالک کے بیٹوں میں سے کوئی تمہیں ضرور پسند کرے گا۔ سری لنکن ملازمہ کی یہ عجیب وغریب باتیں میری سمجھ میں نہ آ سکیں۔

چار دن بعد گھر کے افراد مکہ سے حج کر کے واپس آ گئے۔

محل کے گھٹن زدہ ماحول نے میڈلین کو جہاں یاسیت' پریشانی اور خوف میں مبتلا کر دیا تھا' وہاں اس کے اندر فطرت کی طرف سے عطا کردہ خطرہ کو بھانپنے والی حس جاگ اٹھی۔ اس نے جلد بھانپ لیا کہ اس کا مالک گھٹیا اخلاق اور بھونڈے ذوق کا حامل شخص ہے۔ قسمت نے اتفاق سے انہیں دولت مند بنا دیا تھا وگرنہ پہلے وہ نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک مسلمان عورت کے علاوہ دیگر مذاہب کی تمام عورتیں بے غیرت اور فاحشہ تھیں۔

اپنی جنسی بھوک مٹانے کی غرض سے باپ اپنے دونوں لڑکوں کے ساتھ تھائی لینڈ کا دورہ کرتا اور تینوں مل کر خوبصورت تھائی خواتین کی جنسی خدمات خریدتے تھے۔ اس وقت میڈلین کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب اس کے مالک نے جذبات سے عاری لہجے میں اس کو بتایا کہ اسے اس کے دونوں بیٹوں کی جنسی بھوک مٹانے کے لیے خریدا گیا ہے اور ہر دوسرے دن اسے اس کے بیٹوں باسل اور نارس کے بستر میں رات گزارنا ہوں گی۔ یہ بات سن کر میڈلین کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی۔ ادھر مالک نے میڈلین کو دیکھتے ہی اعلان کر دیا کہ میڈلین اس کے ذوق کے مطابق ہے اور وہ پہلے اس کے بستر میں آئے گی۔ جب وہ اپنی جنسی بھوک مٹالے گا تو پھر اس کے بیٹوں کو اجازت ہوگی کہ وہ میڈلین کو اپنے استعمال میں لاسکیں۔

میں حیرت' خوف اور غم کی ملی جلی کیفیت میں گھر کر رہ گئی۔ مجھے اپنا سانس پھولتا ہوا محسوس ہوا' میری سننے کی طاقت جواب دینے لگی تھی۔

مرسی نے سسکی لی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی: ''حج سے لوٹنے پر پہلی ہی شب کو مالک (باپ) نے میڈلین کو اپنے بستر کی زینت بنایا اور زبردستی اس کی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں' خدا کے واسطوں کو نظرانداز کر کے میڈلین کو اپنی ہوس کا نشانہ بنایا۔ یہ تو شیطانی کھیل کا محض آغاز تھا۔ اس کے بعد میڈلین اسے اس قدر پسند آئی کہ اس نے یہ شیطانی کھیل روزانہ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔'' آخر میڈلین نے وہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی نہیں کی؟'' میں نے بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے پوچھا۔

مرسی نے مایوسی سے سر ہلایا اور کہا: ''اس کی یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ دوسرے نوکروں نے اس بارے میں اس کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔''

''میں میڈلین کی جگہ پر ہوتی تو کھڑکی سے چھلانگ لگا دیتی اور جان بچا کر بھاگ جاتی۔'' میں نے نفرت سے کہا۔

''اس نے ایک بار یہ کوشش بھی کی'' مرسی نے بات آگے بڑھائی اور کہا ''مگر موقع پر ہی پکڑی گئی اور اس کی سخت نگرانی ہونے لگی۔ ایک مرتبہ گھر کے تمام افراد سو رہے تھے تو اس نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور مدد کی اپیل لکھ کر رقعے چھت سے نیچے گرا دیئے۔ مگر جب یہ رقعے کسی سعودی پڑوسی کو ملے تو بجائے اس کی مدد کرنے کے' اس نے وہ رقعے یمنی نوکروں کے حوالے کر دیئے اور میڈلین کو اس جرم میں بہت بری طرح مارا پیٹا گیا۔

مرسی نے اپنی سہیلی کی مدد کے لیے بہت کوششیں کیں۔ وہ جدہ میں قائم اپنے سفارے خانے گئی۔ سفارت کاروں سے رابطہ کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ ایسے واقعات تو یہاں کا معمول ہیں' اس بارے میں سفارت خانہ کوئی قدم اٹھانے سے قاصر ہے۔ فلپائن کی حکومت کو اپنے ملک سے آئے ہوئے ان لوگوں کے زرمبادلہ بھیجنے میں دلچسپی ہے۔ اس لیے اس قسم کی ''فضول'' سی شکایت کر کے وہ سعودی حکومت کو خفا نہیں کر سکتے۔ ناچار مرسی نے میڈلین کی ماں کو خط کے ذریعے اس کے حالات کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور لکھا کہ وہ خود کچھ کرے۔ میڈلین کی ماں نے منیلا میں دفتر روزگار اور شہر کے ناظم سے مدد کی درخواست کی مگر کسی نے بھی اس کی مدد نہ کی۔

''اب میڈلین کدھر ہے اور کیسی ہے؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔ مرسی کسی قدر پیچھے ہوئی اور جواب دیا کہ اسے میڈلین کا خط ایک ماہ قبل ملا تھا۔ وہ اب فلپائن میں ہے کیونکہ اس کا دوسالہ معاہدہ ختم ہو چکا تھا اور میڈلین کی جگہ دو کم عمر خوبرو لڑکیاں رکھ لی گئی تھیں۔

یہ کربناک اور دل دہلانے والی کہانی سن کر میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں کرب، شرم، پچھتاوے اور بے بسی کے گرداب میں تھی۔ میری زبان پر اس سنگین حقیقت کو جان کر چپ کے تالے لگ گئے تھے میرے پاس اپنے ملک کے مردوں کے دفاع کے لیے الفاظ تک نہ تھے۔

12/جنوری 1972ء کو ہماری سوڈانی ملازمہ ہدا نے میرا اور سارہ کا ہاتھ دیکھ کر پیش گوئی کی کہ جلد ہی ہماری شادی ہونے والی ہے۔ جب شام کو ابو گھر آئے تو انہوں نے اعلان کیا کہ انہوں نے میرے لیے ایک معقول رشتہ ڈھونڈ لیا ہے۔ اگلے دن بہن نورہ نے یہ انکشاف کیا کہ میری شادی ہمارے ایک شاہی کزن کریم سے ہو رہی ہے۔ وہ اٹھائیس سال کا تھا اور میں اس کی پہلی بیوی بننے جا رہی تھی۔ کریم نے لندن سے قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رکھی تھی اور کاروباری حلقوں میں بھی بہت مقبول تھا۔ نورہ نے مزید بتایا کہ تم ایک خوش نصیب لڑکی ہو کیونکہ کریم ابو سے کہہ چکا ہے کہ میری تعلیم مکمل کرنے کے حق میں ہے اور یہ کہ وہ ایسی لڑکی کو بیوی کے روپ میں دیکھنا پسند نہیں کرتا جس سے اس کی ذہنی ہم آہنگی نہ ہو۔ جب نورہ چلی گئی تو میں نے کریم کی بہن کو بلوایا۔ میں نے اس سے کریم کو سمجھانے بجھانے کے لیے کہا کہ ابھی بہت وقت ہے اور وہ اس وقت سے فائدہ اٹھا کر شادی کے فیصلے پر نظر ثانی کرے کیونکہ اگر میری شادی ہو گئی تو میں کسی صورت میں کریم کو دوسری شادی نہیں کرنے دوں گی اور میرے منع کرنے کے باوجود اگر اس نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تو میں اس کی بیوی کو موقعہ ملتے ہی زہر دیکر جان سے مار دوں گی۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ میری باتوں کا اس پر اثر ہو رہا ہے تو اس موقعہ کو غنیمت جانتے ہوئے اپنی بات میں مزید اثر پیدا کرنے کے لیے کہا کہ اس وقت تو میں نے نقاب پہنی ہوئی ہے اور اگر میں تم پر اپنا چہرہ ظاہر کر دوں تو تم بری طرح دہشت زدہ ہو کر بھاگ جاؤ گی۔ میں نے کہا در حقیقت بات یہ ہے کہ اسکول لیبارٹری میں میرے اوپر تیزاب گر گیا تھا شومئی قسمت سے اس حادثے میں میرا چہرہ بری طرح جھلس گیا تھا۔ ابھی میں اپنی بات مکمل ہی نہیں کر پائی تھی کہ کریم کی بہن یہ کہانی اپنے

بھائی کو سنانے کے لیے وہاں سے فوراً چلی گئی۔ شام ہوئی تو والد صاحب کریم کی دو خالاؤں کے ساتھ غصے سے بھرے ہوئے محل میں آئے۔ ان خواتین نے میرے چہرے اور ہاتھوں کو غور سے دیکھا کہ شاید کہیں پر جلے ہوئے نشانات دکھائی دیں، مگر حقیقت میں وہاں ایسا کچھ نہ تھا۔ وہ میری بے داغ جلد دیکھ کر چپ چاپ کھڑی تھیں۔ کہنے کو ان کے پاس کچھ نہ تھا وہ فوراً ہی وہاں سے چلتی بنیں۔ ادھر والد صاحب پر نجانے کدھر سے میرے لیے شفقت امنڈ آئی۔ انہوں نے بڑی محبت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ میں نے اس موقعہ سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور مطالبہ کر دیا کہ میں شادی سے پہلے کریم سے بات چیت کرنا چاہتی ہوں۔ والد صاحب نے یہ سنا تو فوراً پلٹ کر سارہ کی طرف دیکھا۔ نجانے انہوں نے اس کی آنکھوں میں کیا دیکھا کہ وہ رنجیدہ ہو گئے۔ انہوں نے سارہ کو اپنے پاس بلا لیا۔ ہم تینوں میں اگرچہ اس موقعہ پر زبان سے کوئی بات نہ ہو سکی مگر اس لمحے شاید آنکھیں دل کا حال زبان کی نسبت بہتر بیان کرنے کے قابل تھیں۔ میرے بھائی علی نے زندگی میں پہلی مرتبہ والد صاحب کو خواتین کے ساتھ اس قدر شفقت اور مہربانی کا رویہ اپناتے ہوئے دیکھا تو ہکا بکا رہ گیا۔

دوسرا باب

مجھے یہ گمان تھا کہ کریم کا خاندان میرے سلوک سے خفا ہوگا اور اس شادی کی مخالفت کرے گا مگر مجھے اس وقت مایوسی ہوئی جب میرے گمان کے برعکس کریم اور اس کے والد میرے والد کے پاس آئے اور نہایت تہذیب کے ساتھ کریم اور میری ملاقات کی اجازت چاہی جو کہ بڑوں کی نگرانی اور موجودگی میں ہونا تھی۔ کریم تو مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا کیونکہ اس نے میرے بارے میں بہت کچھ سنا ہوا تھا اور اسے تجسس تھا کہ کہیں میں دیوانی تو نہیں؟ آخرکار کافی دیر تک بحث مباحثہ کے بعد ملاقات کی اجازت ملی۔

سعودی عرب میں شادی سے پہلے اپنے ہونے والے خاوند سے ملنا ناممکن ہے۔ مگر جب مجھے یہ حق ملا تو میں اس موقعہ پر بہت خوشی اور فرحت محسوس کر رہی تھی۔ یہاں کی عورت کے پاؤں میں تو ہمیشہ معاشرتی رسوم و رواج کی زنجیریں پڑی ہوتی ہیں اور وہ کسی اسیر کی مانند زندگی بسر کرتی ہے۔ شام کو کریم کے ساتھ صرف اس کی ماں آ رہی تھی۔ ان کے علاوہ نورا، سارہ اور خالہ کی موجودگی میں اس ملاقات کا بندوبست کیا گیا تھا۔

کریم جب آیا تھا تب ہی سے مجھے ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ میں اس روز مکمل بے باک بنی ہوئی تھی اور اپنے حسن و جمال کی ادائیں دکھانے کے موڈ میں تھی۔ میں نے کریم کو جھکی نظروں سے اپنی طرف مسلسل دیکھتے پا کر اوچھے انداز میں ہونٹ سکیڑ نے تو یہ دیکھ کر کریم کی ماں نے اپنی انگلیاں دانتوں میں دبا لیں۔ اسے میری یہ حرکتیں پسند

نہیں آئیں۔ انہوں نے یہ ضد پکڑ لی کہ اب یہ شادی نہیں ہو گی' مگر کریم تو میری ان اداؤں کا دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ جاتے وقت کہنے لگا کہ کیا وہ مجھ سے کسی شام فون پر بات کر سکتا ہے؟ میں نے فوراً چہک کر کہا: ''کیوں نہیں! تم کسی وقت بھی مجھے کال کر سکتے ہو۔''

مہمانوں کے جانے کے بعد میری بہنوں اور خالاؤں نے میری حماقتوں کے بارے میں بتانا شروع کیا اور یہ بھی کہا کہ کریم کی ماں کا بس چلا تو وہ یہ شادی کبھی نہ ہونے دیں گی۔ اس پر میں نے انہیں جواب دیا کہ کریم کی والدہ حاسد خاتون ہیں کیونکہ میں نے شادی سے پہلے کریم سے ملنے کی خواہش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی خالاؤں کو بھی منہ توڑ جواب دیا اور کہا کہ وہ بھی حاسد ہیں اور اتنی بوڑھی ہو گئی ہیں کو جوان دلوں کے احساسات کو سمجھ نہیں سکتیں۔ میری باتیں سن کر ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اور میں وہاں سے چل دی۔ میں اپنی قسمت پر رشک کر رہی تھی کہ میری شادی کسی بوڑھے سے نہیں ہو رہی تھی۔ رات کو کریم نے مجھے فون کیا اور بتایا کہ اس کی ماں اس شادی کی مخالفت کر رہی ہے لیکن وہ اپنی پسند سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ پھر اس نے سرگوشی کی: ''تم ہی میرے خوابوں کی شاہزادی ہو۔'' ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے اچانک مجھ سے ایسا سوال کیا کہ میں کنفیوز ہو گئی۔

کیا تمہارا ختنہ ہو چکا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ مجھے اس بارے میں کچھ معلومات نہ تھیں' اس لیے میں نے اس سے کہا کہ مجھے اس بارے میں معلوم نہیں ہے' میں والد صاحب سے پتہ کر کے بتاؤں گی۔ کریم گھبرا گیا اور تیزی سے کہنے لگا: ''نہیں' نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔'' میرے جواب سے وہ خوش تھا۔ سعودی عرب اور دیگر ممالک میں جنسی موضوعات پر بات کرنا ممنوع ہے۔ اس لیے خواتین اس موضوع پر کبھی کبھار ہی بات چیت کرتی ہیں۔ محلات میں تقریباً ہر روز خواتین مختلف تقریبات میں شریک ہوتی ہیں۔ اکثر خواتین اپنی شادی کی پہلی رات کے قصے سناتی ہیں۔

کریم کی بات میرے ذہن میں اٹک گئی تھی۔ اس لیے میں نے نورا سے اس

بارے میں پوچھا۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ میرے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ اس نے بتایا کہ جب وہ بارہ سال کی تھی تو اس کی رسم ختنہ کی گئی تھی۔ نورہ کے بعد تین اور بہنیں اس ظالمانہ رسم کا شکار ہوئیں۔ آخر ایک مغربی فزیشن نے گھنٹوں اس رسم کے خلاف دلائل دے کر والد کو قائل کر لیا۔ اس لیے آخری چھ بہنیں اس ظالمانہ رسم کا شکار نہ ہو سکیں۔ نورہ نے کہا تم ان چھ خوش قسمت بہنوں میں سے ایک ہو جس کو اس اذیت سے نہیں گزرنا پڑا۔ نورہ رونے لگی میں نے اس کو دلاسہ دیا۔

"آخر یہ رسم کس طرح ادا کی جاتی ہے" میں نے پر تجسس انداز میں پوچھا۔

نورہ نے غمزدہ ہو کر بتایا کہ "کئی نسلوں سے ہمارے خاندان میں یہ رسم ادا کی جا رہی ہے" اس نے یہ بھی بتایا کہ شادی سے چند ہفتے پہلے ہماری والدہ کا ختنہ بھی ہوا تھا۔ جبکہ اس کی ختنہ کی رسم والد نے ریاض کے قریب ایک گاؤں میں ادا کی تھی۔

اس سلسلے میں ایک تقریب ہوئی تھی۔ رسم کی ادائیگی سے پہلے اس کو بتایا گیا کہ یہ رسم ایک بزرگ خاتون ادا کریں گی۔ نورہ کو چاہیے کہ وہ بے حس و حرکت لیٹی رہے۔ رسم کے مطابق ایک عورت ڈھول بجاتی ہے اور کچھ عورتیں گیت گاتی ہیں۔ بزرگ خاتون بچی کے گرد چکر لگاتی ہے۔ نورہ کو بھی چار عورتوں نے زمین پر بچھی چادر پر لٹا دیا اور کمر سے نیچے اس کو عریاں کر دیا گیا۔ مصیبت میں مبتلا نورہ نے بزرگ خاتون کے ہاتھ میں جب تیز دھار آلہ دیکھا تو دہشت زدہ ہو گئی۔ وہ چیخی چلائی مگر افسوس......
اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے تناسلی عضو میں آگ بھر دی گئی ہو۔ وہ تکلیف سے بے حال ہو گئی۔ تکلیف میں مبتلا بچی کو ہوا میں اچھال کر بالغ ہونے کی مبارک باد دی گئی۔ خوف میں مبتلا نورہ نے اپنے زخموں سے خون بہتا ہوا دیکھا مگر افسوس کے سوا کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کے زخموں کی مرہم پٹی کر دی گئی۔

زخم تو جلد ہی ٹھیک ہو گئے مگر نورہ کو شادی کی رات ختنے کے خفیہ راز کا علم ہو سکا۔ اس نے ناقابل بیان اذیت برداشت کی۔ اس کا بہت زیادہ خون بہا۔ اس کا شوہر جب بھی مباشرت کرتا تو اس کو ناقابل برداشت اذیت جھیلنی پڑتی۔ آخرکار وہ جنسی عمل

سے خوفزدہ رہنے لگی۔ دوران حمل ایک مغربی ڈاکٹر نے اس کا طبی معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ اس کا بیرونی عضو تناسل مکمل طور پر کٹ چکا تھا۔ جس کی وجہ سے جنسی فعل کے دوران اسے ہمیشہ نا قابل برداشت اذیت سے گزرنا پڑے گا اور اس طرح خون بھی زیادہ بہے گا۔

مجھے یہ سب سن کر وحشت ہو رہی تھی میں نے نورہ سے پوچھا کہ "کریم نے مجھ سے اس بارے میں کیوں پوچھا تھا" اس نے کہا کہ کریم معقول آدمی ہے اور وہ چاہتا ہے کہ عورت کو مکمل ہونا چاہیے نہ کہ عضو بریدہ! نورہ نے مزید بتایا کہ اب بھی بہت سے مرد چاہتے ہیں کہ ان کی بیویاں ختنہ شدہ ہوں۔

ہماری شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی۔ یہ شادی یہاں کے رسوم و رواج کے برعکس ہوئی تھی کیونکہ میاں بیوی نے شادی سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھا اور پسند کیا تھا۔ ہنی مون کے لیے کریم نے وعدہ کیا کہ میں جہاں جانا چاہوں گی وہ میری فرمائش پوری کرے گا۔ میں نے قاہرہ، ہوائی، پیرس، لاس اینجلس اور نیویارک جانے کی فرمائش کی۔ ہمارے ہنی مون کا پروگرام آٹھ ہفتوں پر مشتمل تھا۔ شب و روز نہایت مسرت کے ساتھ بڑی تیزی سے گزرے۔ پہلی تین راتیں ہم نے الگ الگ خوابگاہوں میں گزاریں۔ لیکن چوتھی رات میں نے اپنے شوہر کو اپنے بستر پر کھینچ لیا۔ آٹھ ہفتوں کی بجائے ہمارے ہنی مون کا پروگرام دس ہفتوں پر محیط ہو گیا۔ آخر کار میرے سسر کے فون کرنے پر ہم واپس روانہ ہوئے مجھے معلوم تھا کہ میری ساس نورہ میری زندگی کو دوزخ بنا دے گی کیونکہ میں عام لڑکیوں کی طرح چاپلوس نہ تھی اور جائز و ناجائز حکم ماننے کی عادی نہ تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ کریم بھی عام عرب مردوں کی طرح ماں کے خلاف اپنی بیوی کی حمایت نہیں کرے گا۔

اگر خواتین کی ازدواجی زندگی کو ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ لفظ ہے "انتظار"۔ یہ لفظ میری والدہ کے دور زندگی کی خواتین کے لیے نہایت مناسب ہے۔ اس دور کی خواتین کے لیے تعلیم اور ملازمت کے کوئی مواقع نہ تھے اس لیے انہیں شادی

شدہ ہونے کا انتظار' پھر بچے پیدا ہونے کا انتظار' نواسے اور پوتے پوتی دیکھنے کا انتظار اور آخرکار بوڑھے ہونے کا انتظار رہتا تھا۔ عرب ممالک میں بوڑھا ہونا کسی نعمت سے کم نہیں کیونکہ جو عزت بوڑھے ہونے پر ملتی ہے جوانی میں تو اس کا تصور بھی ممکن نہیں۔

کریم میری ساس کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ یہاں کے رواج کے مطابق بڑے بیٹے کو اپنی ساس کے ہر حکم کو ماننا پڑتا ہے۔ مجھے بھی اس رواج کا علم تھا لیکن اس پر عمل کرنے میں مجھے کافی مشکل درپیش ہو سکتی تھی۔

ساری دنیا میں تقریباً ہر جگہ بیٹے کی خواہش کرنا عام بات ہے لیکن اس سلسلے میں سعودی عرب کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا' جہاں ہر عورت کے دل میں بیٹا پیدا کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے۔ شوہر کو مطمئن کرنے کا راز بیٹا پیدا کرنے میں چھپا ہے کیونکہ شادی کی اہم وجہ بھی بیٹا ہے۔ مجھے میری ساس نے گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے قبول نہ کیا۔ چند سال پہلے اس کی زندگی میں ایسا وقت بھی آیا تھا جس کی وجہ سے اس کی زندگی زہر آلود ہو گئی تھی۔

درحقیقت کریم کے والد کی پہلی بیوی نورہ (میری ساس) نے سات بچوں کو پیدا کیا جن میں تین لڑکے تھے۔ جب کریم چودہ سال کا تھا تو اس کے والد نے ایک خوبرو اور دلکش لبنانی لڑکی سے دوسری شادی رچالی۔ اس دن سے اس گھر کا امن وسکون تباہ و برباد ہو کر رہ گیا۔

نورہ اس دوسری شادی پر بہت ناراض تھی۔ وہ ایک کینہ پرور اور متعصب عورت تھی۔ نفرت کی آگ نے اسے اتنا نیچے گرا دیا کہ اس نے ایتھوپیا کے ایک جادوگر کی خدمات بھاری معاوضے پر حاصل کیں۔ اس سے کہا گیا کہ جادو کا ایسا عمل کرے کہ دوسری بیوی کی کوکھ کبھی ہری نہ ہو سکے اور وہ ہمیشہ بانجھ ہی رہے۔ نورہ کا خیال تھا کہ اس طرح دوسری بیوی کو طلاق دے دی جائے گی۔ مگر کریم کا والد دوسری بیوی سے بہت محبت کرتا تھا۔ اس نے اپنی لبنانی بیوی سے کہا کہ وہ بچے پیدا کرے یا نہ کرے اسے طلاق نہیں دی جائے گی۔ کچھ سال نورا نے اس امید پر گزار دیئے کہ شاید اب

دوسری بیوی کو طلاق ہو گی آخر نورہ کی امیدوں پر پانی پڑنے لگا۔ مایوسی کے عالم میں اس نے جادوگر کو پہلے سے زیادہ رقم ادا کی اور سوتن کی جان کے پیچھے پڑ گئی۔

نجانے کریم کے والد کو نورہ کی اس سازش کا کیسے علم ہوا۔ وہ سخت غصے میں نورہ سے کہنے لگے کہ اگر لبنانی عورت تم سے پہلے فوت ہو گئی تو میں تمہیں طلاق دے دوں گا اور ذلیل و خوار کر کے محل سے نکال پھینکوں گا' نیز تمہیں بچوں سے بھی نہیں ملنے دوں گا۔ نورہ کو پکا یقین تھا کہ لبنانی عورت کی کوکھ جادو کے باعث ہری نہ ہو سکی تھی اور اب وہ خوفزدہ تھی کہ جادو ہی کے اثر سے اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ چنانچہ شوہر کی دھمکی پر اسے اپنی جان خطرے میں نظر آئی۔ وہ اپنے منصوبے کے برعکس لبنانی عورت کی زندگی بچانے کی فکر میں مبتلا ہو گئی۔

لبنانی عورت پر اس کا بس نہ چلتا تھا لیکن میں اس کا اگلا ہدف تھی۔ کریم اگرچہ مجھ سے محبت کرتا تھا مگر وہ اپنی ماں میں بھی کوئی نقص نہیں پاتا تھا۔ کریم کی موجودگی میں وہ نہایت مکاری اور بناوٹ سے میرے ساتھ مہربانی سے پیش آتی۔

میں کریم کو الوداع کہنے روزانہ دروازے تک جاتی تھی۔ میں جونہی دروازے سے ہٹتی نورہ ملازموں کو بلانے کی بجائے مجھے بلا کر چائے لانے کا کہتی۔ میرا بچپن گھر کے مردوں کے برے رویے کے تھپیڑے کھا کر گزرا تھا۔ اب میں نے مزید کوئی ظلم برداشت نہ کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔ میں نے عہد کیا کہ کریم کی والدہ کو جلد معلوم ہو جائے گا کہ اس کا پالا سخت دشمن سے پڑا ہے۔

کریم کا چھوٹا بھائی منیر امریکا سے تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تھا لیکن اب اسے اس ملک (سعودیہ) میں وقت گزارنا مشکل دکھائی دیتا تھا۔ یہاں کوئی سینما یا کلب یا مخلوط پارٹیاں نہیں تھیں اور خواتین کو ریستورانوں میں نامحرم کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں تھی' جب تک وہ اپنے شوہر' باپ یا بھائی کے ساتھ نہ ہوں۔ بائیس سالہ منیر نے حال ہی میں واشنگٹن کے بزنس اسکول سے گریجویشن کی تھی۔ اسے شہزادوں کی صحبت میسر آئی تھی جو ایڈونچر کے طور پر غیر اخلاقی اور خلاف قانون کام کرتے رہتے

تھے۔ وہ مخلوط پارٹیاں دیتے تھے اور ایسی پارٹیوں میں شرکت بھی کرتے تھے۔ ان پارٹیوں میں غیرملکی اخلاق باختہ خواتین بھی شامل ہوتی تھیں۔ شراب عام چلتی تھی۔ کئی شہزادے شراب اور ہیروئن کے عادی ہو چکے تھے۔ وہ مغربی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ بیکار رہنے کی وجہ سے ان کا ذہن شیطان کا کارخانہ بن چکا تھا۔

شاہ فیصل اگرچہ نوجوانی میں آزاد خیال اور فیشن ایبل تھا مگر اب وہ ایک پرہیزگار بادشاہ کا روپ اختیار کر چکا تھا۔ اس نے ان شہزادوں کو کاروبار پر لگا دیا اور کچھ فوج میں آ گئے۔ آج صرف کچھ غیرملکی ہی اس بات سے آشنا ہیں کہ 1952ء سے پہلے غیرمسلموں کے لیے شراب پر پابندی عائد نہ تھی۔ دو المناک واقعات میں شہزادوں کے ملوث ہونے کی وجہ سے پہلے بادشاہ عبدالعزیز نے شراب پر مکمل پابندی لگا دی تھی۔ 1940ء کے آخر میں ہمارے بادشاہ کا بیٹا ناصر جب ریاض کا گورنر بنا تو اس نے خفیہ طور پر شراب کے کاروبار کا اہتمام کیا۔ وہ ممنوعہ مخلوط پارٹیاں منعقد کرواتا تھا۔ 1947ء کے موسم گرما میں ایک ایسی ہی پارٹی کے سات شرکاء، جن میں خواتین بھی شامل تھیں، شراب زیادہ پینے کے باعث مر گئے۔

اپنے بیٹے ناصر کی اس سنگین ترین حرکت پر شاہ عبدالعزیز اتنے خفا ہوئے کہ انہوں نے خود اپنے بیٹے کی نہ صرف پٹائی کی بلکہ اسے جیل کی ہوا بھی کھلائی۔ بعدازاں 1951ء میں بادشاہ کے ایک دوسرے بیٹے مشاری نے نشے میں دھت ہو کر برطانوی نائب سفیر کو گولی سے اڑا دیا۔ اس کی بیوی بھی زد میں آئی۔ اس ناخوشگوار واقعے کے بعد سعودی عرب میں شراب پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ جس کے نتیجے میں بلیک مارکیٹنگ اسکیمیں وجود میں آئیں۔

فطری طور پر ہر کلچر کے لوگ اس چیز کے حصول کے لیے زیادہ کوشش کرتے ہیں جس پر سرکاری و مذہبی پابندی عائد ہوتی ہے۔ یہاں بھی کئی سعودی مرد و زن خوب پیتے پلاتے ہیں اور ایک بہت بڑی تعداد تو باقاعدہ عادی بن چکی ہے۔ سعودی عرب میں مَیں نے کوئی ایسا گھر نہیں دیکھا جس میں مہمانوں کے لیے اعلیٰ قسم کی شراب موجود

نہ ہو۔

1952ء میں اسکاچ کی ایک بوتل کی قیمت 650 سعودی ریال (200 ڈالر) تک ہو چکی تھی اور منیر اور دو عم زاد شہزادوں نے اردن سے شراب کی کھیپ غیر قانونی طور پر یہاں لا کر دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی تھی۔

یہ ہفتے کا دن تھا۔ کریم کا خاندان یہ دن کبھی نہ بھلا پائے گا۔ کریم کو لندن کے بروکر نے اطلاع دی کہ وہ اسٹاک مارکیٹ میں پچھلے ہفتے کے دوران ایک ملین ڈالر سے زیادہ رقم ڈبو چکا ہے۔ اس صدمے سے نڈھال کریم جونہی گھر میں افسردہ چہرے کے ساتھ تھکا ٹوٹا ہارا سا داخل ہوا نورہ نے سسکیاں بھرتے اور مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے کہا:

''تمہاری بیوی نے بغیر کسی وجہ کے میرے ساتھ جھگڑا کر کے سب کے سامنے میری بے عزتی کی ہے۔'' اس نے مزید زہر اگلتے ہوئے کہا کہ ''یہ تمہاری بیوی بننے کے لائق ہی نہ تھی اور یہ کہ اگر وہ میرے کرتوتوں سے واقف ہو جائے تو فوراً طلاق دے دے۔''

کوئی عام دن ہوتا تو کریم اسے ساس بہو کا جھگڑا قرار دے کر شاید نظر انداز کر دیتا' مگر وہ رقم ڈوبنے کے صدمے سے دوچار تھا لہٰذا ماں کو نہ جھٹلا سکا اور مجھے تین زوردار تھپڑ رسید کر دیئے۔ میرے گال سرخ ہو گئے۔

میں نے پانچ سال کی عمر سے ہی حالات سے لڑنا سیکھ لیا تھا۔ میں نے غصے میں آ کر ایک قیمتی گلدان اٹھا کر کریم پر دے مارا۔ اس نے جھکائی دے کر وار خطا کیا اور گلدان ہزاروں ڈالر کی مالیت کی پینٹنگ سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا۔ قیمتی پینٹنگ بھی تباہ ہو گئی۔ میرے غصے کا طوفان رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ میں نے انتہائی قیمتی ہاتھی دانت کا مجسمہ اٹھا کر کریم پر کھینچ مارا۔ دھماچوکڑی اور شوروغل سن کر سارے ملازمین جائے وقوعہ پر پہنچ گئے۔ کریم نے بھانپ لیا کہ میں محل میں موجود قیمتی اشیاء کو تباہ و برباد کرنے پر تلی ہوئی ہوں۔ اس نے ایک زوردار گھونسہ میرے جبڑے پر مارا۔ میری

آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے' ہر طرف دھندلا اندھیرا چھایا ہوا محسوس ہوا اور میں چکرا کر گر پڑی۔

جب مجھے ہوش آیا تو مرسی میرے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مار رہی تھی۔ فاصلے پر مجھے اونچی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے مرسی نے بتایا کہ یہ آوازیں تمہارے جھگڑے کے حوالے سے نہیں بلکہ منیر کی لائی ہوئی تازہ پریشانی کے بارے میں ہیں۔ شاہ فیصل نے کریم کے والد کو بلوایا تھا۔ منیر اور ایک اور شہزادے نے مصری ڈرائیور کو شراب کی گاڑی حوالے کی تھی۔ مگر کنٹینر لیک ہوا اور شراب گاڑی سے نیچے بہنے لگی۔ جس پر وہ دھر لیا گیا۔ گرفتاری پر اس نے ساری کہانی سنا ڈالی۔ منیر کی تلاش کے لیے والد نے اپنے ڈرائیور روانہ کر دیئے۔ میں نے اپنا جبڑا سہلایا اور اپنی ساس نورہ سے انتقام لینے کا سوچنے لگی۔ وہ بیٹے کے غم میں زاروقطار رو رہی تھی۔ مجھے اسے غمگین دیکھ کر بڑا سکون ملا۔ میں اس کے کمرے میں جا پہنچی۔ اس کی حالت دیکھ کر میرا مسکرانے کو دل چاہا مگر جبڑے نے اجازت نہیں دی۔ نورہ گڑگڑا کر منیر کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھی۔

نورہ نے میرے آنے کا نوٹس لیا تو رونا پیٹنا بند کر کے خاموشی اختیار کر لی۔ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے نفرت سے مجھے دیکھا اور ناک چڑھاتے ہوئے بولی: ''کریم نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہیں طلاق دے دے گا۔''

نورہ کو یہ توقع تھی کہ میں اس کے قدموں میں گر جاؤں گی اور گڑگڑا کر معافی مانگوں گی مگر میں نے تڑاخ سے جواباً کہا: ''میں تو خود تمہارے بیٹے سے طلاق مانگنے جا رہی ہوں۔ مرسی اس وقت میرا سامان باندھ رہی ہے' میں تمہارے اس ظلمت کدہ کو ایک گھنٹے کے اندر اندر خیرباد کہہ دوں گی۔'' میں نے اس کے کھلے ہوئے منہ اور پھیلتی ہوئی آنکھوں کو نظرانداز کرتے ہوئے جلتی پر تیل چھڑکا ''میں اپنے والد سے کہوں گی کہ وہ اپنا اثرورسوخ استعمال کرتے ہوئے قانون شکن منیر کو جیل بھجوائے یا کوڑے لگوائے تاکہ دوسرے عبرت پکڑ سکیں۔'' نورہ کا منہ خوف سے کھلا چھوڑ کر میں وہاں سے پیر پٹختی ہوئی

چل دی۔ گویا بساط الٹ چکی تھی۔ نورہ کو ہرگز مجھ سے ایسے ردعمل کی توقع نہیں ہوگی۔ جب میں اور مرسی اپنے سامان سمیت گھر سے جانے لگیں تو نورہ شرمندہ ہو کر اصرار کرنے لگی کہ میں گھر چھوڑ کر نہ جاؤں۔ خاصی بحث کے بعد میں رضامند ہوگئی میں نے سوچا کہ اب مجھے اپنے مزاج میں کچھ دھیما پن لانا چاہیے۔ مگر یہ کیا؟ دو دن سے کریم نے مجھے مکمل نظرانداز کیا ہوا تھا۔ آخر مجھ سے رہا نہ گیا' میں نے پیر پٹختے ہوئے کہا: ''اس سے تو اچھا ہے کہ تم مجھے طلاق دے دو۔'' اگلی صبح نورہ نے صلح کی پیش کش کی اور ہم نے اختلاف بھلا ڈالے۔ اس نے ڈرائیور کو حکم کہ وہ بازار سے میرے لیے ہیروں کا ہار خرید لائے' میں تیزی سے اٹھی اور کہا کہ میں خود جا کر خریدوں گی۔ میں نے صرافہ بازار سے تین لاکھ سعودی ریال (اسی ہزار ڈالر) کا قیمتی ہار خرید لیا۔

میرے والد اور دیگر شاہی افراد کی مشترکہ کوششوں کے سبب منیر کے خلاف شاہ فیصل کے غصے میں کافی کمی ہوئی۔ نورہ کا خیال تھا کہ میں نے اپنے والد سے منیر کو سزا سے بچانے کے لیے سفارش کی ہے۔ اب اسے ایسی بہو پر ناز تھا۔ لیکن یہ حقیقت کبھی اس پر نہ کھلی کہ میں نے تو منیر کے متعلق ایک لفظ بھی والد سے نہیں کہا تھا۔ کریم کی رنجش بڑھتی ہی گئی۔ ہمارے جھگڑے کے اگلے ہی دن وہ علیحدہ بیڈروم میں منتقل ہو گیا تھا' اگرچہ طلاق کے فیصلے کے متعلق کریم کے والد اور ماں کچھ نہ کہہ سکے۔

ہماری اس لڑائی کے تقریباً ایک ہفتے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میں حاملہ ہو چکی ہوں۔ میں گھبرا سی گئی۔ دل و دماغ میں کشمکش جاری ہوگئی کہ اب کیا قدم اٹھایا جائے' بالآخر میں اس فیصلے پر پہنچی کہ میرے پاس حمل ضائع کرنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ کریم کو اس بات کا پتا چل گیا تو وہ کبھی بھی مجھے طلاق نہیں دے گا' لیکن مجھے ایسے شوہر کی ایسی بیوی بن کر جینا قبول نہ تھا جسے وہ رعب اور دھمکی سے دبا کر رکھنا چاہتا ہو۔ میں سخت الجھن کا شکار تھی کیونکہ یہاں حمل کو ضائع کرانا کوئی معمولی بات نہ تھی اور مجھے قطعی علم نہ تھا کہ اس بارے میں کیا کرنا ہے؟ کہاں جانا ہے؟ معاملہ بہت نازک اور حساس تھا۔ میں نے اپنی ایک کزن کو رازدار بنایا جس نے مجھ پر

انکشاف کیا کہ ایک سال پہلے اس کی بہن حاملہ ہو گئی تھی' اس ڈر سے کہ کہیں ابو کو اس بات کا علم نہ ہو جائے اس نے خودکشی کی کوشش بھی کی۔ اس کٹھن مرحلے پر ماں نے اس کا ساتھ دیا اور اسے ایک انڈین ڈاکٹر کے پاس لے گئی جو بھاری فیس لے کر ایسے کیس کیا کرتا تھا۔ میں نے مرسی کو اس راز سے آگاہ کیا کہ میں کیا کرنے جا رہی ہوں۔ میں نے اسی ڈاکٹر کے پاس خفیہ طور پر جانے کا منصوبہ بنایا۔ میں ابھی ڈاکٹر کے کلینک کے کمرے میں اپنی باری کی منتظر تھی کہ کریم غصے سے بھرا ہوا کمرے میں آن دھمکا۔ میں اگرچہ نقاب اور عبا اوڑھے ہوئے تھی تاہم کریم نے میری غیر معمولی عبا اور سرخ اطالوی جوتوں سے مجھے پہچان لیا۔ اس نے سختی سے میری کلائی پکڑی اور مجھے دروازے کے طرف دھکیلتا ہوا لے گیا۔ وہ غصے میں چیخ رہا تھا' اس نے کلینک بند کرانے اور ڈاکٹر کو سلاخوں کے پیچھے بھیجنے کی دھمکی دی۔

میں نقاب کے پیچھے مسکرا رہی تھی کیونکہ کریم کے اس عمل سے مجھ پر یہ راز کھل چکا تھا کہ وہ درحقیقت مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میرے خدشات' کہ کریم مجھ سے چھن جائے گا' اس وقت دور ہو گئے' جب اس نے کہا: ''میں نے تو طلاق کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں' میں تو محض طیش' غصے اور نفسیاتی دباؤ کی حالت میں یہ سب کچھ کر بیٹھا تھا۔''

دراصل مرسی نے میرا منصوبہ ایک ملازمہ کو لفظ بہ لفظ بتا دیا تھا تاکہ بات کریم تک پہنچ جائے۔ اس ملازمہ نے جب نورہ (میری ساس) کو بتایا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ بوکھلا کر دوڑی گئی اور چیختے ہوئے کریم کو بتایا کہ ''وہ تمہارے بچے کو مار ڈالے گی جلد کچھ کرو۔'' کریم نے مجھے اپنی باہوں میں سمیٹا اور بیڈروم کی طرف دھکیلتا ہوا اندر لے گیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر اس کے رس بھرے ہونٹوں نے مہلت نہ دی۔

عورت کے لیے زندگی کا حسین و جمیل انمول تحفہ بچے کی پیدائش ہے۔ بچے کا پیٹ میں ہونا اور پھر جنم کسی معجزے سے زیادہ اکمل اور خوبصورت ترین ہے۔

اپنے پہلے بچے کی پیدائش کے لیے ہم نے ہر چیز کی نہایت احتیاط سے پلاننگ کر رکھی تھی۔ پیدائش سے چار ماہ پہلے ہی ہم نے یورپ جانے کے لیے ریزرویشن کرالی۔ میں لندن کے ہسپتال میں بچے کو جنم دینا چاہتی تھی۔

ہم نے اپنی پلاننگ میں کسی چھوٹی سے چھوٹی بات کو نظرانداز نہ کیا تھا۔ اتنی احتیاط کے باوجود روانگی میں دیر ہو گئی۔ کریم کی ماں نے معمول سے ہٹ کر قدرے موٹے کپڑے کا نقاب پہن رکھا تھا' جس میں سے وہ صحیح طور پر دیکھ نہ پاتی تھی۔ اس حماقت کے باعث اس کے پاؤں میں موچ آ گئی۔ دوسری طرف میری بہن نورہ قولنج کے درد کا شکار ہو گئی۔ جب میں ان بحرانوں سے گزر چکی تو ولادت میں صرف چند دن رہ گئے تھے۔ اس حالت میں میرے ڈاکٹر نے سفر کرنے سے منع کر دیا۔ کریم اور میں نے اپنے حق میں یہی بہتر جانا کہ یہیں رک جائیں۔ ہم ریاض ہی میں ڈلیوری کے انتظامات میں لگ گئے۔ کریم اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ وہ بچے کے لیے نہایت احتیاط سے ہر وہ چیز بنوا رہا تھا کہ جس کی شاید ہی ضرورت پڑتی ہو۔ مجھے اس کی ان معصوم حماقتوں پر بے اختیار پیار آ رہا تھا۔ میں تو اس وقت بہت خوش ہوئی جب کریم نے مجھے بتایا کہ چھ افراد پر مشتمل سٹاف لندن سے آ رہا ہے جو پیدائش کے وقت مدد کرے گا۔

میری بہن سارہ کچھ مدت کے لیے ہمارے ہاں قیام پذیر ہو گئی تھی۔ سارہ جو کبھی ہر وقت ہنسنے ہنسانے والی لڑکی تھی ایک دم بجھ سی گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی جا رہی تھی۔ اب وہ اکثر سنجیدہ ہی رہتی۔ ایک رات ہم دونوں باغ میں بیٹھے باتیں کر رہی تھیں کہ کریم کا بھائی اسد اور چند کزن رات کو دیر سے گھر لوٹے۔ میں نے زور سے آواز دی کہ یہاں باپردہ خواتین موجود ہیں۔ کریم کے کزن تو نظریں نیچے کیے آگے بڑھ گئے' مگر اسد اپنے بھائی کریم کے بارے میں پوچھنے میرے پاس چلا آیا۔ جب اس کی نظر سارہ پر پڑی جو بے پروائی سے دوسری طرف رخ کیے بیٹھی تھی' تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار دکھائی دینے لگے۔ میں اس کی یہ حالت دیکھ کر بوکھلا سی گئی۔ مجھے خدشہ ہوا کہ اسے دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔ اس کے

جسم کو عجیب طرح سے جھٹکا لگا تو میں نے تیزی سے اس کے بازو کو جھنجھوڑا۔ میں واقعی سخت پریشان ہوگئی تھی۔ کئی عجیب وغریب سوچیں میرے ذہن میں گڈمڈ ہونے لگیں۔ کیا وہ واقعی بیمار ہے؟ اس کا چہرہ دھلی ہوئی سفید چادر کے مانند ہوگیا۔ میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے میں مدد دی ملازموں کو مدد کے لیے پکارا' مگر کوئی نہ آیا کیونکہ کافی رات گزر چکی تھی۔ سارہ دوڑتی ہوئی اندر گئی اور پانی لے کر تیزی سے واپس آئی۔ اسد اپنی اس کیفیت سے پریشان تھا' اس نے اٹھنا چاہا۔ میں پریشان تھی کہ کہیں یہ چکر کھا کر گر نہ جائے۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ ابھی اپنے کمرے میں نہ جائے کیونکہ اس کی حالت درست نہیں۔ اس نے کہا کہ اب وہ بہتر محسوس کر رہا ہے تاہم اس نے اپنی اس کیفیت کی وضاحت نہ کی۔

اس کی طرف دیکھے بغیر سارہ نے پانی کا گلاس اس کے لبوں سے لگا دیا۔ اسد کے ہاتھ سارہ کی انگلیوں سے مس ہوئے تو دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا' سارہ کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر فرش پر جا گرا اور چور چور ہوگیا۔ وہ تقریباً دوڑتے ہوئے تیزی کے ساتھ محل میں چلی گئی۔

اس کے کزن اور دوست چاہتے تھے کہ میں باغ سے واپس محل میں چلی جاؤں تاکہ وہ اسد سے مل سکیں' لیکن میں نے پردے کی پروا نہ کی اور انہیں بلا لیا کہ وہ اسد کو سنبھالیں۔ وہ مجھے عبا اور نقاب کے بغیر دیکھ کر گنگ سے رہ گئے اور میں اپنے پھولے ہوئے پیٹ کے ساتھ تقریباً جھومتے ہوئے وہاں سے چل دی۔ کریم' آدھی رات کو گھر لوٹا تو راستے میں اسد سے اس کی ملاقات ہوئی۔ کریم نے آتے ہی مجھے جگا دیا۔ وہ سارہ اور اسد والے واقعے کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔ میں نے سارا قصہ کہہ سنایا اور اس کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ کریم نے مجھے بتایا کہ اسد' سارہ سے شادی کرنے پر بضد ہے اور یہ کہ اگر اس کی سارہ سے شادی نہ ہوئی تو وہ دنیا کی ہر خوشی سے منہ موڑ لے گا۔ یہ کیا؟ آخر قصہ کیا ہے؟ کھلنڈرا سا لڑکا اسد اور ایسی باتیں! ایسا آدمی جس نے چند ہفتے پہلے اپنی ماں کو یہ کہہ کر پریشان کر دیا تھا کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے

گا' اب اس قسم کی باتیں کر رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اسد کو پہلی ہی نظر میں سارہ سے محبت ہو گئی ہے۔

میں نے سارہ سے اسد کی خواہش کا اظہار کیا تو وہ سپاٹ لہجے میں کہنے لگی کہ ہدا (ہماری مصری ملازمہ) نے اسی شخص کو دیکھ کر پیشگوئی کے انداز میں کہا تھا کہ مجھے محبت ضرور ملے گی۔ اس نے تو یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ ''اس محبت کے نتیجے میں' میں چھ بچوں کی ماں بنوں گی۔'' ہدا کی پیشگوئیاں حیرت انگیز حد تک سچ ثابت ہوئی تھیں۔ سارہ نے آہ بھرتے ہوئے کہا کہ انہیں چاہیے کہ شادی کے سلسلے میں والد صاحب سے بات کریں۔

اگلے ہی روز صبح کے وقت میں نے اپنی ساس نورہ کے کمرے سے آوازیں سنیں تو میں دیوار سے لگ کر ان کی باتیں سننے لگی۔ نورہ اپنے بیٹے اسد سے کہہ رہی تھی: ''جو مرد عورت سے خوبصورتی کی بنا پر شادی کرتا ہے وہ ہمیشہ دھوکا کھاتا ہے۔'' نورہ کی آواز میں نفرت کا عنصر نمایاں تھا۔ ''اسد' دیکھو! سارہ طلاق یافتہ ہے۔ کون جانتا ہے طلاق کی اصل وجہ کیا تھی؟ اس لڑکی کے سوا جہاں تم چاہتے ہو تمہاری شادی وہیں کر دوں گی۔ تمہیں کسی نئی نویلی دوشیزہ سے شادی کرنی چاہیے۔ میرے پیارے بیٹے! تم اس آگ کی گولا سلطانہ کے مزاج سے تو آشنا ہو' کیا سارہ اپنی بہن سے مختلف ہو سکتی ہے؟'' نورہ نجانے اور کیا کچھ کہتی' مجھ میں یہ سب کچھ برداشت کرنے کا یارانہ تھا کیونکہ میں نے تو سب اختلافات بھلا دیئے تھے اور نورہ کو اپنی دوست سمجھنے لگی تھی مگر آج ان باتوں نے میرے کانوں اور آنکھوں پر بندھی پٹی کو کھول دیا۔ نورہ کے دل میں میرے لیے آج بھی نفرت تھی۔ مجھے تو منافقت آتی ہی نہ تھی اس لیے میں فوراً کمرے میں داخل ہو گئی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اگر میں ان کی نظروں میں بری ہوں تو میرا لیبل سارہ پر لگے۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی اسد اٹھ کھڑا ہوا اور گردن کو خم دے کر میرا گویا استقبال کیا۔ وہ ہم دونوں (نورہ اور مجھ) کو بات کرنے کا موقعہ دینے کے لیے کمرے سے باہر

چلا گیا۔ نورہ کا رنگ اڑ گیا جب اسد نے کمرے سے نکلتے وقت مڑ کر کہا: ''فیصلہ ہو چکا ہے' اگر میں اسے (سارہ) یا اس کے گھر والوں کو قابل قبول ہوں تو مجھے اس راستے سے کوئی نہیں بھٹکا سکتا۔'' نوراں نے مجھ سے بات کرنا چاہی مگر میں نے جذبات اور غصے میں اس کی کوئی بات نہ سنی۔ اتنے میں میرے بدن میں شدید درد کی لہرین اٹھیں' یہ درد زہ تھا۔ چند ہی لمحوں میں مجھے ایک عمدہ آرام دہ لیموزین میں ہسپتال پہنچا دیا گیا جہاں میں نے بیٹے کو جنم دیا' حالانکہ میں بیٹی کی خواہش مند تھی مگر کریم کی خواہش پوری ہوئی۔ وہ تو خوشی سے گویا پاگل ہوا جا رہا تھا اور عجیب بے تکی باتیں کر رہا تھا۔ شاید اتنی بڑی خوشی اس سے سنبھالی نہیں جا رہی تھی۔

اولاد نرینہ کی خاطر یہ مرد حضرات شادی کرتے ہیں۔ اگر عورت لڑکے کو جنم نہ دے بلکہ لڑکی پیدا ہو جائے تو پیار و محبت' ساتھ جینے کے وعدے کرنے والے یہ مرد حضرات اس موقعہ پر سارے وعدے وعید بھول جاتے ہیں اور غصے سے پھنکارتے ہیں اور اپنی عورت کو کوستے ہیں۔ لڑکی ہو یا لڑکا یہ تو قدرت کے کھیل ہیں اس میں بھلا عورت کا کیا قصور ہے؟ جب عورت اولاد نرینہ کو جنم دیتی ہے تو مرد حضرات پہلے سے زیادہ عورت پر توجہ دیتے ہیں۔

بچے کی پیدائش کے وقت میں دیگر مریضوں سے الگ ایک پرسکون اور آرام دہ کمرے میں تھی۔ میرا بیٹا میرے ساتھ پہلو میں سکون سے سو رہا تھا۔ جبکہ عام ننھے منے بچے نرسری میں تھے۔ چونکہ میرا تعلق شاہی خاندان سے تھا اسی لئے میرا بچہ میرے ساتھ رکھا گیا تھا۔ وگرنہ دیگر مریضوں کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا۔ میں عام عورتوں اور بچوں کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتی تھی کیونکہ ہم شاہی خاندان کے افراد دیگر عام لوگوں سے کٹ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی تجسس کے باعث میں اپنے بچے کو سوتا چھوڑ کر کمرے سے باہر آئی۔ میں ایسی لڑکیوں سے ملی جو فقط تیرہ برس کی عمر میں ماں بن چکی تھی جبکہ میں اٹھارہ برس کی عمر میں ماں بنی تھی۔ میری ہم عمر اکثر مائیں چار پانچ بچوں کو پیدا کر چکی تھیں۔

میں ایک ایسی لڑکی سے ملی جو کہ ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتی تھی۔ اس کے قبیلے کی عورتیں عام طور پر اپنے گھروں ہی میں بچے پیدا کرتی ہیں، لیکن یہ لڑکی پانچ دن اور پانچ راتیں مسلسل دردزہ میں مبتلا رہی تھی آخرکار اس کا شوہر اسے اس ہسپتال میں لے آیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ جب میں بارہ برس کی تھی تو میری شادی ایک ترپن سالہ بوڑھے سے ہوئی تھی۔ وہ اس بوڑھے کی تیسری بیوی تھی۔ ہمارے نبی کریم محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو اپنی تمام بیویوں سے ایک جیسا سلوک کرنے کا حکم دیا ہے لیکن یہاں تو معاملہ ہی اس فرمان کے بالکل الٹ تھا۔ یہ بڈھا اپنی تیسری نوعمر بیوی کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا تھا اور دیگر دو بیویاں قصۂ پارینہ بن کر رہ گئی تھیں۔

اس نوجوان لڑکی نے مجھے بتایا کہ اس کے شوہر کے اندر بہت زیادہ جنسی قوت ہے۔ دن میں کئی بار اس کے ساتھ اپنی اس قوت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس نے اپنی بات میں زیادہ وزن پیدا کرنے کے لیے بازو کو پمپ کی طرح اوپر نیچے کرتے ہوئے کہا کہ اس کے شوہر میں بے پناہ قوت ہے۔ اب وہ بے چاری اس بات سے خوفزدہ تھی کہ اس مرتبہ اس نے لڑکی کو جنم دیا ہے جبکہ اس کی دونوں سوکنوں نے پہلی مرتبہ لڑکوں کو جنم دیا تھا، لہٰذا اسے خدشہ ہے کہ اس کا شوہر اسے کوسنے دے گا اور خوب برا بھلا کہے گا۔

اس نے اپنا بچپن یاد کیا، جو اب گزرا ہوا ایک خواب معلوم ہوتا تھا۔ اس کی فیملی نہایت ہی غریب تھی اور اُسے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ گلہ بانی اور دیگر کاموں میں بڑی مشقت کرنا پڑتی تھی۔ مجھے مرد وزن کے احساسات اور ان کی زندگی کے بارے میں آگاہی تھی لیکن وہ ناخواندہ ہونے کی بنا پر مناسب جواب نہ دے سکی اور میں واپس اپنے کمرے میں آ گئی۔

پھر مجھے ہسپتال کی ایک نرس ملی۔ اس نے بتایا کہ دو دن پہلے یہاں زچگی کے لیے ایک ایسی لڑکی لائی گئی تھی جس کے ہاتھوں پیروں میں زنجیریں پڑی تھیں۔ اسے مسلح محافظوں کے گھیرے میں میٹرنٹی وارڈ میں داخل کرا دیا گیا۔ محافظوں کے ہمراہ غصے سے بھرے ہوئے مطاوئی (مذہبی رہنما) بھی تھے۔ لڑکی پر شرعی عدالت میں مقدمہ چلایا

گیا تھا اور اس پر حدود کی فرد جرم عائد کی گئی تھی۔ زنا کی سزا یوں تو کوڑے ہیں لیکن لڑکی کے والد نے موت کی سزا دینے پر اصرار کیا تھا۔ بچے کی پیدائش تک لڑکی کی حفاظت اور نگرانی کے لیے محافظ تعینات کر دیئے گئے تھے۔ زچگی کے بعد اسے سنگسار کر دیا جانا تھا' اور ان لڑکوں کو جو اس لڑکی کی بربادی کے ذمہ دار تھے' وارننگ دے کر اور نصیحتیں کر کے چھوڑ دیا جانا تھا۔ کسی قسم کی سزا شاید انہیں نہ مل پاتی۔

ادھر جب اسد نے ہمارے والد سے سارہ کے بارے میں بات کی تو اسے مایوس نہ ہونا پڑا۔ ہمارے والد نے اسے بحیثیت داماد قبول کرلیا۔ اب اسد اور سارہ کا رومانس چل پڑا تھا۔ سارہ جب ہم سے ملنے آئی تو میں نے کافی عرصہ بعد اس کے چہرے پر خوشی کے آثار دیکھ کر روحانی مسرت محسوس کی۔ تین ماہ کے مختصر عرصے میں ان کی شادی ہونے والی تھی۔ خوشی اور انبساط کی یہ خبر سن کر میرے تن من میں مسرت کی ایک برقی لہر دوڑ گئی۔

پھر سارہ نے مجھے ایسی خبر سنائی کہ جسے سن کر خوف کے مارے میرے پیٹ میں مروڑ سا اٹھنے لگا۔ آنے والے ''چھٹی کے دن'' اسد اور سارہ نے بحرین میں خفیہ طور پر ملنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ میں نے اس کی اس بات پر احتجاج کرنا چاہا تو اس نے مجھ سے کہا کہ وہ اکیلی اور میری مدد کے بغیر ہی جائے گی۔ منصوبے کے مطابق اس نے والد سے کہا تھا کہ وہ زچگی میں میری مدد کے لیے میرے گھر قیام کرے گی اور دوسری جانب نورہ کو یہ کہا کہ وہ والد کے ہاں واپس جا رہی ہے۔ اس طرح کوئی بھی ان کی غیر حاضری سے آگاہ نہیں ہو سکے گا۔

میں اس بات سے بھی آگاہ تھی کہ ہمارے والد گھر کے تمام افراد کے پاسپورٹ دفتر کے سیف میں رکھتے ہیں اور کوئی بھی عورت والد' سرپرست یا شوہر کی اجازت کے بغیر سفر نہیں کر سکتی۔ میں نے سارہ سے پوچھا کہ وہ اجازت نامہ کے بغیر کس طرح پرواز کر سکے گی۔ سارہ نے جواب دیا کہ اس نے پاسپورٹ اور اجازت نامہ ایک دوست سے عاریتاً لے لیا ہے۔ میری دوست اپنے رشتہ داروں سے ملنے بحرین

جانے والی تھی مگر بیمار ہو جانے کی وجہ سے اسے یہ سفر ملتوی کرنا پڑا۔

ایسے موقعوں پر کئی خواتین ایک دوسری کے پاسپورٹ پر سفر کرتی رہتی ہیں کیونکہ ائیر پورٹ پر سیکورٹی سٹاف کبھی بھی کسی عورت کو چہرہ دکھانے کے لیے کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ یہ خفیہ مشن اتنا کامیاب رہا کہ ہمارے خاندان کے کسی مرد کو کبھی اس کی بھنک تک نہیں پڑ سکی۔

میں عجیب وسوسوں میں گھری ہوئی تھی۔ میں سارہ کے اس غیر محتاط مشن پر اس کی حوصلہ شکنی کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے ہسپتال میں اس کمسن لڑکی کی کہانی سنانا چاہی جو سنگسار ہونے کی منتظر تھی مگر پھر بھی سارہ اپنے فیصلے پر ڈٹی رہی۔ خدشات کی آگ کا منجمد گولہ میرے معدے میں مجھے ہلکان کیے دے رہا تھا۔ حدود کیس والی لڑکی نے ایک بچی کو جنم دیا۔ لڑکی کے خاندان والوں نے اسے قبول نہ کیا۔ لڑکی نے اپنی المناک داستان اپنے معالج کو سنائی، جس کے مطابق اس کا نام امل تھا اور اس کا والد ریاض میں دکاندار تھا۔ اس کی عمر تیرہ سال تھی جب یہ منحوس سانحہ پیش آیا اور اس کی دنیا میں اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ جس طرح مغرب میں ہفتہ کی رات ویک اینڈ ہوتا ہے، ہمارے ہاں جمعرات کی رات ہوتی ہے، چنانچہ امل کے والدین ویک اینڈ پر امارات کو جا چکے تھے۔ ان کی واپسی اب ہفتے کے دن ہونا تھی۔ تین فلپائنی گھریلو ملازم سو رہے تھے اور ڈرائیور دور مہمان خانے میں تھا۔ امل کے دوسرے شادی شدہ بہن بھائی شہر کے دوسرے علاقے میں رہ رہے تھے۔ گھر پر صرف امل اور اس کا سترہ سالہ بڑا بھائی باقی رہ گئے تھے۔ چونکہ والدین گھر پر نہ تھے اس لیے امل کے بھائی نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور اپنے ہم عمر دوستوں کے ہمراہ گھر پر ہی رنگ رلیاں منانے کا پروگرام بنایا۔ گیمز روم امل کے کمرے کے نیچے واقع تھا۔ امل نے رات کو تیز موسیقی اور آوازیں سنیں۔ وہ حشیش بھی پی رہے تھے۔ جب امل نے اپنے بیڈروم کی دیواریں موسیقی سے تھرتھراتی محسوس کیں تو یہ سوچ کر نیچے آئی کہ وہ انہیں یہ بے ہنگم شور بند کرنے کا کہے۔ اس وقت وہ شب خوابی کے باریک گاؤن میں ملبوس تھی۔ اس نے نیچے جا کر کمرے کا دروازہ کھولا

اور منہ اندر کر کے زور سے دھاڑی کہ یہ سب کچھ ختم کیا جائے۔ اس کے بھائی نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اپنے بھائی کی تلاش میں کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ اندر کم روشنی تھی گویا کمرہ نیم تاریک تھا۔ امل کو اپنا بھائی تو نہ ملا مگر کمرے میں موجود دوسرے لڑکوں نے 'جو نشے میں نیم مدہوش تھے' امل کو یک دم گرفت میں لے لیا۔ وہ چیخنے لگی۔ وہ شاید انہیں بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس گھر کی بیٹی ہے مگر اس کی کسی نے نہ سنی اور اسے ننگا کر دیا گیا۔ موسیقی کی تال نے لڑکوں کے شیطانی فعل کو مزید تحریک دی۔ جب تیسرا لڑکا اس کو بے آبرو کر چکا تو بالآخر امل اپنے ہوش ہو حواس کھو بیٹھی۔ امل کا بھائی باتھ روم میں تھا۔ وہ نشے میں اتنا دھت ہو چکا تھا کہ دیواروں کا سہارا لے کر لڑکھڑاتے ہوئے باہر نکلا اور تمام رات گھوڑے بیچ کر سوتا رہا۔ صبح کا اجالا ہوا تو امل کو اپنے درمیان خون میں لت پت بے ہوش دیکھ کر لڑکوں کو اپنے جرم کا احساس ہوا اور سب محل سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

فلپائنی ملازمین اور ڈرائیور نے مل کر امل کو ہسپتال پہنچایا۔ ایمرجنسی میں موجود ڈاکٹر نے پولیس کو اطلاع کر دی۔ مطاوئ کو بھی پتا چل گیا۔ امل کسی کا نام نہیں جانتی تھی تاہم اس نے بتایا کہ وہ اس کے بھائی کے دوست تھے۔ جب انہیں پکڑا گیا تو اس وقت تک وہ ایک فرضی کہانی گھڑ چکے تھے۔ تب تک گھر سے تمام نشہ آور اشیاء غائب کر دی گئی تھیں۔ ان لڑکوں نے اپنے بیان میں کہا کہ ''ہم بلند آواز میں موسیقی سن رہے تھے کہ یہ لڑکی باریک لباس میں اندر آئی اور ہمیں جنسی فعل پر اکسایا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ اوپر کمرے میں جنسی موضوعات پر کتاب پڑھ رہی تھی۔'' انہوں نے حلفاً کہا کہ پہلی پیش کش پر انہوں نے اسے ٹھکرا دیا لیکن وہ ان کی گود میں بیٹھ کر چومنے چاٹنے لگی اور مخصوص عضو میں انگلی لگا کر ان کی جنسی آگ کو بھڑکایا تو ان سے رہا نہ گیا۔ لڑکوں نے اپنے من گھڑت بیان میں مزید اضافہ کرتے ہوئے کہا کہ اس نے ہم سے بار بار استدعا کی تو ہم راغب ہو گئے۔

امل کے والدین امارت سے واپس آ گئے۔ ماں نے تو بیٹی کی المناک داستان

پر یقین کر لیا مگر وہ کسی طور اپنے خاوند کو قائل نہ کر سکی۔ ماں نے سینکڑوں بار یقین دہانی کرائی کہ ان کی بیٹی معصوم ہے لیکن اس پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اس کا والد جو بیٹیوں سے ہمیشہ دور ہی رہتا تھا اس نے کہا کہ ان حالات میں کوئی بھی مرد ہوتا تو یہی کرتا جو ان کی بیٹی کے ساتھ ہوا۔ اس کے والد نے فیصلہ صادر کیا کہ ان کے نام کو بٹہ لگانے والی بیٹی کو اس کے جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ مطاوئی نے بھی اس کے جرأت مندانہ فیصلے کو خوب سراہا اور اس کے مذہبی عقیدے کی تعریف کی۔

میرا جی گھٹ کر رہ گیا جب مجھے معلوم کہ آج امل اس دنیا میں نہیں رہے گی۔ ظلم و زیادتی کی اس دھرتی کے سفاک مردوں کی بھینٹ چڑھ کر مر جانے والی امل جیسی جانے کتنی لڑکیاں بے بسی کے عفریت کے پنجوں میں جکڑی ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

تیسرا باب

1975ء کا سال میرے لیے خوش کن ہونے کے ساتھ ساتھ تلخ یادیں بھی رکھتا ہے۔ ہم نے اپنے پیارے بیٹے عبداللہ کی دوسری سالگرہ نہایت ہی دھوم دھام سے منائی۔ اس سالگرہ میں فرانس سے ہوائی جہاز میں ایک سرکس منگوائی گئی جو میرے سسر کے محل میں ایک ہفتے تک ہماری خوشیاں دوبالا کرتی رہی۔

سارہ اور اسد کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ اپنے پہلے بچے کی آمد کے شدت سے منتظر تھے۔ پیدا ہونے والے بچے کی خوشی میں اسد نے خصوصی طور پر پیرس جا کر خریداری کر ڈالی۔ بہت زیادہ دکھ جھیلنے والی سارہ کو مدتوں بعد خوشیاں نصیب ہو رہی تھیں لیکن اسد کی ماں جو ہمیشہ غیر یقینی کیفیت میں رہتی تھی' اب بھی جلتی کڑھتی رہتی تھی۔

علی امریکہ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔اس نے اپنی بہنوں کے مسائل میں کبھی دلچسپی نہ لی تھی۔ اس نے ابو کو سخت ذہنی اذیت پہنچائی جب اس نے کھلے الفاظ میں اعلان کیا کہ وہ ایک امریکی ملازمت پیشہ عورت سے محبت کرتا ہے لیکن پھر علی اس امریکی عورت سے جلد ہی بے زار ہو گیا اور پیغام بھیجا کہ وہ سعودی بیوی کو ترجیح دے گا۔ ہمیں بعد میں معلوم ہوا کہ اس امریکن عورت نے جھگڑے میں علی کے سر پر کینڈل سٹک سے زوردار ضرب لگائی تھی۔ دراصل وہ علی کے مطالبے ماننے پر رضامند نہ تھی اور علی نے اس سے جھگڑا کھڑا کر دیا تھا۔

شاہ فیصل اور ان کی باہمت بیوی عفت کی کوششوں سے سعودی عورتوں پر تعلیم حاصل کرنے کی پابندی نہ رہی تھی۔ اب عورتوں کو کچھ آزادی میسر آ رہی تھی۔ چند

عورتوں نے تو نقاب پہننا بھی چھوڑ دیا تھا' مگر ابھی تک وہ عبا ضرور پہنتی تھیں۔ ان چند بہادر خواتین نے دیگر خواتین کو روشنی کی نئی کرن سے آشنا کرایا۔ درمیانے طبقے کی عورتوں نے یہ ایک کارنامہ کر دکھایا تھا ورنہ ہم شاہی خواتین کو شاید کبھی بھی اس عمل کی اجازت نہیں ملنی تھی۔ اب ملک بھر میں عورتوں کے اسکول کھلنا شروع ہو گئے تھے۔ بدقسمتی سے خواتین کی موت کی سزا ابھی تک ان پڑھ جاہل بنیاد پرستوں کے ہاں رائج تھی۔

مارچ کے اختتام پر ایک روز اسد دوڑا ہوا آیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے جب ہکلاتے ہوئے بتایا کہ شاہ فیصل کو شہید کر دیا گیا ہے تو ہم سب پر سکتہ طاری ہو گیا اور زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔ شاہ فیصل کی شہادت کے پس پردہ ٹیلی ویژن اسٹیشن کے قیام کا تنازعہ تھا۔ یہ تنازعہ دس سال پرانا تھا جس کا سامنا فیصل شہید کے والد اور پہلے بادشاہ عبدالعزیز کو بھی کرنا پڑا تھا۔ کچھ ملاؤں نے اس وقت بھی ہنگامہ کھڑا کیا تھا جب پہلے ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں لایا جانے والا تھا۔ شاہ عبدالعزیز نے ان کے اعتراض کو یہ کہہ کر رد کر ڈالا تھا کہ ریڈیو پر تلاوت قرآن سے سب لوگ فیض یاب ہو سکیں گے۔

اس تنازعے کا المناک پہلو یہ تھا کہ ان ہنگاموں میں شاہی خاندان کے افراد نے بھی آواز احتجاج بلند کرنا شروع کر دی تھیں۔ ستمبر 1975ء میں جب میں ابھی بچی تھی' تو ایک ایسے احتجاجی مظاہرے میں ہمارے ایک کزن کو پولیس نے گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ تقریباً دس سال گزرنے کے بعد نفرت کی یہ چنگاری پھر جاگ اٹھی تھی اور ہمارے اس کزن کے چھوٹے بھائی نے اپنے چچا کو گولی مار کر انتقام کی آگ بجھا لی۔ سعودی عرب کو جہالت سے نکالنے اور علم کی روشنی سے منور کرنے کا خواہاں آج منوں مٹی تلے سو رہا ہے۔ ان کی موت سے خواتین کی آزادی کا ایک سنہری موقعہ بھی ان کے ساتھ ہی دفن ہو کر رہ گیا۔

ہم سب اس خاندان کے خلاف غم و غصہ اور نفرت کے جذبات رکھتے تھے

جس نے ہم سب کی امیدوں، خوشیوں اور سہانے خوابوں کے قاتل فیصل ابن مسعود کو پال پوس کر جوان کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے ایک کزن نے چلا کر کہا تھا کہ قاتل کے باپ کا ذہن بھی پراگندہ تھا۔ ایک بھائی بے ضرر ٹیلی ویژن کے قائم ہونے پر موت کو ترجیح دیتا تھا اور دوسرے بھائی نے ہم سب کے ہر دل عزیز بادشاہ کو شہید کر ڈالا۔

☆☆☆

نورہ بہن نے قرآن مجید لا کر ایک آیت کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی۔ میں نے یکے بعد دیگرے تمام بہنوں کی طرف ایک نظر دیکھا۔ میری آنکھیں بالآخر اپنی چھوٹی بہن طاہانی کے غم زدہ چہرے پر آ کر ٹک گئیں کیونکہ اس کی دوست کے لیے اب شاید مایوسی کے سوا کچھ باقی نہ رہا تھا۔

سمیرا کسی بدکاری کی مرتکب نہیں ہوئی تھی۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ ایک مغربی (انگریز) مرد کو پسند کرتی تھی۔ ہمارے مردوں نے از خود ہی یہ طے کر رکھا ہے کہ غیر ملکی اور غیر مذہب عورت سے صرف وہی تعلقات قائم کرنے کا حق رکھتے ہیں لیکن اس کے برعکس یہ فعل عورت کے لیے حرام ہے۔

ہم سب سمیرا سے بہت محبت کرتے تھے اور اسے ظلم کی چکی کے دو پاٹوں میں پستا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ ہم سب سر جوڑ کر اس کی نجات کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ سمیرا کو اس کے خاندان والوں نے ایک تنگ و تاریک کمرے میں قید کر دیا تھا۔ اسے دروازے کے نیچے درز میں سے کھانا پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس کے ساتھ کسی کو بات تک کرنے کی اجازت نہ تھی۔ سمیرا کو تادم مرگ اسی قید تنہائی میں رہنا تھا۔

آخر اس کا جرم کیا تھا؟ لندن میں تعلیم پا رہی تھی جہاں اسے ایک غیر مسلم سے محبت ہو گئی۔ سمیرا ابھی بچی ہی تھی کہ اس کی ماں کو بیضہ دانی کا کینسر ہو گیا گرچہ علاج سے وہ صحت یاب ہو گئی مگر اسے بانجھ قرار دے دیا گیا۔ حیران کن طور پر سمیرا کے والد نے دوسری شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں ایسی خواتین کو یا تو طلاق دے دی جاتی ہے یا پھر ان کے خاوند انہیں ترس کھا کر کسی کونے کھدرے میں ڈال دیتے ہیں مگر سمیرا کی والدہ خوش قسمت

نکلیں کہ ان کا شوہر اس سے بے حد محبت کرتا تھا۔ سمیرا اپنے والدین کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بچپن ہی میں سمیرا نے انجینئر بننے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ سعودیہ میں کسی عورت کے پاس انجینئرنگ کی ڈگری نہ تھی۔ سمیرا کے والد اور والدہ اپنی بچی کے ہمراہ لندن چلے گئے تا کہ وہ انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر سکے۔ دو انڈین خادمائیں اور ایک مصری سیکرٹری کو سمیرا کے ساتھ رہنے کے لیے ملازم رکھ لیا گیا۔ اس طرح اپنی بچی کی طرف سے مطمئن ہو کر سمیرا کے والدین ریاض آ گئے۔ کسی کو یہ گمان تک نہ تھا کہ وہ دوبارہ ایک دوسرے کو کبھی نہیں مل سکیں گے۔

لندن میں اپنے قیام کے چوتھے ماہ سمیرا کی ملاقات کیلفورنیا سے آئے ہوئے لیری سے ہوئی۔ سمیرا نے میری بہن طاہانی کو خط لکھا کہ لیری چونکہ کیتھولک عیسائی ہے اس لیے وہ کبھی بھی مذہب اسلام قبول نہیں کرے گا جبکہ وہ اسے کھونا نہیں چاہتی۔ ایک دوسرے خط میں سمیرا نے چونکا دینے والی اطلاع دی کہ وہ لیری کے ساتھ لندن میں رہے گی اور بعد میں وہ چپکے سے لیری کے ساتھ امریکہ جا بسے گی، جہاں وہ شادی رچا لیں گے۔ لیکن ایسی صورت میں اس کی سعودی قومیت ضبط ہو جائے گی جبکہ اس کے بعد ہم سمیرا سے کبھی بھی اپنی سرزمین پر نہیں مل سکیں گے۔

بدقسمتی سے سمیرا کے والدین کو اس کے ان حالات کا علم نہ ہو سکا۔ انہی دنوں ریاض کی ایک معروف سڑک پر ان کی کار واٹر ٹینکر سے ٹکرا گئی اور دونوں میاں بیوی اپنے ڈرائیور سمیت موقع پر ہلاک ہو گئے۔ سمیرا اور ہم سب کے لیے یہ ایک المناک سانحہ تھا۔ عرب دنیا میں خاندان کا سربراہ فوت ہو جائے تو (یہ سربراہ ہمیشہ مرد ہی ہوتا ہے) سب سے بڑا بھائی اس کنبے کا از خود سربراہ بن جاتا ہے اور سارے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، چنانچہ والد کی وفات کے بعد سمیرا کا بڑا چچا اس کا سرپرست ٹھہرا۔

سمیرا کا باپ بہت شفقت اور محبت کرنے والا شخص تھا۔ مگر اس کا چچا اس کے والد کے بالکل برعکس نکلا۔ وہ اپنے بھائی کی زندگی ہی میں سمیرا کی آزادی پر اپنی ناراضگی کا اظہار کر چکا تھا۔ جب سے سمیرا لندن آئی تھی اس دن سے اس نے سمیرا کے

والد سے بات چیت بند کر رکھی تھی۔ وہ لڑکیوں کی تعلیم کا مخالف تھا۔ اس کا نقطہ نظر تھا کہ لڑکیوں کو چھوٹی عمر ہی میں پختہ مردوں سے بیاہ دینا چاہیے۔ اس نے خود حال ہی میں ایک تیرہ سالہ بچی سے شادی رچائی تھی۔ اس بچی کو چند ماہ پہلے ہی مخصوص ایام آنا شروع ہوئے تھے اور وہ اس جیسے ہی ایک باپ کی بیٹی تھی۔ اس نے اپنی چاروں کمسن بیٹیوں کو پہلی ہی ماہواری پر بیاہ دیا تھا۔

والدین کی وفات کے بعد سمیرا کو اپنے سرپرست چچا کی طرف سے ایک حکم نامہ موصول ہوا کہ ''پہلی پرواز سے ریاض آ جاؤ' اپنا تمام سامان بھی ساتھ لیتی آنا۔''

سمیرا کے لیے یہ حکم بڑا اعصاب شکن تھا۔ اس نے دل کڑا کر کے اندھے کنویں میں چھلانگ لگانے کا فیصلہ کیا' اور لیری کے ساتھ کیلی فورنیا کا رخ کیا۔

سمیرا کی جانب سے کوئی جواب نہ پا کر اس کے چچا نے لندن میں اس کا کھوج لگانا شروع کر دیا۔ اپنے بیٹے کے اصرار پر اس نے ایک جاسوسی کرنے والی ایجنسی کی خدمات بھی حاصل کیں۔ حقیقت کا علم ہونے پر وہ آگ بگولہ ہو گیا اور اپنا سر دیواروں سے ٹکرانے لگا۔ پھر اس نے غضبناک ہو کر کہا: ''اے اللہ! مجھے اپنی بھتیجی کو قتل کرنے میں مدد دے۔'' اس نے سمیرا کے پیدا ہونے پر لعنت بھیجی اور اس کے عاشق لیری سے انتقام کے متعلق چلا چلا کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔

اکثر اوقات اندازے کی غلطیاں انسان کو مصائب سے دوچار کرتی ہیں۔ سمیرا کی عمر ہی کیا تھی۔ انسانوں کی پہچان میں وہ بھی دوسری بہت سے لڑکیوں کی طرح مار کھا گئی۔ لیری بے وفا نکلا۔ اس نے کیلفورنیا پہنچ کر طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں۔

لیری کا رویہ سمیرا کے لیے ایک اور بڑے سانحے سے کم نہ تھا۔ اس کا مستقبل سیاہ ہو چکا تھا۔ اس کی زندگی میں اب روشنی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے پاس رقم بھی تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ لیری سے شادی کے بغیر اسے امریکہ میں رہنے کی اجازت نہیں تھی۔ ان مایوس کن حالات میں سمیرا نے اپنی پیاری دوست طاہانی کو مالی مدد کے لیے خط لکھا مگر طاہانی کے خاوند حبیب نے رقم بھجوانے سے انکار کر دیا۔ یہ دروازہ بند ملا تو

سمیرا نے اپنی خالہ کو لکھا۔ خالہ اپنے بھائی (سمیرا کے چچا) کے غصے سے اچھی طرح واقف تھی، اس لیے اس نے بڑی فرض شناسی سے اس کے بارے میں اپنے بھائی کو خبر کر دی۔ سمیرا مشکلات میں گھری ہوئی تھی۔ چچا نے اسے پکڑنے اور زیردام لانے کے لیے نہایت چالاکی سے ایک منصوبہ بنایا۔

سمیرا کو دھوکہ سے قاہرہ لایا گیا۔ اس سے وعدہ کیا گیا کہ وہاں سے اس کو بچھڑے ہوئے خاندان سے ملانے کے لیے ریاض لے جایا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے اسے رقم بھی فراہم کر دی گئی۔ قاہرہ ائیر پورٹ پر سمیرا کی ملاقات دو پھوپھیوں اور ایک کزن سے ہوئی، جو اسے مستقبل کے سبز باغ دکھا کر واپس ریاض لے آئے۔

گھر پہنچتے ہی سمیرا کے چچا نے اسے بالائی منزل پر قید تنہائی میں ڈال دیا۔ اب وہ زندگی سے مایوس ہو کر اپنے چچا کے فیصلے کی شدت سے منتظر تھی۔ اس سے کہا گیا کہ مناسب رشتہ ملنے پر ایک ماہ کے عرصے میں اس کی شادی کر دی جائے گی۔ سمیرا شادی کے خیال ہی سے خائف تھی کیونکہ لیری کے ساتھ اس کے تعلقات تمام اخلاقی حدود کو پار کر چکے تھے اور وہ باعزت لڑکی نہ رہی تھی۔

ہم سمیرا کی شادی کے متعلق چند باتیں دریافت کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ اس کا دولہا پچاس سالہ تھا اور سمیرا اس کی تیسری بیوی بننے جا رہی تھی۔

کافی عرصہ بعد ہمیں پتا چلا کہ شادی کی پہلی رات سمیرا نے اپنے شوہر کو قریب نہ آنے دیا۔ نوبت لڑائی مار کٹائی تک جا پہنچی، پھر سمیرا کی جارحیت پر اس کا بوڑھا شوہر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ ایک چھوٹے قد کا موٹا مگر کمزور مرد تھا۔ اس دھینگا مشتی میں اس کا خون بہہ نکلا۔ لامحالہ اس حالت میں وہ سمیرا کی دوشیزگی کے برقرار ہونے کی تصدیق کرنے کے قابل ہرگز نہ تھا۔ سمیرا نے منہ پھٹ انداز میں چلا کر کہہ دیا کہ وہ اس جیسے مرد سے کبھی محبت نہیں کر سکے گی۔ چنانچہ وہ دوبارہ چچا کی دہلیز پر آ گئی۔ چچا کا غصہ دیدنی تھا۔ اس نے کہا کہ قرآن مجید ہمیں حکم دیتا ہے کہ ایسی عورت جو خاندان کے لیے

گالی بن جائے اسے کمرے میں اکیلا ڈال دیا جائے اور تاحیات اس سے کوئی بات نہ کرے۔

سمیرا کے لیے اوپر والی منزل پر مخصوص کمرہ تعمیر کرایا گیا جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی تا کہ قیدی کی چیخیں بھی کسی کو سنائی نہ دیں۔ صرف ایک خاص قسم کا دروازہ نصب کر دیا گیا جس میں نیچے ایک چوکور خانہ بنایا گیا جہاں سے اسے کھانا وغیرہ پہنچا دیا جاتا تھا۔ رفع حاجت کے لیے کمرے کے فرش میں ایک سوراخ بنا دیا گیا تھا۔

غیر ملکی ملازمین کو بتا دیا گیا کہ گھر کا ایک فرد حادثے میں ذہنی توازن کھو بیٹھا ہے اور خدشہ ہے کہ کسی کو نقصان نہ پہنچائے لہٰذا حفظ ماتقدم کے طور پر اسے الگ رکھا گیا ہے۔

سمیرا کو اس غیر منصفانہ سزا سے نکالنے کے لیے میں نے سارہ سے مشورہ کیا کہ اسد اور کریم کی معاونت سے سمیرا کو اس ظلم سے نجات دلائی جائے۔ مگر اس معاملے میں دونوں حضرات بھی بے بس ہو گئے۔ اس ظلم پر کڑھتے ہوئے میں نے کئی راتیں جاگ کر گزار دیں۔ میں نے کئی عورتوں کے متعلق ''عورت کے کمرے'' کی سزا کا ذکر سنا ہوا تھا۔ بے بس سمیرا کی رہائی دن بدن مجھے مشکل نظر آ رہی تھی۔

☆☆☆

28/اگست 1980ء جمعرات کا دن میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی جس میں ہمارے ایک رشتہ دار شہزادہ خالد الفیصل نے اپنے صوبے میں جہیز کی رقم کو محدود کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ رقم دلہن والوں کو ادا کی جاتی تھی، اب دلہن کے سرپرست پچیس ہزار سعودی ریال (سات ہزار ڈالر) تک لے سکتے تھے۔ 1980ء میں اوسطاً رقم ایک لاکھ ریال تھی۔ نتیجتاً کئی سعودی مرد، بیوی حاصل کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ اس خبر نے مجھے سوچوں میں مبتلا کر دیا کہ آخر کب تک سعودی عورتوں کی خرید و فروخت جاری رہے گی۔ میں، سلطانہ جو کبھی آتش فشاں سی تھی، اب عام شہزادیوں کی طرح بوریت اور یکسانیت کا شکار ہو چکی تھی۔ مجھے اپنی اس عیش و عشرت اور کاہلی کی

زندگی سے نفرت تھی مگر میں سوچتی رہتی کہ آخر اس بے کیف زندگی کو کیسے تبدیل کیا جائے؟

میں اب دو بیٹیوں اور ایک بیٹے کی ماں تھی، لیکن اس خیال سے کہ مستقبل میں کبھی ماں نہیں بن سکوں گی میری پلکیں بھیگ جاتیں اور ذہن میں کئی خیالات سر ابھارنے لگتے۔ ایک سال قبل جب معمول کے چیک اپ کے دوران ہم پر آشکار ہوا کہ میں چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہوں تو کریم اور مجھ پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی۔

میں جھروکے میں بیٹھی نجانے کن سوچوں میں گم تھی کہ میں نے کریم کو آتے دیکھا۔ میں نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا، مگر اس کی طرف سے سردمہری محسوس کر کے میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔ میری توقعات کے بالکل برعکس کریم نے ایسی بات کہی جس کا میں نے کبھی گمان تک نہیں کیا تھا کہ کریم بھی کبھی مجھ سے ایسی بات کرے گا۔ کریم نے کہا: ''سلطانہ! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے، ایک بہت ہی مشکل فیصلہ، تمہاری بیماری کی وجہ سے پہلے اس کا ذکر نہ کر سکا تھا۔''

اگرچہ ان الفاظ سے میں خوفزدہ سی ہو گئی تھی تاہم مجھ پر واضح نہ تھا کہ کریم کیا کہنے جا رہا ہے اس لیے میں صرف سر ہلا کر رہ گئی۔

''سلطانہ! تم میرے دل میں ہمیشہ سب سے اہم اور بے حد پیاری رہی ہو اور رہو گی۔'' کریم نے سلسلۂ کلام پھر سے جوڑتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

مجھے ابھی تک کوئی گمان تک نہ تھا کہ میرا شوہر مجھے کیا سنانے جا رہا ہے لیکن بلاشبہ وہ مجھے ایسی بات پر آمادہ کرنے جا رہا تھا جو مجھے قابل قبول نہ تھی۔ مجھے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

''سلطانہ! میں ایک ایسا شخص ہوں جو کئی بچوں کا متحمل ہو سکتا ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میرے دس بیس بچے ہوں یا اتنے ہوں کہ جتنے اللہ تعالیٰ مجھے دینا چاہے۔'' کریم سانس لینے کے لیے رکا تو یہ وقفہ مجھے پوری زندگی پر بھاری محسوس ہوا۔ خوف سے میں نے سانس تک روک رکھی تھی۔

''سلطانہ! میں دوسری شادی کر رہا ہوں۔ دوسری بیوی صرف بچے پیدا کرنے کے لیے ہوگی لیکن میری محبت ہمیشہ تمہارے لیے وقف رہے گی۔'' بالآخر کریم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

میرے ذہن میں دھماکے ہونے لگے۔ میں ہونقوں کی طرح دیدے پھاڑے دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے کچھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ کریم شاید میرے ردعمل کا منتظر تھا۔ میں نے اکھڑتے ہوئے سانسوں پر قابو پایا۔ میرا دکھ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کریم نے میرے ارمانوں کا خون کر دیا تھا اور اب میں اس کا خون پی جانا چاہتی تھی۔ میرے مشتعل جذبات نے میری داخلی قوت کو مہمیز دی۔ میں نے پوری قوت سے کریم کا چہرہ نوچ کر اسے پاؤں کی ٹھوکر لگائی۔ ہم دونوں فرش پر گر پڑے۔ کریم نے مجھے پکڑ کر سیدھا بٹھا دیا۔ میری چیخیں شاید عرش تک پہنچ رہی ہوں گی۔ اس ہسٹریائی کیفیت کے بعد مجھ پر موت کا سا سکوت طاری ہو گیا۔ میں بھی اب ایک فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے دل کڑا کر کے کریم سے کہا کہ ''مجھے طلاق دے دو۔ میں ثانوی حیثیت میں اپنی تذلیل ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔''

کریم نے جواباً کہا کہ ''مجھے صرف اس صورت میں طلاق مل سکتی ہے' کہ میں بچے ساتھ نہ لے جاؤں۔''

بچوں کی خواہش اصل وجہ نہ تھی۔ یہاں تو وہی پرانا معاملہ تھا: جنسی ہوس۔ میرا شوہر یقیناً نئی شہوانی لذت سے آشنا ہونا چاہتا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ کریم کا چہرہ مجھے مکروہ لگا۔ جس شخص کے پہلو میں میں نے آٹھ سال کا طویل عرصہ گزارا تھا وہ اب مجھے یکسر اجنبی معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی نظروں سے دور ہو جانے کو کہا تو وہ سر جھکائے چل دیا۔ عرب معاشرے کے دیگر مردوں سے میں اپنے شوہر کو ممتاز گردانتی تھی مگر آج اس نے اپنا خول اتار دیا جس کے نیچے سے اس کا اصل بھیانک چہرہ سامنے آ گیا تھا۔ میں نے نئے عزم اور نئے منصوبے کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

مجھ میں ماضی کی شعلہ فشاں سلطانہ عود کر آئی تھی۔ میں نے بھی ٹھان لیا کہ کریم کو ناکوں چنے چبوا دوں گی۔ اکثر سعودی مردوں کے برعکس کریم اہلخانہ کے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کے بارے میں لاپروا ثابت ہوا تھا۔ ان تک میری رسائی آسان تھی۔ میں نے کریم کے دستخطوں کی کامیاب نقل اتارنے میں پہلے ہی مہارت حاصل کر رکھی تھی۔ کریم کی ذاتی مہر اس کی سٹڈی میں ڈیسک پر رکھی رہتی تھی۔ ان حالات میں میں بآسانی اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتی تھی۔

کریم اپنے والد کے محل چلا گیا۔ شاید وہ میرا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔ میں نے نہایت خاموشی اور راز داری سے خفیہ سیف سے ہزاروں ڈالر نکال کر سفری بیگ میں ڈال لیے۔ زیورات اور ہیرے جواہرات بھی بیگ میں ٹھونس لی اور سکون سے بیگ تھپتھپایا۔ کاغذات مکمل کر کے میں نے ہر طرح سے خود کو آمادۂ سفر کر لیا تھا۔

اپنے منصوبے کے بارے میں مَیں نے اپنی کسی بہن کو بھی آگاہ نہ کیا مبادا وہ میرا راز اپنے خاوندوں کے سامنے اگل دیں۔ میں نے اپنی سب سے بااعتماد ملازمہ کو بلا کر کہا کہ اگر کریم میرے متعلق پوچھے تو بتا دینا کہ میں چند دنوں کے لیے جدہ چلی گئی ہوں۔

میں نے اپنے خاندانی امریکی پائلٹ کو فون کیا کہ ہم جدہ جا رہے ہیں اور اسے ایک گھنٹے کے اندر ائیر پورٹ پر پرواز کے لیے تیار ہونا چاہیے۔ میں نے جدہ میں اپنے نوکروں کو فون پر بتایا کہ میں شہر میں اپنی ایک دوست سے ملنے جا رہی ہوں اور شاید محل دیکھنے بھی آ جاؤں، اگر کریم فون پر ان سے پوچھے تو کہہ دیں کہ میں دوست کے گھر پر ہوں اور جلد ہی انہیں (کریم کو) فون کروں گی۔ میری یہ مکارانہ چالیں کریم کو ممکن حد تک اپنے سفری منصوبے سے بے خبر رکھنے کی ایک کوشش تھی۔ جب مجھے ائیر پورٹ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو مجھے ریاض شہر میں جمعرات کی شام کا ٹریفک کا رش دیکھ کر حیرت ہو رہی تھی۔ ہمارا شہر غیر ملکی مزدوروں سے بھرا ہوا تھا کیونکہ ہم سعودی شہری چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے بھی خود کو تکلیف دینا گوارا نہیں کرتے۔ شاید

ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہمارے سلوک سے اکتایا ہوا غیر مراعات یافتہ طبقہ ہماری لاشوں کو کتوں کے آگے ڈال دے گا۔

جب میں اپنے جیٹ ہوائی جہاز میں سوار ہوئی تو میں نے پائلٹ سے کہا:

''ہمارا طے شدہ پروگرام کچھ تبدیل ہو گیا ہے' دبئی میں ہمارا ایک بچہ بیمار ہے۔ میں نے ابھی ابھی کریم کی فون کال سنی ہے' انہوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ مجھے جدہ جانے کی بجائے پہلے دبئی جانا ہو گا۔ اگر کوئی تو ایمرجنسی ہوئی کریم خود بھی کل دبئی پہنچ جائیں گے۔''

میں نے بڑی مہارت سے جھوٹ بولا تھا۔ پائلٹ جانتا تھا کہ کریم اور میں خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ یوں اسے میری کسی بات پر شک کا واہمہ تک بھی نہ ہوا۔

ہم جونہی دبئی ائیر پورٹ پہنچے۔ میں نے پائلٹ سے کہا کہ وہ دبئی شیرٹن ہوٹل میں ٹھہرے' میں اسے کل یا پرسوں فون پر اگلے پروگرام کے متعلق بتا دوں گی اور وہ اپنے آپ کو آف ڈیوٹی سمجھے۔ دراصل کئی روز تک کریم کو اس کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے پاس تین جیٹ تھے' جن میں سے ایک ہر وقت کریم کے لیے تیار رہتا تھا۔

بچوں نے مجھے دیکھا تو خوشی سے کھل اٹھے۔ جب میں نے گرمائی کیمپ کے ہیڈ ماسٹر کو بتایا کہ بچوں کی دادی شدید بیمار ہے تو وہ ہمدردی کرنے لگا۔ میں نے ہیڈ ماسٹر سے کہا کہ میں بچوں کو لینے آئی ہوں اور آج رات ہی ہم واپس ریاض پہنچنا چاہتے ہیں۔ اس نے فوراً بچوں کے پاسپورٹ وغیرہ میرے حوالے کر دیئے۔

رخصت ہوتے وقت میں نے ہیڈ ماسٹر سے کہا: ''میں دبئی مین بچوں کے ملازمین کو تلاش کرنے میں ناکام رہی ہوں۔ میں نے فون کرنے کی کوشش کی مگر کوئی جواب نہیں ملا۔ آپ پلیز صبح انہیں بلا کر بتا دیں کہ وہ شیرٹن ہوٹل میں پائلٹ جوئیل سے ملیں' آپ یہ خط پائلٹ کو دے دیں' شکریہ۔'' یہ کہہ کر میں نے ایک لفافہ ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں تھما دیا۔

اس خط میں، مَیں نے پائلٹ سے معذرت چاہی تھی کہ میں نے دھوکا دیکر اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں نے کریم کے نام ایک خط لفافے میں ڈال دیا تھا جس میں، میں نے وضاحت کی تھی کہ پائلٹ جوئیل کی ملازمت بحال رکھی جائے کیونکہ اسے میرے منصوبے کی قطعی کوئی بھنک نہ تھی۔ میں بچوں کے ہمراہ ایک لیموزین کار میں ہوائی اڈے پہنچی جہاں سے صرف ایک گھنٹہ کے اندر سیدھی لندن کی طرف جانے والی پرواز تیار تھی۔ خوش قسمتی سے جہاز تقریباً خالی تھا۔ اس طرح مجھے چار سیٹیں حاصل کرنے میں قطعاً کوئی مشکل نہ ہوئی۔

بچے فوراً ہی سو گئے۔ میں وقت گزاری کے لیے ایک میگزین کے صفحات الٹنے پلٹنے لگی مگر مجھے کسی پل سکون نہیں مل رہا تھا۔ اسی وقت مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے گھور رہا ہے۔ یہ ایک لبنانی عورت تھی جو مجھے بڑی طیش بھری نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اس کی گود میں ایک تین چار سالہ بچی بھی تھی۔ مجھے اس کی تیز نظروں کی چبھن برداشت نہ ہوئی تو میں خود اٹھ کر اس کے پاس چلی گئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مجھ سے کیا غلطی ہوئی ہے؟ اس نے نہایت ترشی سے جواب دیا: ''جب تم ہوائی اڈے پہنچیں تو کس طرح مجھ پر اور میری معصوم بچی پر چڑھ دوڑی تھیں۔'' اس نے اپنے لہجے میں مزید نفرت کا زہر بھرتے ہوئے کہا: ''تم سعودی یہ کیوں خیال کرتے ہو کہ تم پورے جہاز کو خرید سکتے ہو۔''

میں بہت ہی جان لیوا لمحات سے گزر کر آئی تھی، ان تکالیف نے میری قوت جیسے منجمد کر دی تھی۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ خود سے زیادہ میں نے اس خاتون کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ سسکتے ہوئے میں نے اس کا کندھا تھپکا اور اس سے بے سمجھی میں کیے گئے اپنے ناروا رویہ کی معافی مانگی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ایک المیے سے دوچار ہوں اور یہ فلائٹ پکڑنا میرے لیے بہت ہی ضروری تھا۔

اس عورت نے جواباً اپنا المیہ بتانا شروع کر دیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں تمہیں بتا دوں کہ میری اس نوعمر بچی کے ساتھ کیا حادثہ پیش آ چکا ہے تو شاید تم میرے لہجے میں

گھلی تلخی اور نفرت کو بھلا دو گی۔ اس لبنانی عورت نے اپنا نام وداد بتایا تھا۔ لبنان کے اندر جاری خانہ جنگی کی وجہ سے سعودی عرب اور خلیج کی دوسری ریاستوں میں لبنانی روزگار کے لیے ادھر ادھر بھٹکتے پھرتے تھے۔ وداد کا شوہر خوش قسمت نکلا کہ اسے سعودی عرب میں ایک اچھی ملازمت مل گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی بیوی اور کم سن بیٹی کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔

یہ دو ماہ پہلے کی بات ہے جب وداد نے اپنی سعودی سہیلیوں کو پارٹی پر بلایا۔ پارٹی شام گئے تک جاری رہی۔ جب تاریکی پھیلنے لگی تو وداد کو اپنی بچی نظر نہ آئی۔ اس کی تشویش گہری ہوتی رہی۔ بہت تلاش کیا گیا مگر کہیں بھی اس کی بچی کا سراغ نہ مل سکا۔ آخر کار وداد اور اس کا خاوند اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ جب بچی ملنے کی ساری امیدیں ختم ہو گئیں تو وداد مایوسی کے عالم میں اپنے ملک لبنان لوٹ آئی کیونکہ اب اس کا دل ریاض شہر کے اس گھر میں نہیں لگتا تھا۔ بیروت (لبنان کا دارالحکومت) میں آئے ہوئے ابھی دس روز ہ گزرے تھے کہ ان کے پڑوسی نے اطلاع دی کہ اس کے خاوند نے ریاض سے فون پر کہا ہے کہ فوراً ریاض پہنچ جائے کیونکہ اس کی بیٹی مل چکی ہے۔ وداد فوراً ریاض روانہ ہو گئی۔ وہاں آ کر اسے معلوم ہوا کہ بچی نازک حالت میں گیٹ پر پائی گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بیگ تھا جس میں بیس ہزار ڈالر اور بہت سی جیولری تھی۔ بچی کو فوراً معائنے کے لیے ہسپتال لے جایا گیا کہ کہیں اس کی آبروریزی تو نہیں کی گئی۔ طبی معائنہ سے جو رپورٹ ملی وہ والدین کے لیے ایک بہت بڑا سانحہ تھی۔ بچی کی عزت تو محفوظ رہی تھی مگر آپریشن کر کے اس کا ایک گردہ نکال لیا گیا تھا۔ بچی کے پیٹ پر مندمل شدہ زخم کا نشان اب تک موجود تھا۔ بچی کو ایک لمبی کار، موٹا لمبا آدمی، بدبودار رومال اور ایک نرس کے سوا کچھ یاد نہ تھا۔ مطلب براری کے بعد اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر گھر کے گیٹ پر چھوڑ دیا گیا تھا جب وداد نے میری آنکھوں میں بے یقینی کی پرچھائیاں دیکھیں تو وہ تیزی سے گئی اور جا کر سوئی ہوئی بچی کو بانہوں میں سمیٹ لائی اور مجھے مندمل زخم دکھائے۔ مجھے اپنی قومیت پر فخر تھا مگر اس فخر کو وداد

کے آخری الفاظ نے خاصی حد تک میرے ذہن سے محور کر دیا۔ ''میں نے سعودی عورتوں کے اطوار اور طرز زندگی کو بڑے قریب سے دیکھا ہے'' وہ سانس لینے کے لیے چند لمحے رکی' پھر نفرت سے ہونٹ سکیڑتے ہوئے گویا ہوئی ''یہ درست ہے کہ غیر ملکی اپنی مالی پریشانیوں کے باعث سعودی عرب کا رخ کرتے ہیں مگر جو لوگ تمہیں پہچان چکے ہیں ان کے دلوں میں تمہارے خلاف نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

وداد نے اب یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ سعودیوں کی منافقت اور جابرانہ سلوک کی بجائے لبنان میں اسرائیلی بمباری میں مرنے کو ترجیح دے گی۔ میں نے بچوں سمیت رات لندن میں گزاری۔ اگلے دن ہم نے فیری کے ذریعے رودبارِ انگلینڈ عبور کی اور فرانس پہنچے۔ وہاں سے ہم ٹرین کے ذریعے زیورچ پہنچے۔ میں نے چند گھنٹوں کے لیے بچوں کو ہوٹل میں ٹھہرایا اور اس عرصے میں اپنے بیٹے کا سوئس بنک اکاؤنٹ نکلوالیا۔ جیسے ہی میرے ہاتھوں میں چھ ملین ڈالر کا ڈرافٹ آیا میں نے خود کو محفوظ اور پراعتماد محسوس کیا۔

اگلے مرحلے میں میں نے جینوا جانے کے لیے شوفر والی کار کرایہ پر لی۔ پھر وہاں سے ہم لندن واپس آ گئے۔ لندن میں' میں نے اپنے نام پر اکاؤنٹ کھلوایا اور رقم جمع کرا دی۔ ذاتی اخراجات کے لیے میں نے گھر کی سیف والی رقم اپنے پاس رکھ لی تھی۔ اس کے بعد ہم نے روم کی فلائٹ پکڑی۔ روم سے کرائے کی کار کے ذریعے ہم واپس پیرس آ گئے۔

پیرس میں' میں نے ایک فل ٹائم ہاؤس کیپر' ایک ڈرائیور اور ایک ذاتی محافظ ملازم رکھ لیے' پھر پیرس کے مضافات میں' مَیں نے فرضی نام سے ایک بنگلہ کرائے پر حاصل کیا۔ اتنے پیچیدہ راستے اختیار کرنے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ کریم ہمیں کبھی ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

ایک ماہ بعد میں نے بچوں کو ہاؤس کیپر کی تحویل میں دے کر خود جرمنی کے شہر فرینکفرٹ کا رخ کیا۔ فرینکفرٹ پہنچ کر میں ایک بنک میں داخل ہوئی اور منیجر سے کہا کہ

میرا تعلق دبئی سے ہے اور میں ایک بڑی رقم جمع کرانے آئی ہوں۔ میں نے بیگ سے رقم نکال کر منیجر کی میز پر رکھ دی۔

اتنی بڑی رقم دیکھ کر بے چارہ بینک مینیجر حیرت سے ایسا دنگ ہوا کہ پلکیں جھپکنا تک بھول گیا۔ اس دوران جبکہ وہ آنکھیں نکالے رقم کے ڈھیر کو گھور رہا تھا' میں نے کہا مجھے اپنے شوہر کو ایک فون کال کرنی ہے۔ میں نے فون کال سے کہیں زیادہ رقم پانچ سو ڈالر نکالے اور مینیجر کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اتنی بڑی رقم دیکھ کر اس نے فوراً اپنی سیٹ چھوڑی اور سلام کر کے مجھے فون کرنے کے لیے تنہا چھوڑ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں نے سارہ کے گھر فون کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس عرصہ میں ایک بچے کی ماں بن چکی ہوگی۔ سارہ نے جب میری آواز سنی تو خوشی اور حیرت سے اس کی چیخ نکل گئی۔ میں نے جلدی سے پوچھا کہ اس کا فون ٹیپ تو نہیں کیا جا رہا۔ اس نے جواباً کہا کہ وہ یقین سے کچھ کہہ نہیں سکتی۔ سارہ نے مجھے بتایا کہ کریم بہت پریشان ہے۔ اس نے دبئی سے لندن تک تو مجھے ٹریس کر لیا تھا مگر اس کے بعد اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اب کریم نہ صرف پریشان ہے' بلکہ اپنے کیے پر پشیمان بھی ہے!

میں نے سارہ سے کہا کہ وہ کریم کو میرا ایک پیغام پہنچائے کہ میں اس سے سخت نفرت کرتی ہوں اور وہ ہمیں اب کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ اسے یہ بھی بتا دینا کہ میں نے اپنی اور بچوں کی غیر ملکی شہریت کا انتظام بھی کر لیا ہے۔ کریم کو مزید اذیت سے دوچار کرنے کے لیے اس کا بیٹا عبداللہ اپنے باپ کا زندگی بھر منہ نہیں دیکھے گا۔

سارہ نے بتایا کہ علی بھائی اور ابو میری واپسی کے منتظر ہیں۔ مجھے واپس آنا ہو گا اور جو کچھ کریم چاہتا ہے اسے خوشی اور رضامندی سے مان لینا چاہیے۔ مجھے اپنے ابو اور بھائی سے اسی سلوک کی توقع تھی۔ اسی لیے مجھے ذرا سا بھی دکھ نہ ہوا۔ سارہ نے مجھے مفاہمت پر آمادہ کرنے کے لیے کہا کہ میں اپنی سوکن قبول کر لوں' کیونکہ ادھر ادھر بھٹکنے سے تو یہ بہتر ہے۔ میں نے جواباً پوچھا کہ اگر تمہارے ساتھ یہی کچھ اسد کرتا تو کیا تم

قبول کرلیتیں؟ سارہ کی خاموشی ہی میرا جواب تھا۔

فون کال کے بعد میں نے ساری رقم دوبارہ بیگ میں ڈالی اور چپکے سے بینک سے باہر آ گئی۔ یہ ''حربہ'' میں نے اس لیے استعمال کیا تھا مبادا ''پے فون'' سے میری کال ٹریس ہو جائے۔ تمام امور میرے منصوبے کے مطابق طے پا رہے تھے مگر میں کریم کو ابھی مزید ذہنی کچوکے لگانا چاہتی تھی۔ اس دوران کریم بھی جان لیتا کہ مجھے زیادہ بیویاں رکھنے والا نظام ہرگز منظور نہیں' خواہ اس کے لیے مجھے بھاری قیمت ہی کیوں نہ چکانا پڑے۔

بچے اس سارے ڈرامے سے بے خبر تھے۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ ان کے ابو کاروبار کے سلسلے میں مشرق کو گئے ہوئے ہیں' اس لیے ریاض میں رہنے کی بجائے میں انہیں سیر کرانے لے آئی ہوں۔

میری خوش نصیبی تھی کہ میں ایک شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ ورنہ کسی عام عورت کا ایسے اقدام کے بعد زندہ رہنا محال تھا لیکن ہم شاہی افراد اپنے اسکینڈل گھر کی چار دیواری کے اندر ہی نمٹاتے ہیں۔ اپنے خاندان سے یوں اچانک الگ ہونے پر مجھے بھی کسی پل چین نصیب نہ تھا۔ میں ہر ماہ سارہ کو فون کرتی تھی' مجھے یقین تھا کہ ایک دن میرے پکے عزم اور استقامت کے آگے کریم گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جائے گا۔ پانچ ماہ بعد بالآخر میں کریم سے فون پر بات کرنے پر رضامند ہو گئی۔ میں کال کرنے کے لیے لندن روانہ ہو گئی۔ ہماری گفتگو سے میں نے واضح طور پر یہ بات جان لی تھی کہ کریم میرے اور بچوں کے بغیر زندہ نہیں رہنا چاہتا۔ اب کریم میرے بچھائے ہوئے جال میں پوری طرح پھنستا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

اگلے ویک اینڈ پر ہم نے وینس میں ملاقات کا پروگرام طے کر لیا۔ میرا شوہر مجھے چار مضبوط و توانا محافظوں کے ساتھ دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ میں نے کریم سے کہا تھا کہ میں اس پر مزید اعتماد نہیں کر سکتی۔ میں نے محافظوں کا بندوبست اس لیے کیا تھا مبادا کریم کرائے کے غنڈوں کے ذریعے اٹھوا کر مجھے واپس لے جانے کا ارادہ کر کے آیا ہو

اور میں واپس ریاض جا کر وہی سزا بھگتوں جو نافرمان بیویوں کے لیے غیر منصفانہ قانونی نظام کے تحت تجویز کی گئی ہے۔ میرے اس طرز عمل سے کریم کو واقعی ندامت اور خفت محسوس ہو رہی تھی۔

آخر کار ہم دونوں ایک سمجھوتہ کرنے پر راضی ہو گئے۔ میں نے مطالبہ کیا کہ میں اس صورت میں واپس جاؤں گی جب کریم مجھے اپنے دستخط سے ایسی قانونی دستاویزات دے جس میں وہ اس امر کا پابند ہو گا کہ میری زندگی میں وہ دوسری بیوی نہیں لائے گا اور طلاق ہو جانے پر بچے میری تحویل میں رہیں گے اور نصف جائیداد بھی مجھے ملے گی۔ مزید براں بیٹے کی سوئٹزر لینڈ بینک اکاؤنٹ سے نکلوائی ہوئی رقم بھی میرے پاس ہی رہے گی اور اس کے بدلے میں اتنی رقم کریم ہمارے بیٹے عبداللہ کے اکاؤنٹ میں جمع کرائے گا۔ اس کے علاوہ وہ ہماری دونوں بیٹیوں کے لیے سوئس بینک اکاؤنٹ میں ایک ملین ڈالر فی بچی بھی جمع کرائے گا اور ہمارے پاسپورٹ اور دیگر کاغذات میری تحویل میں رہیں گے تاکہ ہم بغیر کسی روک ٹوک کے سفر کر سکیں۔ میں نے کریم سے کہا کہ ان ضروری قانونی کاغذات پر دستخط کے بعد میں بچوں کے ساتھ مزید ایک ماہ تک یورپ میں ٹھہروں گی۔ ان الفاظ کی ادائیگی کے دوران کریم نے میرے لہجے کا عزم اور سختی محسوس کر لی تھی۔ اس نے جھرجھری سی لی' کیونکہ اتنے سخت الفاظ اس نے شاذ ہی سنے ہوں گے۔ ایئرپورٹ تک میں کریم کے ساتھ رہی' وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے زندگی کا سب سے بڑا جوا کھیلا تھا اور اب مجھے فتح کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

ٹھیک ایک ماہ بعد میں نے کریم کا فیصلہ جاننے کے لیے فون کیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ میں ہی اس کی قوت اور زندگی ہوں' وہ مجھے اور بچوں کو واپس گھر دیکھنا چاہتا تھا' اور گھر کی سابقہ خوشیاں واپس لانے کا خواہاں تھا۔ میں نے اسے بڑی رکھائی سے جواب دیا: ''بے التفاتی کے سرد خنجر سے وہ محبت کے نازک تانوں بانوں کو قائم نہیں رکھ سکے گا۔'' ہمارا شمار ان جوڑوں میں ہوتا تھا جو باہمی محبت' اعلیٰ خاندان اور بے شمار

دولت کی وجہ سے بڑا نمایاں تھا۔اس ساری تباہی کا واحد ذمہ دار صرف اور صرف کریم تھا میں نہیں!

آخر میں اپنے ملک' اپنی سرزمین' اپنے شہر ریاض لوٹ آئی۔ میرا شوہر کانپتے لبوں اور رکی رکی مسکراہٹ چہرے پر سجائے ہوائی اڈے پر ہمارا منتظر نظر آیا۔عبداللہ اور ہماری دونوں بیٹیاں اپنے باپ کو دیکھ کرخوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔کریم کے لیے کبھی میرے دل میں بہت زیادہ محبت' عزت اور وقار تھا' مگر اس نے دوسری شادی کی بات کر کے میری نظروں میں اپنا مقام گرا لیا تھا' اوز اب تو محض وہ میرے لیے میرے بچوں کا والد یا اس سے تھوڑی زیادہ حیثیت رکھتا تھا۔

یکم اگست 1990ء کو جدہ میں تعطل کا شکار ہونے والی کانفرنس میں کریم بھی موجود تھا۔کراؤن پرنس شیخ عبداللہ السالم الصباح کویت واپس آ گئے تھے' اس امید کے ساتھ کہ جنگ ٹل جائے گی۔

عراقی دستے کویت کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں کریم کے بظاہر پرسکون چہرے پر تشویش کی گہری پرچھائیاں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے کریم کی زبانی اکثر عراق میں بعث تحریک کی بربریت کے بارے میں سن رکھا تھا۔ یہاں کی سیاست کے متعلق میں بھی بہت کم جانتی ہوں کیونکہ سعودی خبروں پر سنسر شپ عاید ہوتی ہے اور اکثر سعودی مرد اپنی بیویوں کو سیاسی سرگرمیوں سے بے خبر ہی رکھتے ہیں۔ہمیں جلد ہی علم ہو گیا کہ عراق کویت قابض ہو چکا ہے اور وہ ایک ہی ہلے میں دونوں پڑوسی ممالک کویت اور سعودی عرب کو ہڑپ کر جانا چاہتا ہے۔

ریاض میں کویتی مہاجرین پناہ کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے جس کی وجہ سے یہ شہر بھی غیر محفوظ سمجھا جانے لگا۔ یہ پرسکون شہر افراتفری کا شکار ہو گیا تھا۔

امریکی فوجی دستوں کو اپنی سرزمین پر دیکھ کر خوفزدہ سعودی چہ میگوئیاں کر رہے تھے' کیونکہ انہوں نے فوجی وردی میں ملبوس خواتین کو کبھی نہ دیکھا تھا بلکہ وہ اس کا گمان تک نہیں کر سکتے تھے۔ مذہبی رہنما اور دیگر کٹر مذہبی قسم کے افراد اسے کسی مصیبت کا پیش

خیمہ سمجھ رہے تھے۔ سعودی عورتیں اپنا علیحدہ نقطہ نظر رکھتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ امریکی عورتیں فوج میں محض مردوں کی خدمت اور ان کی جنسی تسکین کے لیے بھرتی کی جاتی ہیں۔ ویسے ہم سعودی خواتین غیر ملکی امریکی فوجی عورتوں کے بارے میں بہت ہی کم معلومات رکھتی ہیں کیونکہ وہ تمام خبریں جن میں ایسی عورتوں کا ذکر ہو جو اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرتی ہیں سنسر کر دی جاتی ہیں اور جب ہم نجی مقاصد کے لیے بیرون ملک جاتی ہیں تو ہمیں صرف خریداری مراکز تک ہی محدود رکھا جاتا ہے اور ملٹری چھاؤنی تک نہیں لے جایا جاتا۔ ایک روز جب علی غیر سنسر شدہ امریکی اور یورپی میگزین لے آیا تو ہم سب دلکش فوجی عورتوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ان میں بہت سی مائیں بھی تھیں۔ ہم تو ایسی آزادی کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ میں جنگ کے خوف سے گم سم بیٹھی تھی کہ سارہ کمرے میں دوڑتی آئی۔ اس کی خوشگوار طبیعت دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ میں سمجھ گئی کہ کوئی اچھی خبر ہی ہو گی۔ سارہ نے سنبھلتے ہوئے "یاہو" کا نعرہ لگایا اور کہا: "سڑکوں پر سعودی خواتین ڈرائیورنگ کرتی پھرتی ہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں۔" یہ سنتے ہی میں نے خوشی سے چیخ ماری اور سارہ سے لپٹ گئی۔ ہم ایک دوسرے کو لپٹائے فرش پر لڑھکنیاں کھا رہے تھے۔ میری چھوٹی بچی ہمیں فرش پر لوٹتے اور چیختے چلاتے دیکھ کر سسکیاں لینے لگی۔ میں نے خود کو سارہ کے بازوؤں سے آزاد کیا اور بیٹی کو گود میں لے کر تسلی دی کہ ہماری یہ حماقت ایک بہت بڑی خوشی کا نتیجہ تھی۔ اس خوشی سے آنکھوں میں آنے والی نمی ابھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ کریم نے ہمارے سارے ارمانوں پر اوس ڈال دی۔ اس نے آتے ہی کہا کہ ان خواتین کو قرار واقعی سزا دی جائے گی جو بے پردہ ہو کر ڈرائیونگ کے لیے نکل کھڑی ہوئی ہیں۔ آخر وہ بھی ایک سعودی مرد تھا' ہماری یہ حقیر سی آزادی کیونکر قبول کرتا!

کریم کے الفاظ درست ثابت ہوئے۔ 47 ایسی خواتین مطاوئی کے قہر کی بھینٹ چڑھیں۔ یہ مڈل کلاس خاندان کی عورتیں تھیں۔ ان کے اس بہادرانہ اقدام کے نتیجے میں ان کی تدریسی ملازمت ختم کر ڈالی گئی' ان کے پاسپورٹ ضبط ہو گئے اور ان

کے اہل خانہ کو سخت دھمکیاں دی گئیں۔

ایک روز میں نے ہمت کر کے اپنے فلپائنی ڈرائیور کے ذریعے ان عورتوں کی فہرست حاصل کر لی جنہیں ڈرائیونگ کرنے کی پاداش میں سزا ملی تھی۔ اس فہرست میں تین خواتین کے نام اور فون نمبر درج تھے۔ کئی ہفتے مسلسل فون ڈائل کرنے کے بعد مجھے صرف تین کالوں کا جواب مل پایا۔ کہیں رابطہ ہوتا تو رانگ نمبر کہہ کر فون بند کر دیا جاتا۔ دراصل انہیں اس قدر ڈرایا گیا تھا کہ وہ فون کا جواب دینے سے بھی گریزاں تھیں۔ ظلم کی انتہا دیکھئے کہ ایک باپ نے اپنی بیٹی کو اس ''گناہ'' (ڈرائیونگ) کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ باپ کا خیال تھا کہ بیٹی کو قتل کرنے کے بعد مذہبی جنونی اسے اور اس کے دیگر افرادِ خانہ کو تو سکون سے رہنے دیں گے!

کویت عراق جنگ ختم ہوئی تو کریم نے مجھے بتایا کہ ہمارے فوجی بہادری سے نہیں لڑے۔ کریم نے جھینپتے اور اپنی خفت مٹاتے ہوئے مزید کہا کہ کئی فوجی میدان جنگ سے فرار بھی ہوئے تاہم ہمارے پائلٹوں نے اپنی بہادری کے زبردست جوہر دکھائے، جس پر ہماری سرزمین ان پر بجا طور پر نازاں ہے۔

حصہ دوم

میری پہلی کتاب میں سعودی عرب کے شاہی خاندان کی خواتین کے شب و روز سے پردے اٹھائے گئے تھے۔ امریکا میں یہ کتاب ستمبر 1992ء میں چھپی تھی۔ اس کتاب کے شائع ہو جانے کے بعد سے مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں بے ثباتی کے خلا میں معلق ہوں کیونکہ میں اس حقیقت سے بخوبی واقف تھی کہ چھوٹا یا بڑا' اچھا یا برا کوئی بھی فعل اپنے اثرات چھوڑے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جیسے جیسے اکتوبر 1997ء گزر رہا تھا ویسے ویسے میں شدید ہیجانی حالت میں سخت ڈیپریشن کی ملی جلی کیفیت میں اپنا وقت گزار رہی تھی۔

جب میں اپنے جرم اور خوف کی ملی جلی کیفیت پر قابو پانے کے قابل ہوئی' اسی عرصہ میں کریم (میرا خاوند) تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس نے اونچی آواز میں مجھے بتایا کہ میرا بھائی علی یورپ کے دورے سے واپس آ گیا ہے اور میرے والد نے محل میں ایک ہنگامی مجلس بلائی ہے۔ یہ کہتے وقت کریم کی سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں اور اس کے زرد چہرے پر جگہ جگہ سرخی عود کر آئی تھی۔ اس وقت وہ ایک پاگل کتے سے بڑھ کر پاگل دکھائی دیتا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں ایک خوفناک تصور آیا۔ کریم کو کسی نے کتاب کی اشاعت کے متعلق بتا دیا تھا۔ پھر میرے تصور میں ایک تنگ و تاریک تہہ خانے کے اندر دم گھونٹنے والی تنہائی در آئی' جہاں میں اپنے پیارے بچوں سے الگ تھلگ قید تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں بری طرح گھبرا گئی اور میں نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا: ''آخر ہوا کیا ہے؟''

کریم نے بالکل امریکی انداز میں اپنے کندھے اچکائے اور پھر کہا: ''کون جانے کیا ہوا ہے؟'' اس کے نتھنے جوش سے پھول رہے تھے جب اس نے انکشاف کیا: ''میں نے تمہارے باپ کو بتا دیا تھا کہ مجھے کل زیورچ میں کام ہے اور میرے لوٹنے پر ہم دونوں ان سے مل سکیں گے، لیکن ان کا اصرار تھا کہ میں اپنا پروگرام منسوخ کر دوں اور آج شام تمہیں ساتھ لے کر ان کے گھر پہنچ جاؤں۔'' اس نے یہ بھی بتایا کہ ''تمہارے والد کے اس نادرشاہی حکم کی وجہ سے مجھے اپنی تین میٹنگیں منسوخ کرنی پڑی ہیں۔'' یہ سب سن کر میری ٹانگوں میں گویا جان نہ رہی تھی، چنانچہ میں صوفے پر گر پڑی اور کچھ دیر بعد جب سکون ملا تو سوچنے لگی کہ میرے اندازے کس قدر کمزور تھے۔ کریم کے غصے کا مجھ سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ میرا حوصلہ عود کر آیا۔ البتہ مجھے اس بات کا بھی خطرہ لاحق تھا کہ کسی بھی وقت کتاب کے مندرجات سامنے آسکتے ہیں اور ابھی غیر متوقع خاندانی میٹنگ منعقد ہونے میں کئی گھنٹے پڑے ہیں۔

چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے، بظاہر مضبوط مگر اندر سے ڈرتی ہوئی میں اپنے خاوند کریم سے باتیں کرتی ہوئی اپنے والد کے نوتعمیر محل کے کشادہ ہال سے گزر کر نرم و ملائم ایران قالینوں پر قدم رکھتی اپنے والد کی کشادہ اور شاہانہ نشست گاہ میں داخل ہوئی۔ ابو ابھی موجود نہیں تھے، البتہ خاندان کے دیگر تمام افراد حاضر تھے۔ میں اور کریم آنے والوں میں آخری تھے۔ میری والدہ کی باقی دس زندہ اولادوں کو بھی وہاں بلایا گیا تھا لیکن ان کے شوہر یا بیویاں مدعوئین میں شامل نہیں تھے۔ میری تین بہنوں کو جدہ سے خصوصی پرواز پکڑ کر ریاض آنا پڑا تھا جبکہ دو بہنیں طائف سے آئی تھیں۔ میں نے نشست گاہ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ خاندان کے بیرونی افراد میں سے صرف کریم موجود ہے حتیٰ کہ میرے ابو کی پہلی بیوی اور اس کے بچے بھی کہیں دکھائی نہ دیئے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں محل سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔

اس اجلاس کی ہنگامی نوعیت سے میرا ذہن دوبارہ کتاب کی طرف گیا اور میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ میری بہن سارہ اور میں نے پریشان نظروں سے

ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ خاندان کی واحد رکن تھی جو کتاب کی اشاعت سے آگاہ تھی۔ اس کے خیالات میری سوچ کی عکاسی کرتے تھے۔ ہر رشتہ دار نے گرم جوشی سے مجھے سلام کیا' سوائے میرے اپنے بھائی کے۔ میں نے دیکھا کہ اس کی حیلہ جُو آنکھیں چوری چوری میرا پیچھا کر رہی ہیں۔

ہمارے آنے کے کچھ ہی دیر کے بعد ہمارے والد کمرے میں داخل ہوئے۔ ان پر نظر پڑتے ہی ہم سب بہنوں نے کھڑے ہو کر ادب کے ساتھ انہیں سلام کیا...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس شخص نے ساری زندگی ہم سے کبھی جھوٹے منہ محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ میں نے کافی عرصہ سے اپنے والد کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے وہ افسردہ اور اپنے وقت سے پہلے بوڑھے نظر آئے۔ جیسے ہی میں ان کے رخسار چومنے کے لیے جھکی' وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہو گئے۔ حتیٰ کہ انہوں نے میرے سلام کا جواب بھی نہ دیا۔ اپنے خدشات کی تاب نہ لاتے ہوئے مجھے اس لمحے احساس ہوا کہ میں کتنی سادہ لوح تھی جو یہ خیال لیے بیٹھی تھی کہ خاندان سعود کی دولت جمع کرنے کی حرص انہیں کتابیں پڑھنے کا موقع فراہم نہیں کرتی۔

ابو نے بڑے سخت لہجے میں ہم سب کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ میں ایک پریشان کن خبر سنانے والا ہوں۔ میں نے جب انجانے خوف کے تحت اپنے بھائی علی کی طرف دیکھا جسے دوسروں کو مصیبت میں مبتلا کرنے کا پیدائشی شیطانی مرض لاحق تھا۔ میں نے دیکھا کہ اس کی بے رحم آنکھیں مجھ پر گڑی ہوئی ہیں' میرے ذہن میں اب کوئی شک و شبہ نہ رہا کہ آج شام کی اس ہنگامی تقریب کا واحد سبب علی ہے۔

ابو نے اپنا بڑا سیاہ بریف کیس کھولا اور اس کے اندر سے ایک کتاب نکالی جسے ہم میں سے کوئی بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ کتاب کسی غیر ملکی زبان میں تھی۔ میرا ذہن متضاد خیالات میں گھرا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ میرے پہلے خیالات موہوم تھے۔ آخر اس خاص کتاب کا ہمارے خاندان سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

ابو سخت غصے سے بھرپور آواز میں بولے: ''علی نے حال ہی میں یہ کتاب

جرمنی سے خریدی ہے۔ اس میں ایک شہزادی' ایک بیوقوف عورت کی زندگی بیان کی گئی ہے جو اپنے ان شاہی فرائض سے آشنا نہیں جو شاہی مراتب کے ساتھ ہی اس پر عائد ہوتے ہیں۔''

کمرے کے اندر دائرے کی شکل میں گھومتے ہوئے انہوں نے کتاب اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھی۔ سرورق پر تصویر بظاہر ایک مسلم عورت کی تھی جو ایک نقاب پہنے ہوئی تھی اور وہ ترکی دور کے میناروں کے پس منظر میں کھڑی تھی۔ میرے ذہن میں ہلکا سا خیال آیا کہ شاید مصر یا ترکی سے تعلق رکھنے والی ایک مظلوم جلاوطن شہزادی نے ایک پردہ کشا کتاب لکھی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی میں نے سوچا کہ بھلا ہمارے ملک میں ایسی کہانی سے کسی کو کیا دلچسپی ہوسکتی ہے؟

جب ابو دھیرے دھیرے قریب آئے تو کتاب کے سرورق پر میری نظر پڑی اس پر یہ الفاظ چھپے ہوئے تھے:

Ich, Prinzess in aus dem Hause of Saud

زبان اگرچہ اجنبی تھی مگر میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ یہ میری ہی کہانی ہے۔

اس کتاب کی مصنفہ سے اس وقت سے میرا رابطہ نہ رہا تھا جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ اس کے حقوق اشاعت ایک بڑے معتبر امریکی اشاعتی ادارے نے خرید لیے ہیں' لہٰذا اس امر سے ناواقف تھی کہ کتاب ''پرنسس'' زبردست کامیاب رہی ہے اور بہت سے غیر ملکی ناشرین نے اس کے حقوق اشاعت خرید لیے ہیں اور اس وقت دکھائی دینے والی جلد ظاہر ہے اس کا جرمن ایڈیشن تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے فخر محسوس ہوا مگر جلد ہی خوف نے آلیا۔ یوں لگا جیسے میرا سارا خون چہرے کی طرف سمٹ آیا ہو۔ میں بالکل بے جان بیٹھی تھی اور مجھے اپنے ابو کی آواز بھی بمشکل سنائی دیتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ علی جب یورپ کے دورے کے سلسلے میں جرمنی کے شہر فرینکفرٹ کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو اسے یہ کتاب نظر آئی اور اس کو سرورق پر اپنے خاندان کا نام دیکھ کر

تجسس ہوا۔ چونکہ میرے بھائی کو یورپ میں دو ماہ گزارنے تھے اسے اتنا وقت مل گیا تھا کہ کچھ رقم خرچ کر کے اس کا ترجمہ کرائے۔

ترجمہ کروانے سے پہلے علی کو یہ گمان تھا کہ خاندان سعود کی کسی غیر معروف اور ناراض شہزادی نے اس کتاب میں اپنی زندگی کے راز گپ شپ کے انداز میں بیان کیے ہیں لیکن جب ترجمہ شدہ کتاب کا متن پڑھا تو ہمارے بچپن کے واقعات سے اس نے اپنا کردار صاف پہچان لیا۔ جب کتاب کی حقیقت اس پر عیاں ہوئی تو اس نے اپنا بقیہ دورۂ یورپ منسوخ کیا اور غصے میں پھنکارتا ہوا فوراً ریاض لوٹ آیا۔ ابو نے تقریب میں تقسیم کرنے کی نیت سے ترجمہ شدہ نسخے کی فوٹو کاپیاں کروالی تھیں چنانچہ انہوں نے علی کو ہاتھ سے اشارہ کیا تو میرا بھائی اپنے پہلو میں پڑے ہوئے کاغذات کے ایک بڑے سے ڈھیر کی طرف جھکا۔ پھر اس نے ہر فرد کو کاغذات کا ایک ایک بنڈل پکڑا دیا جو ایک بڑے ربڑ بینڈ میں محفوظ تھا۔

پریشانی سے دوچار کریم نے مجھے ٹھوکا دیا۔ اس کے ابرو تنے ہوئے تھے اور آنکھیں گردش میں تھیں۔ میں نے آخری ممکنہ وقت تک جرم سے انکار اور جوابی حیرت کا اظہار کیا۔ اپنے کندھے اچکائے، سامنے تکتی رہی، آنکھیں جھپکائے بغیر اور اپنے ہاتھوں میں پکڑے کاغذات پر نظریں ڈالنا بھی گوارا نہ کیا۔

والد نے اونچی آواز میں میرا نام پکارا:

''سلطانہ!''

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرا جسم اچھل پڑا ہو۔ اب ابو تیزی سے بولنے لگے۔ ان کے الفاظ مشین گن کی گولیوں کی طرح نکل رہے تھے۔

''سلطانہ! کیا تمہیں اپنی بہن سارہ کی شادی اور طلاق یاد ہے؟ اپنے بچپن کے دوستوں کی عیاریاں؟ اپنی ماں کی موت؟ اپنا مصر کا دورہ؟ کریم سے اپنی شادی؟ اپنے بیٹے کی پیدائش؟ سلطانہ!''

اب مجھے اپنا سانس رکتا محسوس ہوا۔ میرے والد بے دھڑک الزامات لگاتے

چلے گئے: ''سلطانہ! اگر تمہیں وہ سب واقعات یاد کرنے میں مشکل محسوس ہوتی ہو تو تم یہ کتاب پڑھو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے کتاب غصے سے میرے قدموں میں پھینک دی۔

میں حرکت کرنے کے قابل نہ تھی اور ساکت ہو کر فرش پر پڑی کتاب کو تکتی رہی۔ ابو نے حکم دیا: ''سلطانہ! اسے اٹھا لو۔'' کریم جھکا' کتاب اٹھائی اور اس کے سرورق کو تکنے لگا۔ اس نے گہرا سانس لیا اور میری طرف رخ کر کے بولا: ''سلطانہ! یہ کیا ہے؟'' میں خوف سے مفلوج ہو گئی تھی۔ میرے دل نے دھڑکنا بند کر دیا تھا' میں بیٹھی سنتی رہی اور اس کے ساتھ ہی میرے اندر اس خواہش نے جنم لیا کہ کوئی مجھے بری طرح جھنجھوڑ کر اس کیفیت سے نکال دے۔

واقعی کریم نے بے قابو ہو کر کتاب فرش پر پھینکی اور مجھے دونوں شانوں سے تھام کر اس طرح جھنجوڑا جیسے میں گوشت پوست کی نہیں بلکہ چیتھڑوں کی بنی ہوئی تھی۔

مجھے پھر جانی پہچانی دل کی دھڑکن محسوس ہوئی اور بچکانہ سا خیال میرے ذہن میں آیا کہ میں اس افسوس ناک لمحے اسی جگہ مر نہیں سکتی اور تاحیات جرم کے ساتھ اپنے خاوند کے ضمیر پر بوجھ بنی رہوں گی۔ کریم کے ہاتھوں کی سخت گرفت سے مجھے اپنی گردن کے اعصاب ٹوٹتے سنائی دیئے۔ میرے ابو غصے سے چنگھاڑے: ''سلطانہ! اپنے خاوند کی بات کا جواب دو۔''

اچانک تمام مہینے اور سال جیسے بخارات بن کر اڑ گئے۔ میں پھر ایک بچی تھی' اپنے بے رحم والد کے رحم و کرم پر! مجھے شدید خواہش ہوئی کہ کاش! ماں زندہ ہوتی کہ اس کی پرجوش ممتا ہی مجھے اس دہشت ناک فضا سے بچا سکتی تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے سے رندھی ہوئی آواز نکلنا چاہتی ہے۔ میری بیوقوفی دیکھئے! اگرچہ میں جانتی تھی کہ میرے خاندان کے قریبی افراد نے کتاب پڑھ لی تو میں بے نقاب ہو جاؤں گی۔ اس کے باوجود میں نے اس حقیقت کی آڑ میں پناہ لی تھی کہ میرے خاندان میں صرف سارہ کو کتابیں پڑھنے کا شوق تھا' لہٰذا میرا خیال تھا کہ اگر اس کتاب کا قصہ شہر میں پھیل بھی گیا تو بھی میرے خاندان والے شاید ہی اس کا نوٹس لیں بشرطیکہ ہماری جوانی کے

حوالے سے کسی خاص واقعے کا تذکرہ نہ کیا جائے۔

اب ستم ظریفی یہ تھی کہ میرے بھائی نے، جسے خواتین کے حقوق کے ذکر سے بھی سخت نفرت تھی وہ کتاب پڑھ لی تھی، جس میں میرے ملک میں عورتوں سے روا رکھی جانے والی زیادتیوں پر توجہ دلائی گئی تھی۔ میرے شیطان صفت بھائی علی نے میرے مخفی تصنیفی کردار کو بے نقاب کر دیا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں اپنے ابو، بہنوں اور بھائی کی طرف یکے بعد دیگرے ایک نظر دیکھا۔ ان سب کی حیرت اور غصے میں ڈوبی ہوئی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئیں تھیں اور وہ مجھے سختی سے گھور رہے تھے۔

صرف ایک ماہ بعد ہی میں رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھی۔

اپنی آواز کو مجتمع کر کے میں نے کمزور سا احتجاج کرتے ہوئے اپنے کرتوت کی ذمہ داری اوپر اعلیٰ ترین ہستی پر ڈال دی جیسا کہ سب اچھے مسلمان کرتے ہیں، جب وہ کسی ایسے فعل کا ارتکاب کر بیٹھیں جس کے لیے وہ سزا کے مستحق ٹھہرتے ہوں۔ میں نے ہاتھ سے کاغذات تھپتھپاتے ہوئے کہا: ''اللہ کی یہی مرضی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ کتاب لکھی جائے۔''

علی نے فوراً ہی مجھے ملامت کرتے ہوئے کہا: ''اللہ؟ نہیں، ایسا نہیں۔ شیطان یہ چاہتا تھا، وہی یہ چاہتا تھا، اللہ نہیں۔'' پھر وہ ابو کی طرف مڑتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے بولا: ''سلطانہ کی پیدائش کے دن سے لے کر اس کے وجود میں ایک شیطان رہ رہا ہے، اسی شیطان نے یہ کتاب لکھوائی ہے۔''

میری بہنیں اپنے ہاتھوں میں تھامے کاغذوں کو جلدی جلدی پلٹنے لگیں تا کہ وہ بذات خود دیکھ سکیں کہ کیا سچ مچ اس میں ہمارے خاندانی راز ظاہر کیے گئے ہیں۔ صرف سارہ تھی جس نے مجھے سہارا دیا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور میرے پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ہاتھ میرے کندھوں پر تھے۔ وہ اپنے ملائم و لطیف لمس کے ساتھ مجھے اپنی حمایت کی یقین دہانی کرا رہی تھی۔

کریم ابتدائی ہیجان کے بعد خاموش تھا۔ وہ کتاب کی ترجمہ شدہ کاپی پڑھ رہا

تھا۔ میں نے اس کی طرف جھک کر دیکھا تو اس نے وہ حصہ کھول رکھا تھا' جس میں ہم دونوں کی ابتدائی ملاقات اور پھر شادی کا ذکر تھا۔ میرا شوہر کریم ساکت بیٹھا با آواز بلند وہ الفاظ پڑھنے لگا جو پہلی مرتبہ اس کی نظر میں آئے تھے۔

والد کی غصے سے بھری آواز مزید اونچی ہوئی۔ میں علی کی جوش بھری نفرت کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ میرے والد اور بھائی دونوں میری بیوقوفی پر حملے کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی سعی کر رہے تھے۔ علی نے غصے میں منہ سے کف اڑاتے ہوئے مجھ پر غداری کا ارتکاب کرنے کا الزام لگایا۔

غداری؟ میں اپنے اللہ' اپنے وطن اور بادشاہ سے بالترتیب محبت کرتی ہوں اس لیے میں جواباً چلا اٹھی: ''نہیں' میں غدار نہیں' صرف چھوٹے دماغ کے لوگ ہی مجھے غدار ٹھہرا سکتے ہیں۔'' جونہی مجھے غصہ آیا میرا ڈر زائل ہونے لگا۔

اس وقت میرے ذہن میں یہ خیال تھا کہ مرد جو میرے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں' اس بات کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ عورتیں اور مرد صرف اسی صورت میں پرامن طریقے سے اکٹھے رہ سکتے ہیں' جب ان میں سے ایک جنس اس قدر طاقتور ہو کہ دوسرے پر مکمل طور پر قابو پا سکے۔ اب ہم سعودی خواتین تعلیم یافتہ ہو رہی ہیں اور اپنی ایک سوچ رکھنے لگی ہیں' لہٰذا ہماری زندگیوں میں آنے والی تبدیلیوں کو کھلے دل سے قبول نہ کیا گیا تو تلخی بڑھے گی اور میں اس صورتحال کے لیے تیار ہوں کیونکہ یہ جھوٹا امن عورتوں کو مزید محکوم بنائے رکھنے کی وجہ بنتا ہے!

میرے خوف نے ابتدا میں میرے ذہن سے یہ بات بھلا دی کہ جین ساسن سے اپنی داستان لکھوانے میں میرا ایک خاص مقصد تھا۔ اس لیے میں نے الزامات کی بارش سے بچنے کے لیے اپنے کان بند کر لیے۔ مجھے اس وقت اپنی دوست نادیہ یاد آئی جو ڈوبنے سے مری تھی اور سمیرا کی دل دہلانے والی قید کا خیال آیا۔ میں نے سوچا کہ ان کی غمناک زندگیوں نے قارئین کے دلوں پر دستک دی؟ ان بدنصیب سہیلیوں کی یاد نے مجھ میں تازہ قوت بھر دی گویا یہ ایک فیصلہ کن گھڑی تھی۔ میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

مجھے محسوس ہوا جیسے مجھ میں اپنے دادا عبدالعزیز کی جنگجو فطرت عود کر آئی ہو۔ بچپن ہی سے میری کیفیت ہے کہ غصے کے وقت یا جب حقیقی خطرے سے نبرد آزما ہوتی ہوں اور کھڑی ہو جاؤں تو مجھ میں ایک تندی و تیزی آ جاتی ہے۔ اس وقت بھی میرے حوصلے نے مجھے نیا ارادہ بخشا۔ میں نے اپنے ماضی میں جھانکا تو مجھے مشفق نوجوان یاد آئے جنہوں نے مجھے بچپن میں کھجور دی تھی۔ وہ میرے چچا اور اس وقت کے بادشاہ فہد بن عبدالعزیز تھے۔ ان کے بارے میں یاد آتے ہی میں چلائی: ''مجھے بادشاہ کے پاس لے جائیں۔'' اس کے ساتھ ہی کمرے میں ہونے والا سارا شور وغل ختم ہو گیا۔ والد نے بے یقینی کے عالم میں میرے الفاظ دہرائے: ''بادشاہ کے پاس لے چلیں۔''

''ہاں! مجھے ان کے پاس لے جائیں تا کہ میں ان کو بتا سکوں کہ میں نے کن وجوہات کی بنا پر یہ کتاب تحریر کی ہے۔ میں ان کو خواتین کی غمناک زندگیوں کے بارے میں بتاؤں گی جن پر وہ حکومت کرتے ہیں۔ میں اعتراف کروں گی مگر صرف بادشاہ کے حضور۔''

☆☆☆

میرے ابو نے اپنے بیٹے علی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ایک دوسرے کو صدمہ بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں جیسے ان کے ذہن پڑھنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں نے برملا کہا: ''آدمی کو معزز ہونا چاہیے مگر بہت زیادہ نہیں۔''

مجھے اس بات کا بخوبی علم تھا کہ ہمارے پیارے بادشاہ فہد بن عبدالعزیز کو محاذ آرائی پسند نہیں ہے اور مجھ سے جو حرکت سرزد ہوئی ہے بے شک وہ اس پر مجھے سزا دیں گے۔ لیکن مجھے اپنے مقصد کو زندہ رکھنے کے لیے سعودی عرب سے باہر کسی کی مدد درکار ہوگی' چنانچہ میں بولی: ''لیکن بادشاہ کے پاس جانے سے مجھے کسی غیر ملکی اخباری نمائندے سے بات کرنی ہوگی تا کہ اسے اپنی شناخت کروا سکوں۔ اگر مجھے سزا ہی دی جانی ہے تو میں ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ دنیا مجھے بھول جائے۔ دنیا والوں کو یہ علم ہونا چاہیے کہ ہمارے ملک میں سچائی افشا کرنے والوں سے کیا سلوک کیا جاتا ہے؟ یہ کہہ کر میں

ٹیلی فون کی طرف بڑھی جو ہال میں دروازے کے پاس ایک چھوٹی میز پر پڑا تھا۔ اس وقت میں ایک بین الاقوامی اخبار کا فون نمبر ذہن میں لانے کی کوشش کر رہی تھی جو میں نے ایسے موقع کے لیے یاد کیا تھا۔ میری بہنیں روتے ہوئے ابو سے کہہ رہی تھیں کہ انہیں چاہیے کہ مجھے اس اقدام سے روک لیں۔ اسی وقت میرا خاوند کریم اچانک اپنی نشست سے اچھلا اور اس نے میرا راستہ روک لیا۔ خشونت زدہ چہرے کے ساتھ اس نے اپنا بازو لہرا کر میری نشست کی طرف اشارہ کیا گویا اس وقت میں درندوں میں گھری ہوئی تھی۔ لیکن میں اپنی جگہ کھڑی رہی اور چلا کر بولی: ''جب خطرناک شکار کو گھیرے میں لے لیا جائے تو شکاری خطرے میں ہوتا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میرے دماغ میں یہ خیال آیا کہ اپنا سر کریم کے پیٹ میں دے ماروں۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک میری سب سے بڑی بہن نورہ بول پڑی: ''بہت ہو چکا' سب خاموش ہو جائیں۔ مسئلہ حل کرنے کا یہ کوئی طریقہ نہیں۔'' اس نے ابو اور بھائی علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''یہ سارا شور شرابا' نوکر ایک ایک لفظ سنیں گے اور پھر ہم سب حقیقتاً مشکل سے دوچار ہو جائیں گے۔'' نورہ ہم دس بہنوں میں واحد بچی ہے جسے ابو کی شفقت اور محبت حاصل ہے۔ ابو نے سب کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

کریم نے میرا بازو پکڑا اور میری نشست تک لے گیا۔ ہم دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ابو اور بھائی علی دونوں اس دوران بے حس و حرکت کھڑے رہے۔

میٹنگ جاری رہی' اب سنجیدگی سے یہ سوچا جا رہا تھا کہ میری شناخت کو کس طرح چھپایا جائے۔ اس بات پر سب متفق تھے کہ ملک بھر میں یہ خیال آرائی ہو گی کہ اس کتاب کی شہزادی کون ہے؟ اس پر بھی اتفاق تھا کہ سعودی عرب کے عام شہری کو حقیقت کا علم ہونا ناممکنات میں سے ہے کیونکہ وہ ہمارے خاندانی حلقے سے باہر ہے اور آل سعود جو کہ ایک بہت بڑا خاندان ہے کے مردوں کو بھی اس امر کا پتا نہیں چل سکے گا کیونکہ خاندانِ سعود کی عورتوں کی سرگرمیاں مردوں کی نظروں میں ہرگز نہیں آتیں۔ ابو نے کہا کہ نزدیکی رشتے دار خواتین کے آگاہ ہونے کا خدشہ ضرور ہے کیونکہ وہ ہماری

اندرونی تقریبات میں کبھی کبھار شرکت کرتی رہتی ہیں۔

اس وقت سب کو حقیقی تشویش لاحق ہوئی جب طاہانی کو یاد آیا کہ ایک ایسی ادھیڑ عمر خالہ ابھی زندہ ہیں جو قربت کی وجہ سے سارہ کی شادی اور طلاق کے المیہ سے آگاہ ہیں۔ مگر نورہ نے یہ بتا کر اس خدشے کو دور کر دیا کہ خالہ ایک ذہنی مریضہ ہے۔ اگر اتفاق سے بڑھیا نے کتاب کے بارے میں سن بھی لیا ہو تو اس عمر میں ان کی کہی ہوئی کسی بات میں اتنا وزن نہیں ہو گا کہ ان کا خاندان اسے سنجیدگی سے لے۔

اس پر سب نے سکھ کا سانس لیا۔

مجھے اس بوڑھی عورت کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ وہ ایک ایسا کردار تھا جسے بھلایا جا چکا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا تھا کہ وہ خواتین کی آزادی کے لیے میری جدوجہد کی بھرپور حمایت کرتی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ سہاگ رات کو میں نے اپنے ہونے والے شوہر کو یہ بتا کر چونکا دیا تھا کہ وہ بھیڑوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی اپنے پاس رکھے گی کیونکہ اسے گنتی زبانی آتی ہے جبکہ اس کے خاوند کو اس مقصد کے لیے ریت میں لکیریں ڈالنی پڑتی تھیں۔ پھر تو اس کا خاوند بندۂ بے دام بن گیا اور اس نے زندگی بھر دوسری بیوی لانے کا بھی نہیں سوچا۔ وہ اکثر کہتا تھا کہ میری یہ ایک بیوی اس کے لیے کئی بیویوں کا درجہ رکھتی ہے۔ خالہ نے اپنے پوپلے منہ سے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ مرد کو قابو میں رکھنے کا راز عورت کی اس صلاحیت میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے چرمی ڈنڈے کو سخت اور تیار رکھے۔ میں اس وقت ایک نابالغ لڑکی تھی اور ''چرمی ڈنڈا'' کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ لیکن جب میں بالغ ہوئی تو مجھے اس ''چرمی ڈنڈا'' کے بارے میں معلوم ہوا تو میں اکثر خالہ کی اس بات پر دل ہی دل میں مسکرا دیتی تھی اور سوچتی تھی کہ ان دونوں میاں بیوی کی شہوانی مشغولیت سے ان کا خیمہ کس قدر ہلتا ہو گا۔

خالہ کا خاوند مر گیا تھا اور اس نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ وہ مجھے والہانہ پیار کرنے کی وجہ سے بہت یاد آتا ہے۔ اس کی تڑپا دینے والی یاد نے خالہ کو

دوسری شادی سے باز رکھا تھا۔ بہت دیر تک میرے خاندان والے ترجمہ شدہ کتاب کے ورق کو الٹتے پلٹتے رہے تاکہ یہ اطمینان کر سکیں کہ اپنے قریبی خاندان کا یا اس سے باہر کا کوئی فرد تو ان خاندانی ڈراموں اور جھگڑوں سے آگاہ تو نہیں، جو اس کتاب میں بیان کیے گئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان کے چہروں پر سکون چھایا ہوا تھا۔ یہی نہیں ان کے رویے سے میرے لیے ہلکی سی تعریف کا اظہار بھی ہوتا تھا کہ میں نے کتاب میں وہ تمام باتیں بدل دی تھیں جنہیں پڑھ کر حکام براہ راست ہمارے دروازے تک آ پہنچتے۔

ابو اور بھائی علی نے میری بہنوں کو سختی سے منع کیا کہ وہ اس اجلاس کی کارروائی کے متعلق اپنے خاوندوں کو کچھ نہ بتائیں۔ کیا پتا کون سا خاوند اپنی بہن یا ماں تک پہنچا دے؟ میری بہنوں کو تاکید کی گئی کہ وہ اپنے گھر میں صرف یہ کہیں کہ یہ اجلاس صرف ذاتی نسوانی معاملات کے بارے میں تھا جو ان کے خاوندوں کے لیے توجہ طلب نہیں تھے۔

ابو نے مجھے سختی سے حکم دیا کہ میں باہر اپنے ''جرم'' کا اعلان نہ کرتی پھروں۔ یہ حقیقت کہ کتاب میری زندگی کی کہانی بیان کرتی ہے، اپنے خاندان کے اندر چھپی رہنی چاہیے۔ ابو نے مجھے خبردار کیا کہ اگر حقیقت کھل گئی تو نہ صرف مجھے سنگین نتائج بھگتنے پڑیں گے، جو گھر میں نظر بندی یا قید کی شکل میں ہوں گے، نیز میرے بیٹے عبداللہ سمیت خاندان کے افراد بھی سعودی معاشرے کی ملامت کا نشانہ بنیں گے جہاں مرد کی اس اہلیت سے زیادہ کسی چیز کی اہمیت نہیں کہ وہ اپنی عورتوں کو دبا کر رکھے۔

ابو کا فرمان سن کر میں نے فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نظریں جھکا لیں اور ان کے حکم کی پابندی کا وعدہ کیا۔ میں دلی طور پر خوش تھی کیونکہ اس رات مجھ پر افشا ہوا تھا کہ میرے خاندان کے افراد مجھ سے ایک زنجیر کی طرح منسلک ہیں اور ان کے حاکمانہ کردار سے یقیناً انہیں بھی اتنا ہی نقصان پہنچ سکتا ہے جتنا کہ مجھے۔

جب میں نے اپنے ابو اور بھائی کو شب بخیر کہا، میں سوچ رہی تھی کامل اقتدار اس شخص کے ہاتھ کو زہر آلود کر دیتا ہے جو اسے اپنی تحویل میں لے۔ میرے خاندان

والے مجھے سزا نہیں دے سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں ان کی اپنی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی۔ میرے گرم خون نے علی کی ساری امیدیں خاک میں ملا دی تھیں' لہٰذا رخصت ہوتے وقت وہ سخت ناخوش اور غصے میں تھا۔ اسے خوشی ہوتی اگر مجھے گھر میں نظر بند کر دیا جاتا۔ اس کے مردانہ پندار کو جو ٹھیس پہنچی تھی وہ اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔ میں نے اسے گرم جوشی سے رخصت کرتے ہوئے اس کے کان میں کہا: ''علی! تمہیں اس حقیقت کا بخوبی علم ہونا چاہیے کہ کسی کو بھی زنجیریں پہنا کر اطاعت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔'' یہ میری بڑی کامیابی تھی!

جب ہم میاں بیوی اپنی گاڑی میں گھر کی طرف جا رہے تھے تو کریم سخت غصے میں تھا۔ وہ ٹینشن کی حالت میں سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس نے اس دوران فلپائنی ڈرائیور کو تین مرتبہ ڈانٹا کہ وہ گاڑی تیز نہیں چلا رہا ہے۔ میں نے کار کے شیشے سے لگ کر جاننا چاہا کہ ہم ریاض کی کس سڑک سے گزر رہے ہیں مگر اندازہ نہ ہوا۔ میں نے کریم کی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر اپنے آپ کو ''دوسری جنگ'' کے لیے تیار کر لیا تھا کیونکہ میں سمجھتی تھی کہ اب کریم کے غصے سے بچ نہیں سکتی۔

خوابگاہ کی چٹخنی چڑھا کر کریم کتاب کے صفحات پلٹنے لگا۔ اس نے وہ پیراگراف اونچی آواز سے پڑھنے شروع کر دیئے جو اس کے لیے سب سے زیادہ اہانت آمیز تھے۔

''اس کا ظاہر لطیف اور محبت آمیز تھا مگر باطن مکاری اور خودغرضی سے عبارت تھا۔ مجھے یہ جان کر اس سے گھن آنے لگی کہ وہ ایک مکروہ صفت آدمی ہے جس کی کسی طور تعریف نہیں کی جا سکتی۔''

میرے دل میں ہمدردی کی کرن ابھری۔ میں نے سوچا کہ کون ایسا شخص ہو گا جس کے کمزور ترین پہلو یوں سب کے سامنے کھولے جائیں اور اسے درد محسوس نہ ہو پھر میں نے کوشش کر کے اپنے شوہر کی وہ سرگرمیاں یاد کیں جنہوں نے مجھے تکلیف و غم سے دوچار کیا تھا اور جو کتاب میں کھول کر بیان کی گئی تھیں۔

اب میں اس شش و پنج میں تھی کہ میں اس موقع پر ہنس پڑوں یا چیخ اٹھوں۔

کریم نے کتاب کے مندرجات پڑھتے ہوئے ایسی مبالغہ آرائی کی کہ میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ پاؤں زمین پر مار کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر پڑھ رہا تھا۔ مجھے اپنی بہن سارہ کے گھر میں کچھ روز پہلے دیکھا ہوا پتلی تماشا یاد آ گیا۔ یہ ایک دلچسپ اور شوخ تماشا تھا۔ اس تماشے میں پتلیوں نے مکمل سعودی لباس پہن رکھے تھے۔ میں نے ذرا غور کیا تو کریم مجھے عالم عرب کے افسانوی کردار ''جہا'' جیسا لگا' جو کھیل میں اپنی حماقتوں کی وجہ سے مشکل صورتحال سے بچ نکلتا تھا۔

ہنسی روکنے کی وجہ سے میرے ہونٹ لرز رہے تھے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کریم کسی بھی وقت زمین پر گر پڑے گا اور بچوں کی طرح حرکتیں کرنے لگے گا۔ اب وہ پڑھ رہا تھا۔

اس نے قسم کھائی' شرم سے اس کا منہ سرخ ہو گیا۔ میں نے سوچا شاید وہ اپنی بیوی کو قابو کرنے میں ناکام ہونے پر غصے میں جل بھن رہا ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ کریم نگاہیں اٹھا کر مجھے نفرت سے دیکھا اور کہا: ''سلطانہ تم مسکرانے کی جرأت نہ کرو میں حقیقتاً ناراض ہوں۔''

مختلف جذباتی کیفیتوں میں' میں نے شانے اچکائے اور کہا: ''کیا تم اس سے انکار کرتے ہو جو کچھ پڑھ رہے ہو؟''

میرے الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے کریم بیوقوفوں کی مانند ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے بارے میں تحقیر آمیز فقرات پڑھتا رہا۔ مجھے اس کے وہ مخصوص رویے یاد آ رہے تھے جن کی بنا پر میں اس کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

اس دفعہ اس نے تقریباً چلاتے ہوئے پڑھا: ''میری کتنی خواہش تھی کہ میں ایک جنگجو سے شادی کروں' وہ ایک ایسا مرد ہو جو صداقت شعاری کے گرم شعلے کو اپنی زندگی کا رہنما بنا لے۔''

کریم کا غصہ لحظہ بہ لحظہ بڑھ رہا تھا۔ اس نے اپنی انگلی ان الفاظ پر رکھ دی جو

اس کے خیال کے مطابق سب سے زیادہ اہانت آمیز تھے اور کتاب میری ناک کے نیچے لے آیا۔

''چھ سال پہلے اسے (سلطانہ کو) ایک جنسی بیماری ہوگئی' بڑی مشکل سے کریم یہ مانا کہ وہ ہر ہفتے اجنبی عورتوں کے ساتھ مباشرت کرتا ہے۔ بیماری کے خطرے کو مدنظر رکھ کر کریم نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے اس ہفتہ واری مشغلے سے باز رہے گا لیکن سلطانہ کہتی ہے کہ جب بھی کریم کو عیاشی کرنے کا موقع میسر آیا اس نے موقع سے خوب فائدہ اٹھایا۔ وہ بغیر کسی شرمندگی کے اس بدکاری میں ملوث ہوتا ہے۔ ان دونوں کی آپس کی محبت خواب و خیال ہوگئی۔ سلطانہ کہتی ہے وہ اپنے شوہر کا ساتھ نہیں چھوڑے گی اور اپنی بیٹیوں کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھے گی۔''

کریم اس انکشاف سے اتنا زیادہ خفا ہوا تھا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ چلانے لگے گا۔ میرے شوہر نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے ''گھر کی جنت کو زہر آلود کرنے'' کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ ہماری زندگی مکمل اور مثالی ہے۔''

میں مانتی ہوں کہ گزرے سال کے دوران مجھے کریم کی پہلی سی محبت اور اعتماد پھر سے مل گیا ہے لیکن اس طرح کے لمحوں میں ہمارے خاندان کے مردوں کی بزدلی پر ان کا غصہ حاوی ہو جاتا ہے۔ میں کریم کے رویے سے یہ بات سمجھ چکی ہوں کہ وہ ان وجوہات پر کوئی توجہ نہیں دیتا جن کی وجہ سے میں نے اپنی خانگی خوشیوں کو داؤ پر لگا کر اپنی زندگی کے واقعات ظاہر کیے ہیں اور نہ ہی وہ سخت دل ملک میں ہونے والے نوجوان اور معصوم عورتوں کے زندہ درگور کیے جانے والے حالات و واقعات کو خاطر میں لاتا ہے۔ اسے فکر تو اس بات کی ہے کہ میری کتاب میں اس کے کرتوتوں کے بیان سے اس کی شخصیت کے بارے میں کیا تاثر ابھرتا ہے۔

میں نے اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ آل سعود کے مرد ہی ہیں جو اس قدر اختیارات کے مالک ہیں کہ ملک میں کوئی تبدیلی لا سکتے ہیں۔ جب اس نے میری تجویز کا کوئی جواب نہ دیا تو میں سمجھ گئی کہ آل سعود کے مردوں کو عورتوں کی خاطر اپنے

اختیارات سے محروم ہونے کے لیے کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں ہے اور وہ سعودی تاج کی محبت میں بری طرح مبتلا ہیں۔

جب میں نے کریم کو بتایا اور یقین دلایا کہ مصنفہ جین ساسن کے سوا خاندان سے باہر کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون ہے تو اس کی ناراضی دور ہوگئی۔ میں نے یہ بھی کہا کہ خاندان کے لوگ اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں سے اچھی طرح واقف ہیں اور کتاب نہ بھی چھپتی تو بھی وہ سب باتیں جانتے ہیں۔

کریم میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی انگلیوں سے میری ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور خوفناک لہجے میں پوچھا: ''تم نے جین ساسن کو میری اس بیماری کے بارے میں بتا دیا' جو مجھے لاحق ہوئی تھی؟ میں شرم سے زمین میں گڑ گئی جب اس نے اپنے سر کو دائیں بائیں ہلاتے ہوئے کہا: ''سلطانہ تمہارے نزدیک کسی چیز کو تقدس حاصل نہیں۔'' اس وقت کریم ظاہری طور پر اپنی بیوی سے مکمل مایوس نظر آ رہا تھا۔ کئی گھریلو لڑائیوں کا خاتمہ ایک دوسرے کی خیر خواہی پر ہوتا ہے۔ اس شام ہم نے توقع سے بڑھ کر عملی محبت کا مظاہرہ کیا۔ کریم نے حیرت انگیز طور پر کہا کہ اس نے پہلے کبھی مجھے آج سے زیادہ محبت نہیں کی۔ میرے شوہر نے کچھ اس والہانہ انداز سے مجھے پیار کیا کہ میں کیف اور مسرت سے بھرپور جذبوں سے لبریز ہوگئی۔ اس نے مجھ میں پھر سے وہ خواہش جگا دی جس کے متعلق میں یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ وہ مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ مجھے اپنی صلاحیت پر حیرانی تھی کہ میں کس طرح ایک ہی شخص سے محبت اور نفرت دونوں کا اظہار کر سکتی ہوں۔

کریم کے سونے کے بعد میں ایک ایک کر کے دن بھر کے واقعات کو اپنے ذہن میں لاتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے اس شام میرے خاندان نے تحفظ کی ضمانت دی تھی (صرف اس لیے کہ وہ خود بھی شاہی غضب سے بچے رہیں) اور میری شادی کی تجدید ہوئی تھی۔ مگر میں اس وقت تک پرسکون نہیں ہو سکتی تھی جب تک اپنے پیارے ملک میں جن عورتوں سے مجھے ہمدردی تھی ان کے لیے حقیقی معاشرتی تحفظات کا اہتمام نہ ہو جاتا۔ خواتین کی زندگیوں کی مشکل ضروریات مجھے ان کی شخصی آزادی کے

حصول کے لیے کوششیں جاری رکھنے پر مجبور کر رہی تھیں۔

میں نے اپنے آپ سے سوال کیا: ''کیا میں دو لڑکیوں کی ماں نہیں ہوں؟ کیا میرا فرض نہیں کہ میں اپنی بیٹیوں اور ان کی بیٹیوں کے لیے معاشرتی تبدیلیاں لانے کی جدوجہد کروں؟'' میں مسکرائی اور ایک بار پھر خیالوں میں پتلیوں کا تماشا دیکھنے میں مصروف ہوگئی جو میں نے سارہ کے چھوٹے بچوں کے ساتھ دیکھا تھا' مجھے ذہین اور مجسم تمسخر ''جہا'' کے الفاظ یاد آئے ''کیا وفادار سلوقی (خاکستری شکاری کتا) اپنے آقا کے دفاع میں بھونکنا چھوڑ دے گا' جب اس کے آگے ایک ہڈی پھینک دی جائے؟''

میں پکار اٹھی: ''نہیں!''

کریم کے جسم نے حرکت کی تو میں اس کی پشت سہلانے اور میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرنے لگی اور ان کے سحر سے وہ پھر نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے سابقہ وعدوں کے برعکس' جو میں نے گرفتاری کی دھمکیوں کی وجہ سے کیے تھے۔ مجھے جب بھی ملک سے باہر سفر کرنے کا موقع ملا میں جین ساسن سے رابطہ کروں گی۔ کیونکہ ابھی میرا مشن مکمل نہیں ہوا۔ میں جانتی تھی کہ میں ایک بار پھر خطرے کی حدود میں قدم رکھ رہی ہوں اور میری سزا حتیٰ کہ میری ممکنہ موت بڑی ظالمانہ ہوگی۔ مگر ناکامی تلخ تر ہوگی کیونکہ ناکامی کا امکان ہمیشہ رہتا ہے.....!

جن ہستیوں سے کریم اور میں محبت کرتے ہیں وہ ہمارے لیے تکلیف کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا بیٹا عبداللہ ہمارے لیے باعث تکلیف ہے ہماری بڑی بیٹی مہا ہمیں مختلف ڈرامے کر کے ڈراتی ہے اور چھوٹی بیٹی کا بھی یہی حال ہے۔

مجھے قسمت کی پیش بینی کا کوئی خیال نہیں تھا۔ جب ہمارے اکلوتے بیٹے عبداللہ نے بچکانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں بتایا کہ اس نے فٹبال کے میدان میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے' کریم اور مجھے یہ خوشخبری سن کر بہت خوشی ہوئی۔ اس کی یہ کامیابی اس کے ایتھلیٹ باپ کے لیے خاص طور پر باعث مسرت تھی۔ جب ہم فخر کے احساس کے ساتھ اس کی کامرانی کی روداد سن رہے تھے' ہم نے اس کی دونوں چھوٹی

بہنوں پر کوئی دھیان نہ دیا جو ایک ویڈیو گیم سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ جب اچانک ہماری چھوٹی بیٹی امانی زور زور سے چیخنے لگی تب ہم پر یہ خوفناک انکشاف ہوا کہ عبداللہ کے کپڑوں میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آناً فاناً ہمارا بیٹا شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔

کریم نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے عبداللہ کو فرش پر دھکیل دیا اور اس پر ایک ایرانی غالیچہ لپیٹ کر آگ بجھا دی۔ جب ہمیں یقین ہو گیا کہ ہمارا بیٹا محفوظ رہا ہے تو کریم نے آگ لگنے کا سبب دریافت کرنے کی کوشش کی۔ ادھر میں چلا اٹھی کہ آگ بدنظری سے لگی ہے کیونکہ ہم اپنے خوبصورت اور لائق فائق بیٹے پر اظہار فخر کر رہے تھے۔ پھر میں اپنے آنسو پونچھتی ہوئی اپنی بیٹیوں کو دلاسا دینے لگی۔ بے چاری ننھی امانی سسکیاں بھر رہی تھی۔ اسے اپنی گود میں تھامتے ہوئے میں نے دوسرے ہاتھ سے مہا کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ پھر اچانک میں خوف سے پیچھے ہٹ گئی کیونکہ مہا کا چہرہ غصے اور نفرت کا خوفناک اظہار کر رہا تھا۔

اس پریشان کن حادثے کی تفتیش کی تو اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ مہا نے اپنے بھائی کے کپڑوں کو آگ لگائی تھی۔

''مہا'' کا مطلب ہے ''ہرنی'' مگر اس نے اپنے شریفانہ نام کی لاج نہیں رکھی تھی۔ شیطانی قوت تیزی سے اس کے بدن میں سما چکی تھی۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ نیکی اور بدی کی روحوں نے مہا کے سر پر میدان جنگ بنا رکھا ہے اور بدروحیں اکثر نیک روحوں پر غلبہ پا لیتی ہیں۔ شاہی آن بان کی زندگی اور مخلص خاندان کی غیر مشروط محبت میں سے کوئی بھی مہا کی روح کو آسودگی نہیں پہنچا سکی تھی۔ بغیر کسی جواز کے اس نے اپنے بھائی اور بہن کو بارہا اذیتوں سے دوچار کیا تھا۔ شاید ہی کسی بچے نے ایک خاندان کے لیے اتنے بحران پیدا کیے ہوں جتنے مہا نے تخلیق کیے تھے۔

ظاہری طور پر مہا حیرت انگیز حد تک پرکشش لڑکی تھی مگر اس کی شخصیت میں خوفناک پھسلاوا تھا۔ وہ ہسپانوی رقاصہ کی سی نگاہیں رکھتی تھی، اس کی آنکھیں اور بال غضب کے تھے، اس وفور حسن کے ساتھ وہ غیر معمولی دماغ سے بھی بہرہ ور تھی۔ اس کے

پیدا ہوتے ہی مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ ہماری بیٹی کو خوب خوب نوازا گیا ہے مگر وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کو کسی ایک سمت میں مثبت طور پر استعمال کرنے میں ناکام رہی تھی۔ برسوں کے دوران میں نے دیکھا تھا کہ اس نے سو کے لگ بھگ خوش آئند منصوبے شروع کیے مگر کسی کو مکمل نہیں کر سکی۔

کریم نے ایک بار کہا تھا کہ ہماری بیٹی شاندار بکھرے ہوئے اجزاء کا مجموعہ ہے اور وہ اپنی زندگی میں اپنے کسی ایک تصور کو بھی عملی جامہ نہیں پہنا سکے گی۔ میری سب سے بڑی تشویش یہ تھی کہ مہا ایک انقلابی تھی جو کسی مقصد کی تلاش میں تھی۔ چونکہ میری شخصیت بھی ایسی ہی تھی' اس لیے مجھے اس کے پرفریب کردار سے جنم لینے والی مشکلات کا بخوبی احساس تھا۔ اس کی ابتدائی زندگی میں یہ مشکلات معمولی لگتی تھیں۔ مہا کی محبت نے اس کے باپ کو الجھاؤ میں ڈال دیا۔ اس کے احساسات کی شدت عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔

کریم اپنی دونوں بیٹیوں سے اسی طرح محبت کرتا تھا جس طرح اپنے بیٹے عبداللہ سے کرتا تھا اور اس آزردگی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا جس کا سامنا بچپن میں مجھے کرنا پڑا تھا' تاہم معاشرے کی ساخت ایسی تھی کہ گھر سے باہر عبداللہ اپنے والد کی زندگی میں اس کے بہت قریب ہوتا چلا گیا۔ اس بنیادی رویے سے مہا پہلے صدمے سے دوچار ہوئی۔

باپ کی بیٹے سے محبت پر مہا کا شدید حسد مجھے اپنے غمناک بچپن کی یاد دلاتا تھا۔ ایک نوجوان لڑکی جو سخت سماجی نظام کے تحت' جس میں وہ پیدا ہوئی تھی' بے بسی سے پیچ و تاب کھاتی تھی۔ اس وجہ سے میں اپنی بچی کی بے اطمینانی کی سنگینی کو سمجھنے میں ناکام رہی۔

جب مہا نے عبداللہ کے کپڑوں کو آگ لگا دی' اس کے بعد ہی ہمیں معلوم ہوا کہ اس کا کریم سے لگاؤ عام دخترانہ محبت سے کہیں آگے چلا گیا تھا۔ مہا دس برس کی تھی' عبداللہ بارہ سال کا تھا اور امانی صرف ساتھ سال کی تھی لیکن اس نے اپنی بڑی بہن کو

چپکے سے گیم چھوڑ کر اپنے ابو کا لائٹر لاتے اور عبداللہ کی عبا کے حاشیے کو آگ لگاتے دیکھ لیا تھا۔ اگر امانی چیخ کر ہمیں متنبہ نہ کرتی تو ہوسکتا کہ عبداللہ شدید طور پر جل جاتا۔

دوسرا المناک واقعہ اس وقت رونما ہوا جب مہا گیارہ سال کی تھی۔ موسم گرما کا گرم ترین مہینہ اگست تھا۔ ہمارا خاندان ریاض کے گرم صحرائی شہر سے نکل کر طائف کے خنک پہاڑی شہر میں میری بہن نورہ کے گرمائی محل میں چلا آیا تھا۔ یہ تقریباً دس سال میں پہلا واقعہ تھا کہ میرے ابو نے اپنی پہلی بیوی کی اولاد کے ایک خاندانی اجتماع میں شرکت کی تھی اور ان کی توجہ اپنے نواسوں پر مرکوز تھی۔ انہوں نے عبداللہ کے قد اور شخصیت کی تعریف کرتے ہوئے مہا کو نظر انداز کر دیا جو اپنے نانا کو وہ چیونٹی گھر دکھانے کے لیے اپنی آستین چڑھائے ہوئے تھی جو بچوں نے بنایا اور بڑے فخر سے سجایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ میرے ابو نے مہا کو ایک طرف کر دیا اور عبداللہ کے فربہ اعضاء کی داد دینے آگے بڑھ گئے۔

یہ دیکھ کر مہا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ میں اس کے درد کو محسوس کر سکتی تھی جو مہا کے قلب میں اٹھا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ مہا کوئی بھی مسئلہ کھڑا کر سکتی ہے' میں چل کر اس کے پاس گئی اور اسے پرسکون کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت وہ سخت جلال میں آ گئی تھی اور اپنے نانا کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کر رہی تھی۔ اس سے خاندانی اجتماع کی فضا یکسر بدل گئی۔ اگرچہ مہا کی توہین ہوئی تھی' تاہم میرے ذہن میں فوری خیال آیا کہ اس نے اپنا صریح مطالبہ میرے والد پر واضح کر دیا ہے۔

ابو جو جنسِ لطیف کے بارے میں کبھی اچھی رائے نہیں رکھتے تھے' اپنے احساسات چھپانے کے روادار نہ تھے۔ انہوں نے نفرت انگیز طور پر حکم دیا: ''اس مکروہ مخلوق کو میری نظروں سے دور لے جاؤ۔''

میں نے صاف دیکھا کہ میری بیٹی نے میرے ابو میں وہ نفرت جگا دی تھی جو وہ میرے لیے رکھتے تھے۔ ان کی آنکھیں برما دینے والی تھیں اور ان کے ہونٹ نفرت سے بھنچے ہوئے تھے۔ وہ کبھی اپنی بیٹی کو دیکھتے تھے اور کبھی اپنی نواسی کو۔

میں نے انہیں یہ کہتے سنا:

''ایک چوہیا' چوہیا ہی کو جنم دیتی ہے۔''

پلک جھپکنے میں کریم' مہا کو پکڑ کر کوسنے دیتے اور پیچ و تاب کھاتے ہوئے اسے ابو کی نظروں سے پرے محل کے اندر لے گیا تاکہ اس کا منہ صابن سے دھو سکے۔ مہا کی گھٹی گھٹی چیخیں باغ میں سنائی دے رہی تھیں۔ میری ابو جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئے مگر جاتے ہوئے پورے خاندان کے سامنے یہ اعلان کر گئے کہ میری بیٹیوں کی رگوں میں میرا منحوس خون دوڑ رہا ہے۔ ادھر ننھی امانی جو ایسے الزامات سن کر بڑی حساس ہو جاتی ہے' ہسٹریائی انداز میں چیخنے لگی۔ اپنے مزاج کے طابع ابو نے میری دونوں بیٹیوں کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔

طائف کے اس واقعے کے کچھ عرصہ بعد اس کا مزاج ٹھنڈا اور غصہ فرو ہو گیا۔ مزید براں کریم اور میں نے اپنی بیٹیوں کو یقین دلانے کی کوششیں تیز کر دیں کہ ہم ان سے ویسی ہی محبت کرتے ہیں جیسی بیٹے سے۔ جہاں ہمارے گھر میں اس کے مثبت نتائج نکلے' مہا اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکی کہ گھر کی چار دیواری سے باہر دنیا والے اسے اس کے بھائی سے کمتر خیال کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں بیشتر گھرانوں کی روش یہی ہے کہ وہ اولاد نرینہ کے سر پر تو محبت و شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہیں اور لڑکیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔

مہا ایک روشن خیال لڑکی تھی جسے دھوکا دینا مشکل تھا اور عرب کے ناقابل مصالحت حقائق اس کے شعور میں سلگتے رہے تھے۔ مجھے شدت سے یہ احساس تھا کہ مہا ایک آتش فشاں ہے جو کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ اپنی سب سے مشکل بچی کی مدد کیسے کروں!

خلیجی جنگ کے دوران میں صرف پندرہ سال کی تھی۔ وہ دن کوئی سعودی نہیں بھلا سکتا۔ فضا میں تبدیلی کے آثار عیاں تھے۔ ملک کی کئی تعلیم یافتہ خواتین سماجی پابندیوں کے خلاف اٹھ کھڑی ہونے کی خواہاں تھیں۔ میں خود بھی ان میں شامل تھی مگر میں اندازہ نہ

کرسکی کہ میری بڑی بیٹی اپنی ایک نوخیز سہیلی کے ساتھ مل کر اس میدان میں بہت آگے بڑھ چکی ہے۔

پہلی بار جب میں عائشہ سے ملی تو مجھے افسوس ہوا۔ اس وجہ سے نہیں کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے نہ تھا۔ وہ ایک معروف سعودی فیملی سے تعلق رکھتی تھی جس نے ملک میں غیر ملکی کمپنیوں کے لیے فرنیچر کی درآمد سے خوب دولت کمائی تھی۔ میرے لیے تشویش کی بات یہ تھی کہ عائشہ اپنی سترہ سالہ عمر سے بہت آگے اور کہیں زیادہ بالغ نظر تھی اور اس کے سخت کوش طور طریقوں سے مجھے خطرے کی بو محسوس ہوتی تھی۔ عائشہ اور مہا ایک دوسری سے بہت محبت کرتی تھیں۔ عائشہ گھنٹوں ہمارے گھر رہتی۔ ایک سعودی لڑکی کی حیثیت سے اسے غیر معمولی آزادی حاصل تھی۔ میں نے اسے کریدا تو معلوم ہوا کہ گھر میں والدین اسے نظر انداز کرتے ہیں اور انہیں اس بات کی بھی کوئی پروا نہیں تھی کہ ان کی بیٹی کے شب و روز کیسے گزرتے ہیں؟

عائشہ گیارہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اور اس کی ماں اس کے والد کی واحد قانونی بیوی تھی۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ایک اعصاب شکن مسئلہ میں الجھی ہوئی تھی۔ اس کا خاوند متعہ یعنی عارضی شادی کی رسم پر عمل پیرا تھا جسے عربوں میں کم ہی اپنایا جاتا ہے۔ متعہ ایک گھنٹے سے لے کر ننانوے سال تک چل سکتا ہے۔ جب ایک مرد عورت کو اشارہ کردے کہ متعہ کی مدت ختم ہو چکی تو دونوں باقاعدہ طلاق کے بغیر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔

سنی مسلمان ہونے کی بنا پر عائشہ کی ماں اپنے بدکردار خاوند کی اس روش پر شدید احتجاج کرتی تھی کہ وہ ایک رات یا ایک ہفتے کی دلہنوں کو گھر لے آتا ہے۔ ظاہر ہے سنی ہونے کے باوجود وہ ایسا محض عیاشی کے لیے کرتا تھا۔

چند برس پہلے لندن میں، بحرین سے تعلق رکھنے والی ایک شیعہ عورت سے سارہ کی دوستی ہوگئی تھی اور اسی سے میں نے متعہ کی ناشائستہ رسم کے بارے میں سنا تھا۔ اب میں نے عائشہ سے بات کی تو اندازہ ہوا کہ اس کا والد باقاعدہ چار بیویوں اور ان

کے بچوں کی ذمہ داری اٹھانا نہیں چاہتا۔ لہٰذا وہ اپنے ایک بااعتماد آدمی کو سعودی عرب کے اندر اور باہر شیعی علاقوں میں بھیجتا رہتا ہے تاکہ وہ بھوک کے ہاتھوں شکست کھائے ہوئے گھرانوں کی لڑکیاں متعہ کے لیے لے آئے۔ ایسا اس شخص سے باآسانی ہو جاتا ہے جس کی چار بیویاں اور کئی لڑکیاں ہوں اور آمدنی کے ذرائع محدود ہوں۔

عائشہ کبھی کبھی ایسی لڑکیوں سے دوستی کر لیتی تھی جو چند راتوں کے متعہ کے لیے اس کے باپ کے پاس لائی جاتی تھیں۔ جب اس کے باپ کی ہوس پوری ہو جاتی تو نوجوان دلہنوں کو واپس بھیج دیا جاتا۔ وہ سونے کے زیورات سے لدی اور نقدی سے بھری تھیلیاں لیے لوٹ جاتی تھیں۔ عائشہ کے بقول انہیں بظاہر معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے ساتھ دراصل کیا ہو رہا ہے۔ وہ بس یہ جانتی تھیں کہ عائشہ کا باپ ان سے بڑی تکلیف دہ حرکات کرتا ہے۔ وہ تمام لڑکیاں روتی پیٹتی تھیں کہ انہیں ان کی ماؤں کے پاس واپس بھیج دیا جائے۔

اپنے آپ پر ضبط رکھنے والی عائشہ اس وقت رو رہی تھی، جب اس نے ریما کی داستانِ غم سنائی۔ ریما تیرہ سالہ لڑکی تھی جسے یمن سے سعودی عرب لایا گیا تھا۔ یمن میں شیعہ مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے۔ عائشہ کا کہنا تھا کہ ریما اتنی خوبصورت تھی جتنی کہ ایک سفید ہرنی۔ جس کے نام پر اس کا نام رکھا گیا تھا اور وہ اتنی میٹھی اور پیاری تھی جتنی کہ کوئی بھی لڑکی ہو سکتی ہے۔ اس کے باپ کی ایک بیوی مگر تیئیس بچے تھے جن میں سترہ لڑکیاں تھیں۔ اگرچہ ریما کی ماں کی کمر اب بچے پیدا کر کر کے جھک گئی تھی مگر وہ بھی کبھی ایک خوبصورت لڑکی تھی۔ جس نے سترہ خوبصورت بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ ریما نے فخر سے بتایا تھا کہ اس کا خاندان حسن و جمال میں دارالحکومت صنعا تک مشہور ہے۔ ریما کا گھرانہ نہایت غریب تھا۔ ان کے پاس فقط تین اونٹ اور بائیس بھیڑیں تھیں۔ ستم یہ کہ اس کے چھ بھائیوں میں سے دو جسمانی طور پر معذور تھے۔ ایک کی ٹانگیں مڑی ہوئی تھیں اور وہ چل نہیں سکتا تھا اور دوسرے کو تشنج کے دورے پڑتے تھے اور وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر ریما کا باپ اپنی بیٹیوں کو یکے بعد دیگرے بیچتا رہا۔

عیاش امیران کی اچھی خاصی بولی لگاتے تھے۔ گرمیوں کے مہینوں میں یہ گھرانہ پہاڑی دروں سے گزر کر شہر میں داخل ہوتا اور جو لڑکی شادی کے قابل ہوتی اس کا معاملہ طے پا جاتا۔ ایک سال پہلے ریما بارہ سال کی تھی، یعنی وہ بالغ ہو چکی تھی۔ وہ اپنی ماں کی لاڈلی بیٹی تھی اور اپنے معذور بھائیوں کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اس کی ماں اور بہنوں نے باپ سے التجا کی تھی کہ اسے مزید چند سال گھر میں رہنے دیا جائے مگر باپ نے کہا کہ ایسا کرنا ممکن نہیں۔ ریما کے بعد دو بھائی تھے اور عمر کے لحاظ سے اس کے قریب ترین چھوٹی بہن صرف نو برس کی تھی جو جسمانی طور پر بھی کمزور تھی اور باپ کا خیال تھا کہ وہ اگلے تین چار سال تک بلوغت کو پہنچے گی۔ یہ مفلوک الحال گھرانہ بیٹیوں کی شادیوں سے حاصل ہونے والی رقم کے بغیر گزارہ نہیں کر سکتا تھا۔ یوں ریما کو شادی کے لیے صنعا لے جایا گیا۔ ریما وہاں اپنے باپ، بہنوں اور بھائیوں کے ہمراہ ایک چھوٹے سے کچے مکان میں رہی جبکہ ان کا باپ دن کو مناسب دولہا ڈھونڈنے نکل جاتا۔ تیسرے دن وہ سعودی عرب کے ایک امیر آدمی کے ساتھ جھونپڑے میں آیا۔ وہ بہت خوش تھا کیونکہ ساتھ آنے والا سعودی عرب کے ایک ایسے مالدار شخص کا ہرکارہ تھا جو ایک خوبصورت لڑکی سے شادی کے لیے خاصا سونا دے سکتا تھا۔ سعودی ایجنٹ نے رقم ادا کرنے سے پہلے ریما کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک مسلمان باپ سے ایسی درخواست کی جائے تو اس کا جواب عموماً یمنی تلوار سے دیا جاتا ہے لیکن ایجنٹ کے ہاتھوں میں سونے کی جھلک ان کی خاندانی غیرت پر غالب آ گئی۔ ریما نے بتایا کہ سعودی ایجنٹ نے اس کی ایسے جانچ پڑتال کی جیسے اس کا باپ منڈی میں اونٹوں اور بکریوں کو جانچتا ہے۔ ریما نے اعتراف کیا کہ اس نے اس شرمناک معائنے پر کوئی احتجاج نہ کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اسے خرید کیے ہوئے مال کی طرح کسی دوسرے گھرانے میں جانا ہی پڑے گا۔ جب ایجنٹ نے اس کے دانت دیکھنے پر اصرار کیا تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئی۔

سعودی ایجنٹ نے ریما کو تسلی بخش قرار دیا اور طے شدہ رقم کا بیعانہ ادا کر دیا۔ اس کے باپ نے ایک بھیڑ ذبح کر کے دعوت کی جبکہ ایجنٹ نے ریما کے کاغذات تیار

کیے اور اسے لے کر ہوائی اڈے چلا گیا۔ ریما کے باپ نے بخوشی اعلان کیا کہ اس کا گھرانہ اب چار سال انتظار کرے گا، حتیٰ کہ اس کی چھوٹی بیٹی مناسب عمر کو پہنچ جائے، کیونکہ سعودی امیر نے ریما کے لیے خاصی بڑی رقم ادا کی تھی جو اس دوران ان کی گزر بسر کے لیے کافی تھی۔ ریما کے والد نے جب اسے بتایا کہ وہ سب سے خوش قسمت لڑکی ہے تو وہ اپنی ساری فکرمندی بھول کر خوش ہوگئی۔ اسے بتایا گیا تھا کہ وہ فراغت کی زندگی گزارنے جارہی ہے جہاں وہ ہر روز گوشت کھایا کرے گی، نوکر چاکر اس کی صوابدید پر ہوں گے اور اس کے بچے تعلیم پائیں گے۔ ریما نے اپنے باپ سے پوچھا تھا کہ کیا وہ شخص اسے گڑیا بھی خرید کر دے گا؟ ایسی گڑیا جس کی تصویر اس نے ایک یورپی رسالے میں دیکھی تھی، جسے کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا لائے تھے۔ اس کے باپ نے یقین دلایا کہ وہ ریما کی ہر خواہش کو اول ترجیح دے گا۔

جب ایک ہفتہ بعد سعودی ایجنٹ لوٹ کر آیا تو ریما پر اس خوفناک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ یہ باقاعدہ شادی نہیں بلکہ متعہ ہے۔ اس کا باپ ناراض ہوا کیونکہ اس کی عزت خطرے میں تھی۔ اس کی بیٹی سے ایسا برتاؤ نہیں کیا جانا چاہیے تھا۔ اس نے سعودی ایجنٹ پر واضح کیا کہ اس کی بیٹی کے لیے دوسرا خاوند ملنا مشکل ہوگا کیونکہ وہ پھر کنواری خیال نہیں کی جائے گی، لہٰذا وہ مجبور ہوگا کہ کئی برس ریما کی کفالت کرے اور اس دوران کسی ایسے شخص کی تلاش میں رہے جو ریما کو دوسری اور کم مرتبہ بیوی کی حیثیت سے قبول کرے۔ سعودی ایجنٹ نے نوٹوں کی گڈی پیش کر کے سودا قابل قبول بنا دیا۔ اس نے کہا کہ اگر ریما کے باپ نے انکار کر دیا تو وہ ادا شدہ بیعانے کی رقم واپس لینے پر مجبور ہوگا۔ یوں ریما کے باپ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ بیعانے کا ایک حصہ پہلے ہی خرچ کر چکا ہے۔ ندامت کے مارے اس کی نگاہیں زمین پر گڑی تھیں۔ اس نے مجبور ہو کر ریما سے کہا کہ وہ اس شخص کے ساتھ چلی جائے کہ خدا کی مرضی یہی ہے۔ اس نے سعودی ایجنٹ سے درخواست کی کہ وہ سعودی عرب ہی میں ریما کے لیے ایک مستقل شوہر ڈھونڈ دے جہاں بہت سے یمنی مزدور کام کر رہے ہیں۔

ایجنٹ نے وعدہ کیا کہ وہ کوشش کرے گا اور اگر ایسا نہ ہوا تو ریما اس کے گھر میں خادمہ کے طور پر رہ سکے گی۔ یوں ریما اپنے خاندان کو خدا حافظ کہہ کر اس حالت میں رخصت ہوئی کہ اس کے دونوں معذور بھائی اس کے لیے رو رو کر بے حال ہو رہے تھے۔ بیشتر عرب لڑکیوں کی طرح ریما کو ایک بیوی کی ذمے داریوں کا پورا پورا علم تھا۔ وہ اپنی پیدائش سے لے کر اپنے والدین کے ساتھ ایک ہی کمرے میں سویا کرتی تھی۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ ایک عورت کو اپنے خاوند کی ہر خواہش پر سر تسلیم خم کر دینا چاہیے۔

عائشہ نے بتایا کہ اس لڑکی نے اپنی غلامی کی زندگی خاموشی سے قبول کر لی جو اس کے لیے بہت اندوہناک ثابت ہوئی۔ ریما کہتی یہی تھی کہ وہ اپنی قسمت پر ناخوش نہیں ہے مگر اس کے بہتے ہوئے آنسو اس کی تردید کرتے تھے۔ وہ چھ دن عائشہ کے گھر رہی۔ اس دوران وہ مسلسل روتی رہی تھی، تاہم وہ اس بات کو تسلیم کرتی تھی کہ عائشہ کے باپ کو حق حاصل ہے کہ اس کے ساتھ جو چاہے سلوک کرے۔

عائشہ نے بتایا کہ اس کے والد نے ایک یمنی کو اس کے لیے ڈھونڈ لیا ہے جو اس کے ایک دفتر میں ٹی بوائے کے طور پر کام کرتا تھا۔ وہ ریما کو دوسری بیوی کے طور پر قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کی پہلی بیوی یمن میں تھی۔ اس نے کہا تھا کہ اسے کھانا پکانے اور خدمت کرنے کے لیے ایک عورت کی ضرورت تھی۔ عائشہ کے گھر آخری دن ریما نے ایک چھوٹی گڑیا ہاتھوں میں تھام رکھی تھی۔ پھر وہ عائشہ کے باپ کی فہمائش پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے چپکے سے ایک دوسرے شخص کے ساتھ چلی گئی جسے وہ جانتی بھی نہ تھی۔

عائشہ کی ماں جو ایک پرہیز گار سنی مسلمان خاتون تھی، ریما کی صورتحال پر اس قدر کبیدہ خاطر تھی کہ وہ اپنے خاوند کے خاندان والوں کے ہاں شکایت کرنے جا پہنچی۔ اس کے اس اقدام پر خاندان میں بڑی لے دے ہوئی مگر عائشہ کے دادا دادی اپنے بیٹے سے یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ خدا خوفی سے کام لے اور ایسی حرکتوں سے باز رہے۔ عائشہ کی ماں کے لیے ان کی نصیحت بس یہ تھی کہ وہ اللہ سے دعا کرتی رہے کہ اس کا شوہر سدھر جائے۔

عائشہ کی گھریلو زندگی ایک حساس لڑکی کے لیے تکلیف دہ تھی۔ اپنے والد کی عیاشیوں کے باعث وہ ٹین ایج میں ذہنی دباؤ اور اضمحلال کا شکار رہتی تھی۔ میری بیٹی مہا جو ویسے بڑی سمجھدار تھی، عائشہ کی باتوں سے بڑی مسحور تھی۔ میں اپنی جوانی کو یاد کرتی تو مجھے اپنی یہ خواہشِ بے کار نظر آتی کہ میں مہا کو عائشہ سے ملنے جلنے سے روک دوں۔ ''ممنوعہ پھل میں بچوں کے لیے بڑی کشش ہوتی ہے، خواہ وہ کسی بھی قسم یا جنس سے تعلق رکھتے ہوں۔'' خلیجی جنگ کے عروج کے دنوں میں شاہ فہد نے اخلاقی پولیس ''مطاوئی'' پر پابندی لگا دی کہ وہ سعودی عرب آنے والے غیر ملکیوں کو خوفزدہ نہ کریں جن میں بڑی تعداد مرد و خواتین صحافیوں کی تھی۔ اس شاہی حکم سے تعلیم یافتہ سعودی خواتین نے فائدہ اٹھایا اور غیر ملکیوں سے رابطے شروع کر دیئے۔ جنگ کے دوران شہروں میں مطاوئی کی غیر موجودگی سے سعودی خواتین کو بہت خوشی ہوئی تھی، تاہم ان کی یہ سوچ احمقانہ تھی کہ یہ ڈھیل ہمیشہ جاری رہے گی۔ جنگ ختم ہونے کے ساتھ ہی ''مطاوئی'' کے اختیارات پھر بحال ہو گئے۔ ہماری بعض خواتین کے لیے اچانک ملنے والی بہت زیادہ آزادی تباہ کن ثابت ہوئی۔ عائشہ اور مہا ایسی ہی سعودی لڑکیاں تھیں جو اپنی انجانی اور مکمل آزادی کے لیے نفسیاتی طور پر تیار نہ تھیں۔ جنگ کی غیر معمولی صورتحال میں عائشہ نے ازخود ایک ہسپتال میں بطور رضا کار کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی میری بیٹی مہا بھی ہفتے میں چھٹی کے دو دن ہسپتال میں گزارنے لگی۔ اس کے لیے یہ ایک حیرت انگیز تجربہ تھا کیونکہ وہ اپنی اپنی عبا اور سر کا اسکارف پہننے پر مجبور تھی مگر ہسپتال میں داخل ہوتے ہی یہ پابندی اٹھ جاتی تھی اور وہاں وہ کئی گھنٹے بے حجاب گزارتی تھی۔ جنگ ختم ہوئی تو مہا نے پرانی روش پر چلنے سے انکار کر دیا۔ وہ نئی نئی ملنے والی آزادی پر کاربند رہنا چاہتی تھی، چنانچہ اس نے مجھ سے اور اپنے ابو سے درخواست کی کہ اسے ہسپتال میں کام جاری رکھنے کی اجازت دی جائے۔ ہم دونوں نے بادل نخواستہ اسے اجازت دے دی۔ ایک سہ پہر مہا کو ہسپتال جانا تھا۔ ہمارا ڈرائیور باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اسے جلدی کرنے کی تاکید کرنے کے لیے اس کے کمرے میں گئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہ

ایک چھوٹا سا پستول اپنی پنڈلی کے ساتھ بندھے ہولسٹر میں رکھ رہی تھی۔ کریم قیلولے کی خاطر اس وقت گھر پر تھا۔ جب اس نے ہماری تکرار سنی تو حقیقت حال معلوم کرنے کمرے میں چلا آیا۔ وہ بھی بیٹی کے پاس پستول دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ مہا نے تھوڑی ردوکد کے بعد اعتراف کیا کہ اس نے اور عائشہ نے جنگ کے دوران اپنے آپ کو اس خدشے کے پیش نظر مسلح رکھنا شروع کر دیا تھا کہ عراقی فوج ریاض میں داخل ہو سکتی ہے۔ اب جنگ ختم ہونے کے بعد اس کا خیال تھا کہ اس کے لیے یہ ہتھیار ''مطاوئ'' سے بچاؤ کے لیے ضروری ہے جو بازاروں میں عورتوں کو پھر ڈرانے دھمکانے لگے تھے۔ میں نے خوف اور بے یقینی کے عالم میں اپنی بیٹی کی طرف دیکھا کہ وہ ''مطاوئ'' پر فائر کرنے کا منصوبہ بنائے ہوئے تھی! کریم کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ پستول عائشہ کے باپ کا ہے۔ یقیناً اس کے پاس کئی پستول ہوں گے کیونکہ اس نے دو پستولوں کے غائب ہونے کا نوٹس نہیں لیا تھا' جو مہا اور عائشہ نے چوری کیے تھے۔ یہ جان کر تو مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی کہ اس وقت مہا کے ہاتھ میں پستول لوڈ تھا اور اس کا سیفٹی کیچ بھی نہیں تھا۔ مہا نے آنسو بہاتے ہوئے بتایا کہ وہ دونوں عائشہ کے گھر کے عقب میں خالی پلاٹ میں فائرنگ کی مشق کرتی رہی ہیں۔ کریم نے غصے میں پھنکارتے ہوئے پستول ضبط کر لیا۔ پھر اس نے ڈرائیور کو برطرف کر دیا اور مہا کو مرسیڈیز میں بٹھا کر ایک دیوانے کی طرح گاڑی عائشہ کے گھر کی طرف دوڑانے لگا تا کہ پستول واپس کر کے عائشہ کے والدین کو ان بچیوں کی خطرناک سرگرمیوں سے آگاہ کر دے۔ عائشہ کے ماں باپ کے لیے بھی یہ انکشاف لرزا دینے والا تھا۔ پھر جلد ہی دونوں خاندانوں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ عائشہ اور مہا دونوں کو عائشہ کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ عائشہ کی ماں' باپ' کریم اور میں ایک الگ کمرے میں بیٹھے تھے اور ان بچیوں کا رویہ زیر بحث تھا جنہیں ہم نے جنم دیا تھا۔ عائشہ کی ماں اور میں سیاہ حجاب میں تھیں۔ اس روز میں زندگی میں ایک بار پھر اپنے حجاب میں ہونے پر خوشی محسوس کر رہی تھی کیونکہ میں نقاب میں عائشہ کے باپ کو نفرت سے گھور سکتی تھی جو نوجوان لڑکیوں کی عصمت داغدار کرنے کا مجرم تھا۔ اس شام

ہم پر اپنی بڑی بیٹی کے جن دہشت انگیز خیالات کا انکشاف ہوا وہ تادم آخر ہمارے ذہن کو صدمہ پہنچاتے رہیں گے۔ میں خود سعودی عرب میں خواتین سے روا رکھی جانے والی ناانصافیوں اور ظالمانہ رسوم کے خلاف ہوں اور اس ضمن میں بعض اوقات رسول کریم ﷺ کے فرمان کی بھی اپنی ہی تعبیر کرتی ہوں مگر میں نے کبھی اللہ تعالیٰ کی ذات کا انکار نہیں کیا۔ ہم نے اپنے تینوں بچوں کو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی تعلیمات پر ایمان رکھنے کی تلقین کی ہے اور انہیں بتایا ہے کہ قرآن اللہ کا سچا کلام ہے جو اس کے رسول ﷺ پر نازل ہوا۔ اب جو یہ انکشاف ہوا کہ خود میری ایک بچی نعوذ باللہ' اللہ اور اس کے کلام کو جھٹلاتی ہے تو اس سے میرے قلب وجگر کانپ اٹھے اور میں سُن ہو کر رہ گئی۔ جب عائشہ اور مہا کو دونوں گھرانوں کے اس متفقہ فیصلے سے آگاہ کیا گیا کہ وہ دونوں آج کے بعد ایک دوسری سے نہیں ملیں گی تو مہا نے غصے میں اپنے چہرے سے نقاب نوچ پھینکا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی شیطنت عود کر آئی کہ خود میں خوفزدہ ہو گئی جس نے اسے اپنے رحم میں پالا تھا اور اپنی چھاتیوں سے دودھ پلایا تھا۔ اگر میں نے مہا کے الفاظ اپنے کانوں سے نہ سنے ہوتے تو کوئی شخص مجھے یقین نہیں دلا سکتا تھا کہ یہ اسی کے الفاظ ہیں۔

مہا کے بھنچے ہوئے ہونٹ اس کے پختہ ارادے کی غمازی کرتے تھے۔ وہ کہہ رہی تھی: ''جیسے آپ کہتے ہیں میں ویسے نہیں کروں گی۔ عائشہ اور میں اس ملک کو چھوڑ کر چلی جائیں گی جس سے ہم شدید ترین نفرت کرتی ہیں اور کسی دوسری جگہ بسیرا کر لیں گی' ہم اس ملک پر تھوکتی ہیں۔ اس دہشت ناک ملک میں عورت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی زندگی بہت بڑی ناانصافیوں کے ساتھ گزارتی ہیں۔''

مہا کے ہونٹوں سے کف نکل رہا تھا' اس کا بدن غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں میں گڑی ہوئی تھیں۔ وہ کہتی چلی گئی ''اگر کوئی لڑکی شرم وحیا سے رہتی ہے تو وہ بے وقوف ہے اگر وہ معمول کی زندگی بسر کرتی ہے تو وہ منافق ہے اور اگر وہ اللہ پر یقین رکھتی ہے تو وہ ضعیف العقل ہے۔'' (نعوذ باللہ)

کریم اور میں نے مل کر مہا کو تھامنے کی کوشش کی مگر اس میں تو کسی دیو کی

طاقت آ گئی تھی۔ میری بیٹی کا دماغ چل گیا تھا۔ صرف دیوانے ہی میں ایسی غیرفطری طاقت ہوتی ہے۔ بڑی کھینچا تانی اور تگ و دو کے بعد ہم مہا کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالنے میں کامیاب ہوئے اور تیزی سے اپنے گھر کی راہ لی۔ کریم گاڑی چلا رہا تھا اور میں اپنی بچی کو چپ کرانے کی سعی کر رہی تھی جو اپنی ماں کو بھی نہیں پہچان رہی تھی۔ آخر وہ بے حس ہو کر لیٹ گئی' جیسے غشی کی حالت میں ہو۔

ایک مصری ہمارا با اعتماد فیملی ڈاکٹر تھا' اسے بلا لیا گیا۔ ہمیں پرسکون کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا کہ دنیا بھر میں جب لڑکیاں ''بلوغت میں آتی ہیں تو زیادہ ہارمونز پیدا کرنے کی وجہ سے وہ مختصر وقفے کے لیے پاگل پن کا شکار ہو جاتی ہے۔'' اس نے بتایا کہ اس نے شاہی خاندان کی کئی ایسی نفسیاتی مریضہ لڑکیوں کا علاج کیا ہے اور سب شفایاب ہوئی ہیں۔ اس نے مشورہ دیا کہ مہا کو چند روز کے لیے مسکن ادویات پر رکھا جائے۔ وہ از خود ہسٹیریائی حالت سے نکل آئے گی۔ اس نے ہمارے پاس خاصی مقدار میں مسکن ادویات (ٹرانکولائزرز) چھوڑیں اور جاتے ہوئے کہہ گیا کہ وہ صبح آ کر مریضہ کو دیکھے گا۔ کریم نے اس کا شکریہ ادا کر کے اسے رخصت کیا۔ اب ہم دونوں آمنے سامنے خاموش بیٹھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو خالی نظروں سے دیکھتے رہے۔ آخر کار کریم اٹھا اور اس نے ایک نجی طیارے کا اہتمام کیا۔ میں نے اپنی بہن سارہ کو فون کر کے کہا کہ ہماری واپسی تک عبداللہ اور امانی ان کے ہاں رہیں گے کیونکہ ہم مہا کو لندن لے جا رہے ہیں۔ میں نے سارہ سے درخواست کی کہ وہ مہا کی کیفیت کو خفیہ رکھے۔ اگر کوئی پوچھے بھی تو یہ بتایا جائے کہ مہا کو دانتوں کی شدید تکلیف تھی جس کے لیے اسے لندن لے جانا ضروری تھا۔

مہا کے کپڑے پیک کرتے ہوئے مجھے پریشان کن کتابیں اور کاغذات ملے جو اس نے اپنے کپڑوں میں چھپا رکھے تھے۔ ان میں علم نجوم' کالے جادو اور جادوگری کے طریقوں پر تحریریں شامل تھیں۔ مہا نے جادوئی انکشافات اور پیش گوئی پر مشتمل کئی عبارتوں پر نشانات لگا رکھے تھے۔ سب سے چونکا دینے والی تحریریں بدروحوں کے

بارے میں تھیں جن کا مقصد بدروحوں کو ان لوگوں کے پیچھے لگانا تھا جنہوں نے مہا کو ناراض کیا تھا۔ اس وقت تو میرا سانس گلے میں اٹک کر رہ گیا جب میں نے ایک سیاہ پتھر کے گرد لپٹا ہوا کپڑے کا گڈا دیکھا۔ بظاہر یہ گڈا عبداللہ کا تھا۔ میں اپنی پیشانی ہاتھوں میں تھامے سوچنے لگی: "یااللہ! کیا یہ سچ ہے؟ کیا مہا نے اپنے اکلوتے بھائی کو مار ڈالنے کی منصوبہ بندی کی تھی؟ اگر یہی بات ہے تو میں تو ایک ماں کی حیثیت سے ناکام رہی۔" بچی کی پراسرار سرگرمیوں کی منحوس شہادتیں اکٹھی کرتے ہوئے میری عقل جواب دے رہی تھی۔ تب مجھے مہا کے بچپن کے دنوں کی سرگرمیاں یاد آئیں۔ مجھے حیرت تھی کہ میری بچی نے یہ ساری باتیں کہاں سے سیکھی تھیں اور یہ سب پراسرار الم علم چیزیں وہ کیسے جمع کرتی رہی؟ مجھے یاد آیا کہ میرے والد کا غلام ہدیٰ جو کب کا مرحوم ہو چکا تھا' مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے کی مبینہ صلاحیت رکھتا تھا لیکن وہ تو میری بیٹی کی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو چکا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا ہمارے گھر میں اس سے پہلے اور بعد میں جتنے بھی آزاد کردہ غلام یا خادم آئے ان میں کوئی بھی جنتر منتر کی طاقت سے بہرہ ور نہیں تھا۔ پھر مجھے اپنی ساس نورہ کا خیال آیا۔ ضرور اسی نے مہا کو جادوگری کے چکر میں ڈالا ہوگا۔ اس کے بیٹے نے مجھے طلاق دی تھی نہ مجھ پر دوسری بیوی لایا تھا۔ اس پر آزردہ ہو کر وہ ہمیشہ مجھ سے نفرت کرتی رہی تھی۔ اگرچہ اس نے اپنی نفرت پیار کے باریک پردے میں چھپا رکھی تھی۔ کریم سے ہماری باتیں سن کر اس کی ماں کی عقابی آنکھوں نے بھانپ لیا ہوگا کہ مہا میری سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اوائل عمر ہی سے مہا کی ذہنی کیفیت' نفسیاتی ٹکراؤ اور دکھ سے عبارت تھی۔ نورہ نے اس پر توجہ مرکوز کر کے اس کیفیت کو شدید تر بنا دیا تھا۔ میں دیکھتی رہتی تھی کہ نورہ اپنی دوسری نواسیوں اور پوتیوں کے مقابلے میں ہمیشہ مہا کی طرف داری کرتی تھی اور پریشان نظر بچی اس کی توجہ کو بخوبی قبول کرتی تھی۔ مہا اپنی دادی کے پاس کافی وقت گزارتی تھی۔ نورہ جو جادو پر بہت یقین رکھتی تھی' اس نے اپنے جادو ٹوٹکے اور منحوس اعتقادات' معصوم مہا کے ذہن میں بھی ڈال دیے تھے۔ میں اپنے آپ کو کوسنے لگی: "سلطانہ! تو کتنی بیوقوف تھی کہ نورہ

کو اپنی خیر خواہ سمجھتی تھی۔ میں بیوقوف بن گئی تھی کیونکہ میرا دل نورہ کی مہا سے ظاہری محبت سے نرم ہو گیا تھا۔ میں اکثر اپنی مشکل بچی سے نورہ کے مشفقانہ سلوک پر اس کی ستائش کرتی تھی لیکن نورہ کی مجھ سے دلی نفرت نے میری اس جذباتی اور نرم و نازک بچی کو جادو پرستی کے کنویں میں دھکا دے دیا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ مجھے کریم کو ان جادوئی انکشافات سے آگاہ کر دینا چاہیے مگر بڑی عقل مندی کے ساتھ کیونکہ وہ بڑی مشکل سے یقین کرنے پر آمادہ ہو گا کہ اس کی ماں یہ شرمناک دھندا کرتی رہی ہے۔ حقیقت کو کوئی اور رخ بھی دیا جا سکتا ہے۔ پھر مجھے اپنے شوہر کے غیظ و غضب کا نشانہ بننا پڑے گا جبکہ نورہ اپنے محل میں اطمینان و سکون سے بیٹھی ہو گی۔ اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ اس کی انتہائی قابل نفرت بہو ایک ماں اور بیوی کی حیثیت سے ناکام رہی ہے۔

☆☆☆

تیز دوائی کھانے کے بعد سے مہا مردے کی مانند لیٹی ہوئی تھی اور لندن جانے والے طیارے میں کریم کسی پتھر کی طرح بے جان، ساکت بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ اس کے ہاتھوں میں وہ منحوس چیزیں تھیں جو میں ایک بیگ میں مہا کے کمرے سے اٹھا لائی تھی۔ میری طرح وہ بھی نہایت خوفزدہ تھا کہ ہماری بیٹی کس طرح پراسرار چیزوں اور کالے علوم سے متاثر ہو گئی تھی۔ چند خاموش لمحے گزر گئے اور پھر کریم نے پوچھا: ''سلطانہ! آخر مہا اس پاگل پن کی شکار کیسے ہو گئی؟ کیا اس بیوقوف لڑکی نے تو اسے گمراہ نہیں کیا؟'' میں اپنے خاوند کے ان سوالات کا کیا جواب دیتی؟ مجھے ایک عرب کہاوت یاد آئی جو میں نے اپنی مہربان ماں سے سنی تھی ''ایک مکھی اس منہ میں کبھی بھی داخل نہیں ہو سکے گی جو یہ جانتا ہو کہ اسے کب بند ہونا ہے۔'' میں نے محسوس کیا کہ کریم کی ماں کا کچا چٹھا کم از کم اس وقت کھولنا مناسب نہیں۔ کریم ایک ہی دن میں کئی ایک صدموں سے دوچار ہو چکا تھا، چنانچہ میں نے اسے جواب دیا: ''میں تفصیل نہیں جانتی۔ جو کچھ میرے علم میں ہے، ہم ڈاکٹر کو بتا دیں گے۔ شاید میں اپنا ماضی الضمیر اس کے

سامنے بیان کر دوں' اس سے پتا چلے گا کہ یہ سب کچھ کس طرح ہوا۔''

باقی پرواز کے دوران ہم باری باری جاگ کر بچی کی نگرانی کرتے رہے۔ تب مجھے ایک اور سعودی شہزادی مشعل یاد آئی جس نے اپنی ناجائز محبت چھپا رکھی تھی۔ جب بھید کھل گیا تو میری اس شاہی کزن کی زندگی فائرنگ اسکواڈ کے آگے ختم ہو گئی تھی۔ وہ شہزادہ محمد ابن عبدالعزیز کی پوتی تھی۔ یہی شہزادہ محمد تھا جسے تخت نشینی کے سلسلے میں نظرانداز کر دیا گیا تھا کیونکہ اس کے والد نے فیصلہ سنایا تھا کہ تندخو رویے والا یہ جنگجو شہزادہ تخت پر بیٹھنے کا اہل نہیں۔ مشعل کے ساتھ میری دوستی تو نہ تھی' تاہم میں کئی شاہی تقریبات میں اس سے ملی تھی۔ وہ خاندان میں زیادہ تر جنگلی لڑکی کے طور پر مشہور تھی۔ میں سمجھتی تھی شاید اس کے ناآسودہ مزاج کا سبب یہ تھا کہ اس کی ایک بوڑھے آدمی سے شادی کر دی گئی تھی جو اسے رام کرنے میں ناکام رہا تھا۔ جو کچھ بھی تھا مشعل دکھی تھی اور خالد مہلہل کے عشق میں گرفتار تھی جو لبنان میں تعینات سعودی سفیر کا بھتیجا تھا۔ شاہی خاندان کے کئی افراد نے اس ناجائز تعلق کے بارے میں سنا تھا۔ جب راز کھلنے کا خدشہ لاحق ہوا تو ان دونوں نے بھاگ جانے کا غلط فیصلہ کیا۔ مشعل نے اپنے خاندان والوں کے انتقام کے خوف سے خودکشی کی کوشش کی۔ اس نے انہیں بتایا کہ وہ بحیرۂ احمر کے ایک نجی ساحل پر تیراکی کے لیے جا رہی ہے۔ ساحل پر اس نے اپنے کپڑے رکھے پھر ایک سعودی مرد کا لباس پہنا اور ملک سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ اس کی بدقسمتی کہ اس کے دادا شہزادہ محمد کو اس خبر پر یقین نہیں آیا کہ اس کی پوتی سمندر میں ڈوب گئی ہے' چنانچہ اس کی اطلاع پر تمام سعودی ہوائی اڈوں پر عملہ چوکس کر دیا گیا۔ یوں مشعل جدہ ایئرپورٹ پر بیرونی پرواز پکڑنے کی کوشش کرتی ہوئی گرفتار کر لی گئی۔ پورے ملک میں شاہی خاندان میں طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ پھر اچانک ایک روز میری ایک کزن کا فون آیا اس نے دعویٰ کیا کہ مشعل کا سر قلم کر دیا گیا ہے اور یہ کہ اس کا سر تن سے جدا کرنے کے لیے تلوار کے تین وار کرنے پڑے تھے۔ یہ بھی کہا گیا کہ مشعل کے لب ہلے تھے اور اس نے اپنے محبوب کا نام لیا تھا اور یہ سن کر جلاد وہاں سے بھاگ نکلا

تھا۔ فون پر یہ کہہ کر میری کزن نے پوچھا تھا: ''کیا تم تصور کر سکتی ہو کہ تن سے کٹے ہوئے سر کے لبوں سے الفاظ نکل سکتے ہیں؟''

بعد میں جو حقیقت سامنے آئی وہ یہ تھی کہ شہزادہ محمد نے غصے کے عالم میں فیصلہ دے دیا کہ اس کی پوتی بدکردار ہے اور یہ کہ بدکاری کرنے والوں کو اسلامی سزا ملنی چاہیے۔ جب شاہ خالد کو اطلاع دی گئی تو اس نے شہزادہ محمد سے کہا کہ ملزموں کو معافی دی جائے مگر ترس کھانا اس بدوی شہزادے کی فطرت میں نہ تھا۔

یہ جولائی 1977ء کا گرم ترین دن تھا۔ میں اپنے گھر والوں کے ہمراہ خبر سننے کے انتظار میں تھی۔ میری بہن اور میں پرامید تھیں کہ آخری لمحے انہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ علی کی رائے تھی کہ اس بدکار عورت کو اسلامی سزا بھگتنا ہوگی۔ پھر وہ منحوس وقت آ گیا جب میری پیاری کزن مشعل کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر مٹی کے ڈھیر کے سامنے گھٹنوں کے بل بٹھا دیا گیا۔ پھر فائرنگ اسکواڈ نے اسے گولیوں سے اڑا دیا۔ اس کے عاشق کو اس کی موت کا منظر دکھایا گیا اور پھر تلوار سے اس کی گردن اڑا دی گئی۔ اس سانحے پر برطانیہ میں ''ایک شہزادی کی موت'' نامی فلم بنی۔ شاہ خالد کو اس پر اتنا غصہ آیا کہ انہوں نے برطانوی سفیر کو ملک سے نکال دیا۔

ہم لندن کی طرف محو پرواز تھے۔ اس دوران سارہ نے لندن فون کر کے ضروری طبی انتظامات کر دیئے تھے' چنانچہ گیٹ وک ائیرپورٹ سے ایک ایمبولینس ہمیں لندن کے ایک مشہور مینٹل ہسپتال لے گئی۔ تین ماہ تک مہا کے نفسیاتی ٹیسٹ اور علاج ہوتا رہا۔ ہمیں اپنی بچی سے منگل اور جمعرات کو ملنے کی اجازت تھی' چنانچہ کریم ہر ہفتے ریاض کو پرواز کر جاتا تھا اور ان دو تین دنوں کے لیے لندن چلا آتا۔ معالج کی ہدایت تھی کہ ہم مہا سے بحث وغیرہ نہ کریں۔ مہا کا معالج کراماتی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اس کے علاج سے ہماری بیٹی کے خوفناک دورے کم ہو گئے۔ اسے عرب خواتین کے علاج کا خاصا تجربہ تھا جسے بروئے کار لاتے ہوئے اس نے مہا کا اعتماد حاصل کیا۔ اس اعتماد نے مہا کے روحانی زخم کھول دیئے۔ ان سے حسد' نفرت اور غصے کے دھارے بہہ نکلے

جواس کے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے رائٹنگ پیڈ کے صفحات پر منتقل ہوتے چلے گئے اور ان سے ایک عجیب کہانی مرتب ہوئی عنوان تھا:

سعودی عرب کے سراب میں حیات

یا

خوابوں کا حرم

یا

شہزادی مہا السعود

ان صفحات میں مہا نے 2010ء کا سعودی عرب دکھایا تھا جہاں ایک ملکہ حکمران تھی۔ ملک میں نہ صرف زیادہ بیویاں رکھنے پر کوئی پابندی نہیں تھی بلکہ خواتین کو بھی چار چار خاوند رکھنے کی اجازت تھی۔ خواتین سیاسی، اقتصادی اور قانونی شعبوں میں ہر جگہ بااختیار تھیں۔ ملکہ کی بے لگام بیٹی ''ملاک'' رقص کی دلدادہ تھی۔ اس نے اپنے ہونٹوں میں ایک طلائی ریال دبا رکھا تھا اور سر کے اشارے سے اپنے محبوب ''شادی'' سے کہہ رہی تھی کہ اگر وہ اپنے دانتوں کے ساتھ یہ سکہ اچک لے تو اسے اس کے حرم میں مؤثر ترین مقام مل جائے گا۔ شادی نے ملاک کے ہر عضو پر اپنی زبان پھیرتے ہوئے اس کے لطیف جذبات برانگیخت کیے پھر اس نے اپنے دانتوں کے ساتھ طلائی سکہ اچکا اور ملاک کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر حرم کے اپنے لیے مخصوص حصے میں پردے کے پیچھے لے گیا۔ ملاک کو ان خواتین سے بھی خاص رغبت ہو گئی تھی جو اس کے ساتھ ہم بستر ہوتی تھیں۔

کریم نے یہ صفحات پڑھ کر ڈاکٹر کی میز پر رکھ دیئے۔ اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس نے حیرت آمیز لہجے میں میں ڈاکٹر سے کہا: ''آپ کہتے تھے کہ مہا بہتر ہو گئی ہے مگر یہ تحریر تو اس کے منہ زور جنون کی عکاسی کرتی ہے۔''

ڈاکٹر نے دھیمے لہجے میں کہا: ''آپ کی بیٹی آپ کو بتا رہی ہے کہ اس نے جان لیا ہے کہ مرد اس کے دشمن اور عورتیں اس کی دوست ہیں۔''

''کیا واقعی؟'' کریم کے منہ نکالا۔

''ہاں' شہزادہ کریم! تمہاری بیٹی اور اس کی دوست عائشہ ایک دوسری کی عاشق ہیں۔'' کریم یہ انکشافات سن کر گنگ ہو گیا اور خلا میں گھورنے لگا۔ ڈاکٹر نے اسے تاکید کی کہ وہ اگلے تین دن مہا سے ملنے نہ آئے۔

مہینوں کے علاج کے بعد مہا اس قابل ہوئی کہ وہ اپنی ماں کو اعتماد میں لے کر بات کر سکے۔ اپنے عنفوانِ شباب میں اس روز وہ پہلی بار مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے آنسو بہاتے ہوئے اعتراف کیا کہ وہ سنِ شعور ہی سے اپنے ابو کو چھوڑ کر تمام مردوں سے نفرت کرتی آ رہی ہے۔ اس نے بتایا کہ ابو اور آپ میں طویل علیحدگی ہوئی تھی تو مردوں پر سے میرا اعتبار مزید اٹھ گیا تھا اور پھر دریافت کیا کہ آخر ابو کے ساتھ کیا مسئلہ ہوا تھا کہ ہمیں ان کو چھوڑ کر یورپ جانا پڑا۔ درحقیقت ان دنوں ہمارے بچے دوبئ میں گرمیاں گزار رہے تھے۔ میرے شوہر پر مزید شادی کرنے کا بھوت سوار تھا' میں نہیں چاہتی تھی کہ مجھ پر کوئی سوکن آئے لہٰذا میں نے بچوں کو لیا اور فرانس کے ایک پر فضا دیہی مقام پر بسیرا کیا۔ وہاں رہ کر مہینوں اپنے شوہر سے میری خط و کتابت ہوتی رہی اور میں بڑی مصیبتوں سے گزر کر اپنی شادی کو ناکام ہونے سے بچانے میں کامیاب ہوئی۔ آخر کریم نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب مجھے یہ جان کر شدید دکھ ہوا کہ میری اور کریم کی عارضی علیحدگی نے مہا کو کس قدر ذہنی صدمے سے دوچار کیا تھا اور اس کے نتیجے میں کیسے کیسے عجیب و غریب خیالات اس کے ذہن میں سما گئے تھے۔

مہا نے اعتراف کیا کہ وہ نہیں جانتی تھی کہ عورتیں عورتوں سے اور مرد مردوں سے محبت کر سکتے ہیں۔ اس پر یہ انکشاف اس وقت ہوا جب عائشہ نے اسے چند باتصویر رسالے دکھائے جو اس نے اپنے باپ کے کمرۂ مطالعہ سے چوری کیے تھے۔ ان میں ایک دوسرے سے پیاری کرتی خواتین کی تصویریں تھیں۔ ان رسالوں کو دیکھ دیکھ کر ہی مہا کو یہ احساس ہوا تھا کہ مرد کی عورت سے جارحانہ اور غالب آنے والی محبت کے مقابلے میں عورت کی عورت سے محبت زیادہ لطیف ہوتی ہے۔ عائشہ نے اپنے ابو کی

خوابگاہ میں جھانکنے کے لیے دروازے میں ایک سوراخ بنا لیا تھا۔ اس میں جھانک کر ان دونوں نے مشاہدہ کیا تھا کہ کس طرح عائشہ کا باپ کنواری کلیوں کو مسلتا تھا۔ مہا کا کہنا تھا کہ ان نوجوان لڑکیوں کی چیخوں نے مرد سے ازدواجی تعلق کو اس کے لیے مکروہ اور گھناؤنا بنا دیا تھا۔

مہا نے بتایا کہ ایک دن عائشہ نے اسے فون کر کے اپنے گھر پہنچنے کا کہا۔ اس روز آپ اور ابو گھر پر نہیں تھے۔ چنانچہ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور ڈرائیور کی مدد سے عائشہ کے گھر چلی آئی۔ وہاں عائشہ کے باپ نے اپنے کمرے میں سات دوشیزاؤں کو جمع کر رکھا تھا جو بظاہر اس کی داشتائیں تھیں۔ مہا نے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا کہ ان نوجوان لڑکیوں سے کمرے میں برہنہ چلنے کو کہا گیا جبکہ ہر ایک کی پشت پر مور کا ایک پر اٹکا ہوا تھا۔ انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ ان پروں سے عائشہ کے باپ کے چہرے کو ہوا دیں اور گدگدائیں۔ اس رات اس عیاش شخص نے ان سات دوشیزاؤں میں سے پانچ کے ساتھ مباشرت کی۔

یہ منظر دیکھ کر ہی بعد میں مہا اور عائشہ نے مور کا ایک پر چرایا اور عائشہ کے بستر پر باہم وہی کھیل کھیلنے کی کوشش کی۔ وہ ایک دوسرے کے جسموں کو گدگداتی اور قہقہے لگاتی رہیں۔ اسی موقع پر عائشہ نے مہا کو اس مسرت سے آشنا کیا جو دو عورتیں ایک دوسری سے حاصل کر سکتی تھیں۔

عائشہ کے لیے اپنی محبت پر نادم ہو کر مہا میرے بازوؤں میں چیخ اٹھی۔ وہ سسکاریاں بھرتی ہوئی کہہ رہی تھی کہ وہ ایک پرمسرت اور تعمیری زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ وہ چلا کر بولی: ''میں امانی سے مختلف کیونکر ہوں؟ ہم ایک ہی بیج سے پھوٹی ہیں مگر مختلف پودوں میں ڈھل گئی ہیں۔ امانی ایک خوبصورت گلاب ہے مگر میں ایک کانٹے دار تھوہر ہوں۔'' خدا کے بھید نہ جانتے ہوئے میں اسے کوئی جواب نہ دے سکی۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر تسلی تشفی دی کہ اس کی بقیہ زندگی خوبصورت پھول کی طرح بسر ہو گی۔ تب اس نے مجھ سے ایک مشکل ترین سوال پوچھ ڈالا: ''میں کبھی کسی

مرد سے کیسے صحبت کر سکتی ہوں جبکہ میں ان کی سرشت سے خوب آشنا ہوں؟'' میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا' تاہم مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہمیں اپنی بیٹی کی اصلاح کا ایک موقع میسر آ گیا ہے۔

ریاض روانگی سے پہلے کریم نے مہا کے برطانوی معالج کو فیملی ڈاکٹر کے طور پر اپنے ساتھ ریاض چلنے کو کہا مگر مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے انکار کر دیا اور صرف یہ کہا کہ ''اس عزت افزائی پر آپ کا شکریہ مگر میرے جمالیاتی احساسات اس قدر لطیف ہیں کہ سعودی عرب میں ان کی تسکین نہیں ہو سکتی۔ پھر دولت اور اقتدار ایسی معمولی چیزیں ہیں کہ میرے لیے ان میں کوئی کشش نہیں۔'' انگریز ڈاکٹر کے اس ردعمل پر میں حیران رہ گئی اور تب اچانک مجھے مہا کے سوال کا جواب بھی مل گیا۔ بعد میں' میں نے مہا کو بتایا کہ ''اسے ایک روز ایسا مرد مل جائے گا جو اس کی محبت کا مستحق ہو گا۔''

ریاض واپس آ کر مہا کے کالے علم کے سرچشمے کا سراغ لگ گیا' جو میرے خیال کے عین مطابق تھا۔ یہ ساری بدمعاشی نورہ کی تھی۔ مہا نے ہمیں بتایا کہ اس کی دادی اماں نے اسے کالے علم سے روشناس کرایا تھا۔ جب ہم نے اسے جادوئی پتھر کے گرد لپٹا عبداللہ کا گڈا دکھایا تو اس نے اس امر سے انکار کیا کہ وہ اپنے بھائی پر جادو کرنا چاہتی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں اپنی ساس کے سامنے جا کر اس کے چہرے پر تھوک دوں اور اس کے بال نوچ لوں۔ کریم نے میری غضب ناک کیفیت دیکھ کر مجھے اپنے ہمراہ لے جانے سے انکار کر دیا اور اکیلا ہی اپنی ماں کے ولا چلا گیا۔ میں نے فون پر سارہ کو خبر دی۔ وہ عین اس وقت وہاں جا پہنچی جب ماں بیٹے میں شدید تکرار ہو رہی تھی۔ سارہ نے ولا کے باغیچے میں رک کر سنا کہ کریم غصے سے دہاڑ رہا تھا اور اس کی ماں معافی مانگ رہی تھی۔ کریم نے ماں کو خبردار کیا کہ وہ آئندہ اس کے بچوں سے تنہائی میں ہرگز نہ ملے۔ کریم کے وہاں سے چلے آنے کے بعد سارہ نے اس کی ماں کو سسکتے اور یہ کہتے سنا: ''کریم! میرے سب سے پیارے بیٹے! تم نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے' اپنی ماں کے پاس آ جاؤ جو تمہاری محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

☆☆☆

میں نے اور بچوں نے کریم کے ساتھ عمرہ تو کیا لیکن ہمیں حج کی سعادت حاصل نہیں ہوئی۔ میں نے پچھلے کئی سالوں میں کریم سے کئی بار کہا کہ ہمیں اپنے بچوں کو حج کی برکتوں سے روشناس کرنے کے لیے حج کرنا چاہیے لیکن وہ نہیں مانا۔ بلکہ وہ ہر سال ہمیں حج کے ہجوم سے دور بیرون ملک لے جاتا۔ میں جب بھی اس کے حج نہ کرنے کی وجہ دریافت کرتی ہوں تو وہ مختلف بہانے تراشتا ہے۔ ایک بار میں نے سچ اگلوانے کے لیے اس کو کہا کہ حج سے تمہاری یہ عجیب وغریب بے رغبتی لوگوں کی نظر میں آ گئی ہے اور وہ باتیں بنانے لگے ہیں۔

میرے اصرار پر اس نے بتایا کہ نوجوانی میں اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا کہ وہ حاجیوں کے ہجوم میں کچل جانے سے مر گیا ہے۔ اس انکشاف کے بعد مجھے حج کے بارے میں کریم کے عجیب رویے کی سمجھ آ گئی۔ اسی لیے وہ تیئیس (23) سال کی عمر سے حج کے پر ہجوم دنوں سے کتراتا آیا تھا۔ کریم یہ چیز بہت شدت سے محسوس کرتا تھا کہ اگر وہ حج کرنے گیا تو اس کا خواب سچ ثابت ہوگا۔

جب 1990ء میں مکہ کی ایک پہاڑی سرنگ میں 1500 حجاج کرام کے کچلے جانے سے شہید ہونے کی خبر ہم نے پیرس میں سنی تو کریم بستر سے لگ گیا اور پورا دن کانپتا رہا کہ یہ خدا کی طرف سے غیر معمولی اشارہ ہے کہ کریم مسجد الحرام میں عبادت کے لیے کبھی نہ جائے۔ میں نے اس سے بہت کہا کہ تمہارا خواب دوسروں کی موت کی صورت میں پورا ہو چکا ہے مگر اس کا خوف ختم نہ ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ کوئی بڑا حادثہ نہ بھی ہوا تو وہ اکیلا ہی لوگوں کے پاؤں کے نیچے آنے سے کچلا جائے گا۔

مہا کے ساتھ لندن سے واپسی پر میرے اندر حج کی سعادت حاصل کرنے کی شدید خواہش ابھری۔ میں نے کریم سے کہا کہ میں بچوں کو حج پر لے جاتی ہوں اور محرم کی شرط کے لیے میں سارہ اور اس کے اہل خانہ کے ساتھ حج کروں گی۔ مجھے تعجب ہوا کہ کریم نے ہمیں حج کرنے کی اجازت دے دی بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ خود بھی حج کرنے

کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اگرچہ اس کا ذاتی خوف دور نہ ہوا تھا' تاہم وہ بھی اپنی پیاری بیٹی مہا کی واپسی پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی شکر ادا کرنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کریم کی بہن حنان کے شوہر شہزادہ محمد نے جو سعودی پبلک سکیورٹی میں اعلیٰ افسر تھا ہمیں متنبہ کیا کہ اس بار دنیا بھر سے بیس لاکھ سے زائد حجاج کرام کی آمد متوقع ہے اور مزید تشویشناک بات یہ ہے کہ ایران سے ڈیڑھ لاکھ شیعہ حج کے لیے آ رہے ہیں۔ 1987ء میں حج کے موقع پر ایرانیوں نے پرتشدد مظاہرہ کیا تھا۔ انہوں نے سعودی قوانین کی خلاف ورزی کی اور حرم کی بے حرمتی کی تھی جس کے نتیجے میں 402 حجاج کرام مارے گئے تھے۔ اور 1989ء میں ایرانیوں نے دو بم دھماکے کیے تھے جن میں سولہ حاجی زخمی اور ایک حاجی ہلاک ہو گیا تھا۔ میں نے شہزادہ محمد اور کریم کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیا کہ سابقہ تجربات کے پیش نظر اس بار ایرانی حجاج کرام کی سخت نگرانی ہو گی اور اگر کوئی حادثہ ہو بھی گیا تو کیا وہ نہیں جانتے کہ خانہ کعبہ میں شہید ہونے والا سیدھا جنت الفردوس میں جاتا ہے۔ میری ان باتوں کا ان دونوں پر کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ تاہم کریم نے گہرا سانس لیتے ہوئے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا: ''سلطانہ! میں ایک سو خطروں کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ اس سے تمہیں ذہنی سکون ملتا ہو۔ ہم اکٹھے حج پر جائیں گے۔ میں نے شہزادہ محمد کی موجودگی کی خاطر میں نہ لاتے ہوئے فرطِ مسرت سے کریم کا منہ چوم لیا۔ اور اس کے کانوں کی لوئیں سہلانے لگی۔ شہزادہ محمد میری اس غیر متوقع حرکت پر کسی بہانے کمرے سے باہر چلا گیا۔

کریم اور میں نے سارہ اور اس کے بچوں کو اپنے ساتھ حج پر جانے کی دعوت دی سارہ کو بہت خوشی ہوئی۔ وہ ہر سال حج کا فریضہ ادا کرتی آ رہی تھی مگر اس کے لیے یہ خبر باعث مسرت تھی کہ اس بار ہم فریضۂ حج کے دنوں میں یورپ میں طویل چھٹیاں منانے نہیں جائیں گے۔ مکہ روانگی سے پہلے ہمیں احرام باندھنا تھا۔ اس لیے سب نے اس پر عمل کیا۔ دورانِ احرام کے معمولات عام زندگی سے مختلف ہوتے ہیں۔ احرام کی حالت میں سلے ہوئے کپڑے پہننا' ڈاڑھی منڈوانا' بال یا ناخن تراشنا' خوشبو لگانا'

جانور ہلاک کرنا اور مباشرت سب ممنوع ہیں حتیٰ کہ عورت کو چھونا بھی جائز نہیں۔

لبیک اللھم لبیک کہتے ہوئے میں نے اپنا میک اپ اور اپنے سارے قیمتی زیورات اتار دیئے حتیٰ کہ میں نے دس قیراط ہیروں کے آویزے بھی اتار دیئے جو کریم نے پچھلے سال مجھے دیئے تھے۔ غسل کرنے کے بعد میں نے سیاہ اَن سلا لبادہ پہن لیا اور سیاہ دوپٹے سے اپنے بالوں کو ڈھانپ لیا۔ پھر میں اللہ کے حضور نماز کے لیے کھڑی ہوگئی اور دعا کی کہ وہ میرا حج قبول کرے۔

کریم اور بچے نیچے نشست گاہ میں میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نیچے آئی تو میں نے دیکھا کریم اور عبداللہ نے احرام کی سفید چادریں اوڑھ رکھی ہیں اور سادہ چپل پہنے ہوئے ہیں۔ امانی اور مہا نے گہرے رنگوں کے لبادوں میں اپنے آپ کو چھپایا ہوا ہے جن میں چہرے، پاؤں اور ہاتھوں کے سوا ان کا سارا جسم چھپا ہوا تھا۔ حج کے دوران عورت کا چہرہ ڈھانپنا ممنوع ہے۔ میں نے مہا اور امانی کو باری باری گلے لگایا اور تلخ لہجے میں اس سے کہا: ''جب آدمی کو خدائی فراست ودیعت کی گئی ہے تو تم چہرے کے نقاب کو چھوڑ سکتی ہو جس سے تم اس قدر نفرت کرتی ہو'' یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے شوہر اور بیٹے پر ایک نظر ڈالی۔

کریم نے میری اس حرکت پر مجھے ٹوکتے ہوئے صرف اتنا کہا: ''سلطانہ!'' اور خاموش ہو گیا۔ تب میں یہ سوچ کر وحشت زدہ ہو گئی کہ میں نے حج کا عہد توڑ دیا ہے۔ میں گھبرا کر اپنی اس نادانی کی تلافی کے لیے کمرے سے یہ کہتے ہوئے تیزی سے نکل گئی کہ مجھے حج کی نیت دوبارہ کرنی چاہیے۔ کریم مسکرایا اور میرے بچے میری اس کیفیت سے محظوظ ہو کر قہقہے لگانے لگے۔ میں اپنے کمرے کے فرش پر اللہ کے حضور جھک گئی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے لگی کہ وہ مجھے اپنی زبان پر قابو پانے اور ایک بار پھر احرام میں داخل ہونے کی توفیق دے۔ نماز کی ادائیگی کے دوران مجھے اپنی والدہ کی بے کسی اور اپنے والد کا غیظ وغضب یاد آ گیا۔ اس سے وہ سکون ختم ہو گیا جو مجھے حج کی نیت کرنے کے لیے چاہیے تھا۔ مجھے اپنے آپ پر شدید غصہ آیا اور میں دوبارہ نئے

سرے سے نماز کی نیت کرنے لگی اور پورے خشوع وخضوع سے نماز ادا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

جب میں نیچے واپس آئی اور اپنے اہل خانہ کے پاس پہنچی تو کریم نے مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھا جو کہ میرے خیال میں جنسی اشارے کے مترادف تھا۔ اس پر میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے کریم سے کہا کہ میں حج پر جانے کے قابل نہیں کیونکہ احرام میں داخل ہونے کے لیے مجھے قلب ونظر کی جو پاکیزگی چاہیے وہ میرے لیے ممکن نہیں۔

کریم نے اپنی دونوں بیٹیوں کو اشارہ کیا کیونکہ زوجین کے باہمی لمس کی ممانعت ہوتی ہے۔ اس لیے مہا اور امانی ہنستے ہوئے مجھے دھکیل کر کمرے سے باہر لے گئیں، جہاں کار ہماری منتظر تھی۔ ہم ہوائی اڈے کی طرف جا رہے تھے۔ اس دوران میرے احتجاج کے جواب میں کریم نے مجھے تسلی دی کہ تم طیارے سے جدہ پہنچ کر ایک بار پھر حج کی نیت کر سکتی ہو۔ بین الاقوامی اڈے شاہ خالد پر اسد، سارہ کا شوہر، سارہ اور اس کے بچے شاہی لاؤنج میں ہمارا انتظار کر رہے تھے میں نے آہستگی سے سارہ اور اس کے اہل خانہ کو سلام کیا۔ مہا نے اپنی خالہ کے کان میں سرگوشی کی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہماری تاخیر کی وجہ جان گئی ہے۔

ہم کریم کے ذاتی جیٹ طیارے میں سوار ہوئے اور طیارے نے جدہ کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ اس مبارک سفر کے دوران بڑے اللہ کی یاد میں مشغول تھے۔ چھوٹے بچے اپنے کھیلوں میں مصروف یا کتابوں میں محو تھے۔ میں اپنی زبان کو قابو میں رکھنے کے خیال سے بالکل خاموش تھی۔ آخرکار جدہ کا جدید بین الاقوامی شاہ عبدالعزیز ہوائی اڈا آ گیا۔ رات کا وقت تھا۔ جب کریم نے امریکی پائلٹ کو حکم دیا کہ وہ ہمیں حج ٹرمینل لے چلے۔ مجھے کریم کی اس بات سے بہت خوشی ہوئی۔ یہ ٹرمینل ایک غیر روایتی خیمے کی شکل کا شہر ہے اور اس کا رقبہ 1370 ایکڑ ہے۔ یہ ٹرمینل غیر ملکی حجاج کرام کی آمدورفت کے لیے مخصوص ہے لیکن ہمارا شاہی رتبہ ہمیں حسب خواہش

کہیں بھی اترنے کا حقدار ٹھہراتا ہے۔

کریم چند سال پہلے ہمارے بیٹے عبداللہ کو اس ٹرمینل کے پروقار افتتاح کے موقع پر یہاں لایا تھا۔ مگر مہا اور امانی نے اس دلکش عمارت کو اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اپنے خاموش رہنے کے ارادے کو بھلا کر میرے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اپنی بیٹیوں کو ان کے پرفخر شاندار ورثے کے بارے میں آگاہی دوں۔ اس لیے میں نے دھیمے لہجے میں ان کو بتانا شروع کیا کہ اس ٹرمینل کو بے نظیر ڈیزائن دینے والے ترقی یافتہ انجینئرنگ کے شاہکار کی حیثیت سے بین الاقوامی ایوارڈ ملا ہے اور اب ہم اپنے اجداد کی غربت پر نادم نہیں۔ پچاس برس پہلے جہاں جنگجو قبائل کے مویشی لڑتے پھرتے تھے وہاں اب ہم سعودی ایک اقتصادی طاقت بن گئے ہیں۔ دوسرے کئی ممالک میں تیل دریافت ہوا ہے مگر وہاں کے عام شہریوں کو سعودیوں جیسی خوشحالی میسر نہیں۔ سعودی خوشحالی ان لوگوں کی بے مثال کوششوں کی بنا پر ممکن ہوئی جنہوں نے مؤثر طریق سے زمام اقتدار سنبھالی۔ بس یہی ایک قابل ستائش بات ہے جس کی بنا پر میں سعودی مردوں کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔

میں قصہ سنانے کے انداز میں اپنی باتیں کہے جا رہی تھی۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ کوئی بھی مجھے نہیں سن رہا۔ کریم، سارہ اور اس کے شوہر اسد کی آنکھوں سے بیزاری ٹپک رہی تھی۔ میں اپنے سفر کا مقصد مکمل طور پر بھول چکی تھی۔ میں نے ایک نظر بچوں پر ڈالی تو مجھے اور زیادہ مایوسی ہوئی۔ کیونکہ ان کے چہروں پر میری باتوں میں دلچسپی کے کوئی آثار نظر نہ آ رہے تھے۔ میرا بیٹا عبداللہ سارہ بڑے لڑکے کے ساتھ گیم کھیل رہا تھا اور چھوٹے بچے ان ننھی کاروں اور ٹرکوں سے کھیل رہے تھے جو اسد ان کے لیے یورپ سے لایا تھا۔ میرے ہاتھوں میں خارش ہونے لگی اور میرا دل چاہا کہ میں کسی کے چٹکی بھروں۔ میں عبداللہ کے بازو پر چٹکی کاٹنے ہی والی تھی کہ میری نگاہ سارہ پر پڑی وہ مجھے متنبہ کرتے ہوئے بولی: ''احرام''۔ میرا ہاتھ وہیں کا وہیں رک گیا۔

مجھے اپنے خاندان کی اس سرد مہری پر بہت افسوس ہو رہا تھا، جو وہ اپنے رویے

سے اپنے آباؤ اجداد کے متعلق ظاہر کر رہے تھے۔ چنانچہ میں نے چلا کر کہا: ''جو بزرگوار تمہارے لیے مردہ ہیں میں سمجھتی ہوں کہ وہ زندہ ہیں۔'' میری اس بات پر کریم کی ہنسی چھوٹ گئی اور اسد نے سرگوشی کرتے ہوئے غالباً یہ کہا کہ اس نے کس طرح کی عورت سے شادی کرنے کی غلطی کی ہے۔ مہا کو میرا خاندان سعود کے کارنامے بیان کرنا پسند نہ آیا کیونکہ وہ سعودی عرب کی ہر چیز پر امریکہ اور یورپ کو ترجیح دیتی ہے۔ اس نے اس ٹرمینل پر بہت زیادہ تنقید کی اور کہا ''یہ بیسویں صدی ہے' پھر ہم گڑے مردوں کو کیوں اکھاڑیں؟'' امانی کو ٹرمینل کی سپاٹ لائٹس دیکھ کر بہت خوشی' جو بلند و بالا سہاروں پر نصب تھیں۔ عبداللہ نے اپنا پچھلا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے اپنی چھوٹی بہن امانی کو بتایا کہ اس ''خیمے'' کی تیار چھت دنیا میں سب سے بڑے مکان (Space) پر محیط ہے اور مدینہ سے زیادہ بڑی مکانیت والا ''خیمہ'' بنانے کی تجویز زیرِ غور ہے۔ امانی نے میرا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا ''امی! ہمیں یہاں لانے کا شکریہ۔'' مجھے بہت خوشی ہوئی کہ میری ساری تقریر ضائع نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

امانی کو آوارہ بلیوں' کتوں اور ان کے بچے پالنے اور پنجرے میں قید پرندوں کو آزاد کرنے کا بہت جنون تھا۔ عبداللہ اور کریم اپنے کزن شہزادوں کے ساتھ صحرا میں شکار کے لیے جایا کرتے تھے جبکہ امانی کے خیال میں سعودی عرب کی جنگلی حیات فنا کے خطرے سے دوچار تھی۔ اسی لیے وہ کریم اور عبداللہ کی عدم موجودگی میں اپنے باپ کے کمرۂ شکار میں چپکے سے داخل ہو جاتی اور ان کا ایمونیشن چھپا دیتی' مہنگے ہتھیار ناکارہ کر دیتی یا انہیں کوڑے میں پھینک دیتی۔ امانی کی جانوروں سے محبت کی وجہ سے ہمارا گھر مختلف نسلوں' جسامت اور رنگوں کے آوارہ کتوں اور بلیوں کی آماجگاہ بن گیا۔ اس کے اس شوق کو دیکھتے ہوئے ہم نے گھر میں ایک چڑیا گھر بنا دیا۔ جانوروں کی صفائی ستھرائی اور ان کو جراثیم سے پاک کرنے کے لیے کریم نے دو تھائی جوانوں کو ملازم رکھ لیا۔ چڑیا گھر کے ساتھ ایک بڑا احاطہ آوارہ کتوں اور بلیوں کے لیے مخصوص کیا گیا۔ کریم نے

امانی کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ ان میں سے دس کتے اور بلیوں کو چن لے، جن کو گھر میں داخلے کی اجازت ہو گی۔ ہماری ان تمام کوششوں کے باوجود گلیوں کے آوارہ کتوں اور بلیوں کی ہمارے گھر میں آمد جاری رہی۔

ایک دن کریم نے ایک عجیب وغریب منظر دیکھا۔ ہمسایوں کے تین فلپائنی ملازم پانچ بلیوں کو بوری میں بند کر کے ہمارے تھائی ملازموں کو دے رہے تھے۔ فلپائنیوں سے ایک پوسٹر بھی ملا جس پر درج تھا کہ ہر آوارہ بلی یا کتے کے بدلے بلی یا کتا لانے والے کو سو ریال کا انعام دیا جائے گا۔ اس عبارت کے نیچے ہمارے گھر کا پتہ درج تھا۔ تھائی ملازموں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ امانی نے انہیں ہمسایہ محلات اور کوٹھیوں کے باہر یہ پوسٹر چسپاں کرنے کا حکم دیا تھا۔ مزید یہ تاکید کی تھی کہ وہ گلیوں میں گھوم پھر کر کتوں اور بلیوں کو اٹھا لایا کریں۔ ان سے اس تمام معاملہ کو مخفی رکھنے کا وعدہ بھی لیا گیا تھا۔ جب ان آوارہ کتوں اور بلیوں کی گنتی کی گئی تو ہمارے گھر میں چالیس بلیاں اور بارہ کتے پائے گئے۔ بلیوں کو بحیرۂ احمر کی تازہ مچھلی کھلائی جا رہی تھی اور کتوں کو آسٹریلیا سے منگوایا گیا مہنگا گوشت دیا جا رہا تھا۔ ہمارے گھر کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ یہ اس قدر زیادہ تھے کہ ہمارا منشی ان رقموں کا نوٹس لینے میں ناکام رہا تھا جو امانی کی طرف سے جانوروں پر خرچ کی جا رہی تھیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ امانی پنجرے میں قید پرندوں کو آزاد کرنے میں بھی بہت زیادہ رقمیں خرچ کر رہی تھی۔ وہ یہ سارے اخراجات باورچی خانے میں رکھے گئے کیش بکس سے پورے کرتی تھی، جس میں ہر ہفتے ہمارے ذاتی خرچ کی رقوم رکھی جاتی تھیں تاکہ ملازمین ہماری ذاتی خریداری کے لیے خرچ کرتے رہیں۔

ایک روز میرا بھائی علی میرے گھر آیا۔ وہ گاڑی سے نکل کر کار دھونے کی ہدایات دے رہا تھا کہ امانی کا کتا نپولین چپکے سے آیا۔ اس نے ٹانگ اٹھا کر علی کے ''ثوب'' پر پیشاب کر دیا۔ علی غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ وہ کتے کو ٹھوکریں مارنے لگا۔ امانی اپنے پیارے نپولین کی درگت بنتے دیکھ کر دوڑتی ہوئی آئی اور آتے ہی اپنے

ماموں کے بازوؤں اور چھاتی پر مکے برسانے لگی۔ اس پر علی کا موڈ اس قدر بگڑ گیا کہ وہ سہمے ہوئے ملازمین کے سامنے مجھے پاگل اور ذہنی خلجان میں مبتلا بچی کو جنم دینے کے طعنے دیتا ہوا اپنی کار میں بیٹھا اور مجھ سے ملے بغیر واپس چلا گیا۔ اس دن کے بعد سے امانی اپنے ماموں سے ویسی ہی نفرت کرنے لگی جیسی نفرت میں اپنے لڑکپن میں علی سے کرتی تھی۔

کریم کو اس ناخوشگوار واقعہ کا علم ہوا تو اس نے امانی کو مجبور کیا کہ وہ اپنے ماموں سے فون پر معافی مانگے۔ اس کے باوجود علی نے دو ماہ تک ہمارے گھر کا رخ نہ کیا۔ ناراضگی دور ہونے پر جب وہ دوبارہ ملنے آیا تو اس نے آتے ہی نوکروں سے کہا کہ نپولین کو بند کر دیں۔ میں جانتی تھی کہ امانی کا غصہ ابھی تک ختم نہیں ہوا مگر اس روز علی کی آمد پر جب وہ کمرے میں آئی اور اس نے گریپ فروٹ کے تازہ جوس کا گلاس اپنے ماموں کو پیش کیا تو مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ جوس پی چکا تو امانی نے بادام بھرے بسکٹوں کی پلیٹ آگے کر دی۔ علی نے پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ امانی کی شادی کسی بے حد خوش قسمت آدمی سے ہوگی۔ جب علی چلا گیا تو امانی کی خواب گاہ سے اونچے اونچے قہقہے سنائی دیئے۔ نوکر لپک کر گئے تو امانی نے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوتے ہوئے بتایا کہ اس نے ماموں کو جوس کا جو گلاس پیش کیا تھا' اسے کتے چاٹ چکے تھے۔ اس نے گلاس میں ٹھنڈا پانی بھر کر اپنے پالتو کتوں کے آگے رکھ دیا تھا اور پھر اسی میں جوس ڈال کر ماموں کے لیے لے آئی تھی۔ یہی نہیں' اس نے بادام بھرے بسکٹ لانے سے پہلے نپولین کو انہیں چاٹنے کا موقع دیا تھا۔ نوکر یہ جان کر ہنسنے لگے۔ میں نے اس کی اس حرکت پر اسے کچھ نہ کہا اور اپنی ہنسی ضبط کرنے کی ناکام کوشش کے بعد میں نے اپنی بیٹی کو بازوؤں میں بھینچ لیا۔ پھر میں بھی قہقہے لگانے لگی۔ امانی کی حرکتیں دیکھ کر مجھے یہ حقیقی احساس ہوا کہ امانی میری ہی کوکھ سے پیدا ہوئی ہے۔

علی کو امانی کی اس حرکت کا علم ہو جاتا تو شاید اسے دل کا دورہ پڑ جاتا۔ جب میں نے یہ واقعہ ہنستے ہوئے کریم کو سنایا تو اس کا چہرہ مکدر ہو گیا اور اسے ہم دونوں ماں

بیٹی کی ذہنی صحت پر شبہ ہونے لگا۔ اس نے اسی وقت انٹرکام پر امانی کو طلب کیا اور وہ چلی آئی۔ اس سے پہلے کہ میں صورتحال کو سنبھالنے کی کوشش کرتی کریم نے چھوٹتے ہی پوچھا: ''امانی! زندگی میں تمہارا مقصد کیا ہے؟''

امانی بچگانہ معصومیت سے بولی: ''تمام جانوروں کو انسانوں سے بچانا۔'' کریم نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا: ''جانوروں کا تحفظ دولت مند یورپیوں اور امریکیوں کا ڈھونگ ہے۔'' پھر اس نے میری طرف دیکھا جیسے اس کی ذمہ دار میں ہی تھی اور بولا: ''سلطانہ! میرا خیال تھا تمہاری یہ بچی زیادہ ذہین نہیں ہوگی۔''

امانی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے رخصت چاہی مگر کریم نے اپنا دوسرا سوال بھی داغ دیا: ''امانی! جب تم تمام جانوروں کو بچا لوں گی تو اس کا تمہیں یا تمہارے خاندان کو کیا فائدہ ہوگا؟'' امانی خلا میں گھورتی رہی' پھر اس نے کندھے اچکا دیئے۔ کریم نے امانی کی حیوانات سے محبت پر تنقید کرنے کی بجائے اسے سمجھایا کہ زندگی کا عظیم مقصد اپنی نوع کی تخلیق اور اسے زندگی کے جذبوں سے آشنا کرنا ہے۔ تم اپنے عمل سے انسانی تہذیب کو متاثر کرسکتی ہو اور اس کے ساتھ جانوروں کی خدمت بھی انجام دے سکتی ہو۔

ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد امانی نے باپ سے عہد کیا کہ وہ پالتو جانوروں سے آگے دیکھے گی اور اپنی زندگی میں اسی طرح کے ہمت آزما مقصد کو پیش نظر رکھے گی۔ پھر اس نے باری باری ہمارے گالوں کا بوسہ لیا اور شب بخیر کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ حج کے دوران ہمارے خاندان کی تاریخ میں جو ایک عجیب ترین تبدیلی' ہمارے مشاہدے میں آئی' وہ یہی تھی کہ ہماری امانی کا خفتہ دینی شعور جیسے رات بھر میں بیدار ہو گیا ہو' وہ اسلامی عقائد پر سختی سے کاربند ہوگئی۔ یوں لگتا تھا کہ امانی کا دل و دماغ ایک ارفع بصیرت اور ایک عظیم راز سے آشنا ہو گئے ہیں جسے وہ اپنی ماں یا باپ کو بتانے سے قاصر تھی۔

جدہ میں اپنی آمد کی اگلی صبح ہم اپنی ائیرکنڈیشنڈ لیموزین میں جدہ سے مکہ

روانہ ہوئے۔ مجھے خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ میں اپنے اہل خانہ کو حج کے مقدس فریضہ کی ادائیگی کے لیے لے آئی ہوں۔ گاڑی میں بیٹھی مہا کی آنکھیں بند تھیں' عبداللہ تسبیح کے دانے پھیر رہا تھا' امانی اپنے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی اور کریم کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اپنی جوانی کے ڈراؤنے خواب سے نجات پا چکا ہے۔

مسجد حرام کے باہر میں لبیک اللھم لبیک پڑھنے لگی۔ ہمیں ایک سرکاری گائیڈ دیا گیا' جسے مناسک حج کی ادائیگی میں ہماری رہنمائی کرنا تھی۔ سارہ اور میں بچیوں کے ساتھ رہیں جبکہ کریم اور اسد بیٹوں کے ساتھ چل رہے تھے۔ اتنے میں مؤذن کی آواز گونجی۔ میں اور سارہ بیٹیوں کے ساتھ مردوں کے پیچھے صف میں شامل ہو گئیں۔ نماز سے فارغ ہوئے تو کعبہ سامنے تھا' جو سیاہ مخمل کے غلاف میں لپٹا ہوا تھا۔ اس پر سونے کی تاروں سے قرآنی آیات کاڑھی گئی ہیں۔ ہر سال پہلا غلاف اتار کر نیا غلاف چڑھایا جاتا ہے۔ بہت سے زائرین اتارے ہوئے غلاف کا ایک ٹکڑا یادگار کے طور پر اپنے ساتھ لے جانے کے لیے خاصی رقم ادا کرتے ہیں۔ کعبہ کے ایک گوشہ میں حجر اسود نصب ہے' جو اللہ سے اہل اسلام کی محبت کی علامت ہے۔ یہ سیاہ پتھر چاندی کے خول میں بند ہے۔ اب ہم کعبے کا طواف کر رہے تھے۔ کعبہ ہماری بائیں جانب تھا' زبان سے یہ الفاظ جاری تھے!

لبیک اللھم لبیک لاشریک لک لبیک.

ہم لوگ طواف کر چکے تو کریم نے سر کے اشارے سے ہمیں اپنے پاس بلایا۔ ہم خوش قسمت تھے کہ کریم نے ہمارے لیے کعبے کے اندر جا کر نوافل کی ادائیگی کا اہتمام کر رکھا تھا۔ ہم ایک سیڑھی پر چڑھے' جو کعبہ کے دروازے کے ساتھ لگا دی گئی تھی۔ خاصے بلند دروازے پر چاندی میں قرآن کی آیات کندہ تھیں۔ کعبے کے اندر بہت تاریکی تھی' میں نے کعبے کے ہر گوشے میں نفل پڑھے اور اللہ سے دعا کی کہ وہ ہماری بیٹی مہا سے آسیب کو دور رکھے اور دیگر اہلخانہ کو سلامتی سے نوازے۔ میں نے یہ دعا بھی مانگی کہ اللہ تعالیٰ سعودی عرب کے مردوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

تعلیمات پر عمل کرنے اور اپنی بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں کو روزمرہ زندگی کی جکڑ بندیوں سے رہائی دینے کی توفیق عطا کرے۔

اندھیرے میں، مَیں نے ایک بچے کی سسکیاں سنیں۔ یہ میری بیٹی امانی تھی جو اپنے رب کے حضور گڑگڑا رہی تھی۔ وہ دعا کر رہی تھی کہ اللہ اسے شاہی شان و شوکت کی دنیا سے نکلنے اور انسانی مظالم کا سدباب کرنے میں مدد دے۔ نیز وہ تمام نوع انسانی کے گناہوں سے درگزر کرے اور دنیا بھر کے بیماروں کو شفا دے۔

کعبہ سے نکل کر ہم مقام ابراہیم پر آئے اور یہاں دو، دو نفل ادا کیے۔ پھر ہم سعی کے لیے وادیٔ منیٰ میں پہنچے جہاں حضرت ہاجرہ صفا اور مروہ نامی دو پہاڑیوں کے درمیان ادھر سے ادھر دوڑتی پھری تھیں تاکہ ننھے اسماعیلؑ کی پیاس بجھانے کے لیے پانی فراہم کر سکیں۔ پھر معجزہ رونما ہوا۔ جہاں حضرت اسماعیلؑ نے ریت پر ایڑیاں رگڑی تھیں وہاں قدرت خداوندی سے ایک چشمہ جاری ہو گیا تھا جو آج زمزم کا کنواں کہلاتا ہے۔ ہم صفا اور مروہ کے درمیان ائیر کنڈیشنڈ گیلری میں سات بار سعی کرتے ہیں۔ ماضی میں یہاں بہت سے حاجی لو لگنے اور دل کے دورے پڑنے سے انتقال کر جاتے تھے۔ سعی کی گیلری میں ہدایات درج ہیں کہ یہاں آ کر دوڑنا ہے اور کہاں چلنا ہے جبکہ عورتوں کو صرف چلنے کی ہدایت ہے۔ سعی کے دوران قرآنی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور اللہ اکبر کا ورد کیا جاتا ہے۔ سات دوروں کے بعد میں اور میری بیٹی نے آب زمزم پیا اور اس سے اپنے کپڑے تر کیے۔ زمزم کا پہاڑی چشمہ اب دکھائی نہیں دیتا کیونکہ اس کا پانی سینکڑوں پائپوں کے ذریعے زائرین کو فراہم کیا جاتا ہے۔

عین اس وقت جب ہم چاہ زمزم سے رخصت ہونے والے تھے، حاجیوں کے ہجوم میں ایک ہلچل مچ گئی۔ میں انڈونیشی خواتین کے ایک گروہ کی طرف گئی اور ان سے انگریزی میں پوچھا کہ معاملہ کیا ہے؟ ایک نے بتایا کہ تین آدمی پاؤں تلے کچلے گئے ہیں اور انہوں نے سنا ہے کہ وہ ہلاک ہو گئے ہیں۔ میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ مجھے اپنے شوہر کا خیال آیا کیا کریم کا خواب سچ ثابت ہوا ہے؟ میں اپنی بہن اور

بیٹیوں کی طرف دوڑی۔ میرے منہ سے الفاظ ٹوٹ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ میری آنکھوں میں وحشت تھی۔ سارہ نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا کہ ہوا کیا ہے؟ میں چیخی: ''کریم! میں نے سنا ہے کہ کچھ آدمی پاؤں تلے کچلے گئے ہیں۔ مجھے کریم کی جان کا خطرہ ہے۔''

یہ خیال کر کے کہ میں نے کریم کی لاش دیکھی ہے' میری دونوں بیٹیاں آہ و زاری کرنے لگیں مگر سارہ نے کہا کہ تم نے یہ کیسے فرض کر لیا وہ مردہ آدمی کریم ہی ہوگا۔ میں نے اسے بتایا: ''کریم نے خواب دیکھا تھا کہ وہ حج کے دوران پاؤں تلے کچلا جائے گا۔ اب کچھ لوگ اس جگہ کچلے اور مارے گئے ہیں' جہاں ہم نے کریم کو آخری بار دیکھا تھا۔''

عین اس وقت جب ہم تین گروہوں میں بٹ کر اپنے مردوں کی تلاش میں نکلنے والی تھیں' ہم نے دیکھا کہ اسٹریچروں پر سفید چادروں سے ڈھکے لاشے لائے جا رہے ہیں۔ میں پوری قوت سے بھاگ کر گئی اور باری باری چادریں ہٹا کر مردوں کے چہرے دیکھے۔ مکہ کے ہسپتال کے چار کارکن ہکا بکا رہ گئے کہ یہ عورت تو اپنے حواس میں نہیں' جانے کیا گزرے۔ ان دونوں میں سے کوئی کریم نہ تھا۔ وہ دونوں بوڑھے تھے۔ میں ایک مردے کی چادر اپنے ہاتھ میں تھامے تسکین آمیز لہجے میں چیخ رہی تھی کہ میں اس مردے کو نہیں جانتی۔ اتنے میں کریم' اسد اور دوسرے بیٹے خواتین کا شور وغوغا سن کر اس طرف چلے آئے۔ کریم کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا کہ اس کی بیوی ایک مردے کو دیکھ کر خوشی سے چیخ رہی ہے۔ وہ ہجوم کو چیر کر آگے آیا اور مجھے کلائیوں سے پکڑ کر ہجوم سے باہر کھینچنے لگا ''سلطانہ! کیا تم پاگل ہو؟'' وہ کہہ رہا تھا۔

سارہ نے جب وضاحت کی کہ مجھے کیا خوف لاحق ہو گیا تھا تو کریم کا غصہ جاتا رہا۔ اس دوران ہجوم بڑبڑانے لگا تھا اور لوگ میری طرف انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ خصوصاً جب مردہ حاجیوں کی بیویوں کو پتا چلا کہ میں ان کے شوہروں کی موت پر ایک لگڑ بگڑ کی طرح ہنس رہی تھی تو وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ ہم نے وہاں سے

کھسکنے ہی میں عافیت جانی' جب کہ اسد نے کچھ محافظین کو اپنی شناخت کرا دی۔ ان کا تحفظ پا کر اسد نے مرحومین کے وارثوں کو تین تین ہزار ریال دیئے اور انہیں بتایا کہ ہم شاہی خاندان کے افراد ہیں۔ اس نے مختصراً کریم کا خواب اور میرا خوف بیان کر کے ناراض ہجوم سے معذرت کی۔ اس جگہ سے دور نکل آنے کے بعد ہم سب جو گھبرائے ہوئے تھے' اس واقعے پر ہنسنے لگے۔ وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ جب میرے اس رویے کی ندامت کم ہو گئی تو ہم اسے ایک چلبلا واقعہ جان کر دہرانے لگے۔ آج بھی اسے دہرانے میں بڑا مزا آتا ہے۔

حج کے پہلے دن کے مناسک پورے ہو گئے تو ہم جدہ لوٹ آئے۔ گاڑی میں بیٹھے ہم سب اپنے اس روز کے تجربات ایک دوسرے سے بیان کر رہے تھے۔ صرف امانی خاموش تھی۔ ہم اپنے محل میں داخل ہوئے تو میں نے کریم کو امانی کی پریشان کن خاموشی کی طرف توجہ دلائی مگر اس نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی: "سلطانہ! وہ حج پر آئی ہے۔ کیا سب حاجی خاموشی سے ذکر اذکار نہیں کرتے' ایک تم ہو جو انجانے خوف سے دوچار ہو۔"

میں نے کریم کو لائبریری میں چھوڑ کر مہا کو ڈھونڈا تو وہ اپنی خوابگاہ میں جا کر سو چکی تھی۔ عبداللہ اپنی آنٹی سارہ کے ہاں چلا گیا۔ میں امانی کی خوابگاہ کی طرف گئی اور بند دروازے سے کان لگا کر سنا۔ وہ خدا سے دعا کر رہی تھی۔ اس کے الفاظ سے میرے ذہن میں ایک اور دعا کے الفاظ تازہ ہو گئے جو میں نے مقفل دروازے سے کان لگا کر سنے تھے۔ امانی اسی لہجے میں دعا کر رہی تھی جو میں کمرے میں مقفل اس کے رشتے دار لونڈ کی آواز میں سن چکی تھی۔ میں نے سوچا کہ امانی لونڈ کی راہ پر تو نہیں چل رہی؟

لونڈ' کریم کے والد کی طرف سے اس کی کزن تھی۔ اس کے ماں باپ نے اسے تعلیم کے لیے سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا بھیجا مگر ان کا یہ فیصلہ ایک فاش غلطی ثابت ہوا تھا۔ جنیوا میں لونڈ کئی نوجوانوں کے ساتھ ملوث ہو کر خاندان کے لیے باعث ندامت بن گئی تھی۔ جنسی بے راہروی کے ساتھ اسے کوکین کی لت بھی پڑ گئی تھی۔ ایک شام وہ اپنے

کمرے سے آنکھ بچا کر نکلی تو اس کی ہیڈ مسٹریس نے اسے پکڑ لیا اور سعودی عرب اس کے والد کو اطلاع دے کر کہا کہ اپنی بے راہرو بچی کو ساتھ لے جائے۔

جب خاندان کو لوند کی ان بری سرگرمیوں کی خبر ملی تو اس کے والد اور دو بھائی جنیوا پہنچے۔ وہ اسے ایک ''اصلاح کدے'' میں لے گئے۔ چھ ماہ بعد جب اس کا علاج مکمل ہوا تو وہ اسے واپس سعودی عرب لے آئے۔ پورا خاندان لوند کی ان حرکتوں پر غم و رنج اور ندامت سے دوچار تھا۔ چنانچہ سزا کے طور پر اسے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ وہ گھر میں ایک کوٹھری میں تالا بند رہی حتیٰ کہ گھر والے مطمئن ہو گئے کہ اسے اسلامی اطوار سے ہٹ کر غیر اخلاقی زندگی گزارنے کے اپنے جرم کا احساس ہو گیا ہے۔ لوند کی سزا سے ایک اور واقعہ میرے ذہن میں ابھرا۔ یہ میری بہن طاہانی کی سہیلی سمیرا کا واقعہ تھا۔ سمیرا ایک ذہین اور خوبصورت دوشیزہ تھی جسے عرصہ پہلے اس کی آزادی سے محروم کر کے سزا کے طور پر ''کمرۂ نسواں'' میں بند کر دیا گیا تھا۔ یہاں لوند کو ایک روز رہائی مل گئی تھی، سمیرا کو موت ہی نے مصائب اور ابتلا سے رہائی دلائی تھی۔

لوند کو ایک چھوٹی کھڑکی میں سے کھانا دیا جاتا تھا۔ وہ اپنی ماں اور بہنوں سے رہائی کی التجائیں کرتی تھی مگر بے سود۔ کئی ہفتوں کی نظر بندی کے بعد لوند نے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کیا۔ توبہ کی دعائیں کرنے لگی۔ اس نے اپنے والدین سے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی ایسی غلطی کا ارتکاب نہیں کرے گی۔ مگر اس کے باپ کو اس کے الفاظ کی سچائی پر یقین نہیں آتا تھا۔ ایک روز میں لوند کی ماں کے ساتھ اسے دیکھنے گئی تو اسے اپنی کوٹھری میں دیوانوں کی طرح باتیں کرتے دیکھا۔ میں نے واپس آ کر کریم کو بتایا کہ لوند کا دماغ چل گیا ہے۔ کریم نے اپنے والد سے بات کی، جو اپنے بھائی کے ہاں گیا۔ میرے سسر کے مشورے پر لوند کے والد نے کوٹھری کا بند دروازہ کھولا اور اپنی بیٹی کو آزاد کر دیا۔ لوند کی گیارہ ہفتوں کی نظر بندی نے اسے عبادت گزار بنا دیا۔ آزادی کے دن اس نے گھر والوں کو بتایا کہ سب مسلمانوں کو تعیشات اور بدی سے باز آ جانا چاہیے۔ وہ اپنی دو بہنوں پر جھپٹ پڑی جنہوں نے آنکھوں میں کاجل، گالوں پر غازہ اور ناخنوں

پر پالش لگا رکھی تھی۔ دونوں بہنیں صوفے میں دبک گئیں تو لوند نے اپنی ماں کے گلے سے ایک قیمتی گلوبند نوچ ڈالا اور اس میں جڑے بیش قیمت جواہرات گٹر میں بہا دینے کو لپکی۔ گھر کی عورتوں نے اسے بمشکل اس فعل سے باز رکھا۔ پورے خاندان کو لوند کے باعث پریشانی اٹھانا پڑی اور بعض کو زخم بھی آئے۔ ایک خاندانی معالج نے اسے ٹیکہ لگایا اور کچھ ادویات دیں' تب کہیں وہ پرسکون ہوئی۔

لوند میں تشدد کا جذبہ وقتی طور پر دب جاتا مگر وقتاً فوقتاً شدت کے ساتھ ظاہر ہونے لگا' اس کے ہاتھ جو کوئی لگتا وہ اس کی پٹائی لگا دیتی۔ ایک دن اس نے میری بہن سارہ کے کانوں سے طلائی بالیاں یہ کہتے ہوئے نوچ لیں کہ ایسے زیور پہننے سے اللہ کی آنکھوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس واقعہ کے بعد میں امریکہ گئی تو وہاں سے ''میس'' کا چھوٹا ڈبہ خرید لائی۔ وہ میں نے اپنے سامان میں چھپا دیا۔ حتیٰ کہ کریم کی نظروں سے بھی بچا کر رکھا اور اب میں جب کبھی لوند کے گھر جاتی تو میس کا ڈبہ اپنے دستی بیگ میں ڈال کر ساتھ رکھتی۔

ایک دن سہ پہر میں لوند کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ان کے گھر گئی۔ اس کی والدہ اور دو بہنیں مہمان خانے میں چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ میں ان کو اپنے گزشتہ دورۂ امریکہ کی روداد سنا رہی تھی۔ اچانک لوند کی کیفیت بدل گئی اور وہ بے چین نظر آنے لگی۔ اس کی غضب سے چمکتی ہوئی آنکھیں کسی ایسی شے کی تلاش میں تھیں جو ''خدا کے غضب کو دعوت دینے والی ہو۔'' اس کا پہلا شکار اس کی ماں بنی جس کا لباس اس کے خیال میں ایسا تھا جو کسی مسلمان عورت کے پہننے کے قابل نہ تھا۔ اس نے اپنا نیپکن احتیاط سے تہہ کیا اور اپنی ماں کی گردن اس سے ڈھانپ دی اس کے بعد اچانک وہ میری طرف لپکی۔ مجھے فوراً احساس ہو گیا کہ اس کو میرے موتی جڑے گلوبند پر اعتراض ہے۔ تب مجھے کریم کی اس بات کا خیال آیا کہ کریم نے تاکید کی تھی کہ لوند کے گھر جاتے ہوئے زیورات نہ پہنا کروں مگر اب اس بات کو یاد کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

لونڈ کی کیفیت نے مجھے ڈرا دیا۔ میں نے فوراً اپنے دستی بیگ سے میس کا ڈبہ نکالا اور لونڈ کو ڈرانے دھمکانے لگی کہ وہ کمرے سے چلی جائے یا فوراً نیچے بیٹھ جائے ورنہ میں اس کا برا حشر کر دوں گی۔ اس کی ماں نے چلاتے ہوئے اس کی آستین کھینچی۔ مگر وہ اپنی ماں کو ایک طرف دھکیل کر میری طرف لپکی۔ اس نے مجھے لیمپ اور ایک کرسی کے درمیان تنگ گوشے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

عین اسی وقت سارہ اپنے وعدے کے مطابق مجھ سے ملنے کے لیے لونڈ کے گھر آئی، اس نے اپنی چھوٹی لڑکی کو اپنے بازوؤں میں سنبھالا ہوا تھا۔ جب سارہ نے یہ دیکھا کو لونڈ نے اس کی چھوٹی بہن کو ایک تنگ گوشے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے اور مجھے ہتھیار سے لیس دیکھا تو وہ حق دق رہ گئی۔ پھر اس نے سمجھ داری سے کام لیتے ہوئے لونڈ کو پکارا کہ وہ حماقت سے باز رہے۔ ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ لونڈ گھبرا گئی ہے۔ وہ گھبرا کر اپنے دونوں ہاتھ ملنے لگی مگر یہ صرف ایک دھوکا تھا۔ میں نے اس جنونی پر کوئی اعتبار نہ کیا اور سارہ سے چلا کر کہا وہ بچی کو لے کر کمرے سے نکل جائے۔ میری آواز سن کر لونڈ واپس میری طرف پلٹی اور پھر پاگلوں کی طرح میرا گلوبند نوچنے کے لیے لپکی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے میس کو دبایا۔ لونڈ گھٹنوں کے بل جھکتی چلی گئی۔ میں نے پورا ڈبہ خالی کر دیا اور لونڈ کے ساتھ ساتھ اس کی والدہ اور ایک بہن بھی اس کی لپیٹ میں آ گئیں۔ جلد ہی لونڈ میس کے اثرات سے نکل آئی مگر اس کی لڑنے کی قوت بحال نہ ہوئی۔ اس واقعے کے بعد لونڈ کے والد کو احساس ہو گیا کہ اس کی بیٹی کو طویل المیعاد پیشہ ورانہ معالجے کی ضرورت ہے۔ وہ لونڈ کو لے کر فرانس گئے جہاں وہ ایک برس زیر علاج رہی اور آخر کار مکمل صحت یاب ہو گئی۔

اس دن لونڈ کی والدہ اور اس کی بہن کو فوری طبی امداد کی ضرورت پیش آئی۔ ان کے علاج کے لیے ایک پاکستانی ڈاکٹر آیا تھا۔ جب اس کو بتایا گیا کہ ایک شہزادی نے دوسری تین شہزادیوں کو "میس" کا نشانہ بنایا ہے تو اس کو علاج کرنے میں مشکل پیش آئی۔ جبکہ کریم کے خاندان کا ہر فرد یہ خیال کرتا ہے کہ میں نے لونڈ سے بچاؤ کے

لیے ''میس'' کے استعمال میں جلد بازی سے کام لیا مگر میں اس پر معذرت خواہ ہونے کی بجائے اپنے آپ کو اس عمل میں حق بجانب سمجھتی ہوں اور ان لوگوں سے کہتی ہوں کہ تمہیں میرا شکریہ ادا کرنا چاہیے کیونکہ میرے اس عمل کی وجہ سے لوند کی صحت یابی کی راہ ہموار ہوئی تھی۔

لوند کے اس مذہبی جنون کی وجہ سے میں نے اس شام امانی کی یہ حالت دیکھی تو میں دوڑ کر کریم کے پاس گئی اور اس کو بتایا کہ امانی دعا مانگ رہی ہے۔

کریم اس وقت مکمل انہماک کے ساتھ قرآن پڑھ رہا تھا۔ اس نے مجھے ایسے دیکھا جیسے میری عقل خبط ہوگئی ہو۔ ''دعا مانگ رہی ہے؟'' اس نے پوچھا اس کا لہجہ کچھ اس طرح کا تھا جیسے خدا کی طرف رجوع کرنے پر میرا ردعمل اس کے لیے حیران کن تھا! اس نے قرآن مجید کو اپنی میز پر رکھ دیا اور پھر میرا مذاق اڑاتے ہوئے میری پیروی کرتے ہوئے امانی کے کمرے کی طرف چلا آیا۔ ہم اس راہداری میں پہنچے جس میں امانی کے کمرے کا دروازہ کھلتا تھا۔ وہاں پہنچنے پر ہم نے امانی کی ڈوبتی ابھرتی آواز سنی۔ کریم نے دروازے کو دھکیل کر کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ امانی نے پلٹ کر ہماری طرف دیکھا۔ اس وقت اس کا چہرہ کرب اور تاسف کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کریم نے نرمی سے اس کو مخاطب کیا: ''امانی یہ تمہارے آرام کا وقت ہے' اب سو جاؤ تمہاری امی تمہیں ایک گھنٹے کے بعد رات کے کھانے کے لیے جگا دیں گی۔''

امانی نے کریم کی بات کا کوئی جواب تو نہ دیا لیکن وہ بستر پر چوڑائی کے رخ لیٹ گئی۔ وہ مکمل لباس پہنے ہوئے تھی۔ لیٹنے کے بعد اس نے آنکھیں بند کر لیں مگر اس کے لب اس وقت بھی آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ اس کی دعا کے الفاظ سنائی نہ دے رہے تھے۔ میں اور کریم اس کو اس کے حال پر چھوڑ کر کمرے سے نکل آئے۔ نشست گاہ میں کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کریم نے میرے ان تمام خدشات کو بے بنیاد قرار دیا جو کہ میں نے گناہ' جزا و سزا اور دوزخ کے حوالے سے امانی کے تصور کے متعلق اس کے سامنے پیش کیے تھے۔ اس نے وضاحت کی کہ امانی کا مذہبی رجحان

مذہبی دیوانگی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کا تعلق اس بے پایاں خوشی سے ہے جو اسے حج سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کہا کہ دیکھنا جب ہم روزمرہ زندگی کے معمول پر لوٹ جائیں گے تو امانی کا آوارہ جانوروں کو جمع کرنے کا جنون لوٹ آئے گا اور اس کا مذہبی جنون ہوا ہو جائے گا۔ وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگا: سلطانہ! براہِ مہربانی امانی کو روزمرہ کے معمولات سے ہٹ کر اللہ کی یاد میں سکون پانے دو' یہ تمام مسلمانوں کا فرض ہے۔ میرا ذہنی بوجھ کچھ کم ہو گیا کہ کریم ٹھیک کہتا تھا۔ اس شام میں عبادت کرتے ہوئے گھنٹوں اللہ سے دعا گو رہی کہ اللہ تعالیٰ امانی کو پھر ویسی بچی بنا دے جیسی حج پر جانے سے پہلے تھی۔ تمام رات میں کچھ اس طرح کے خواب دیکھتی رہی کہ امانی میری لاڈلی بیٹی عمان (اردن) چلی گئی ہے اور وہاں وہ ایک انتہا پسند گروہ میں شامل ہو گئی ہے۔ اس گروہ کے ارکان ایسی مسلمان عورتوں کے لباس پر تیل چھڑک دیتے ہیں' جو ان کے خیال کے مطابق اسلامی ستر کے تقاضے پورے نہیں کرتا۔

ایسے محسوس ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میری التجا سن لی ہے کیونکہ اگلی صبح امانی کے چہرے پر مجھے کرب و تاسف کے وہ آثار نظر نہ آئے جو میں نے ایک روز پہلے اس کے چہرے پر دیکھے تھے۔ آج وہ ناشتے میں تازہ دہی اور تربوز کھاتے ہوئے اپنی بہن سے ہنسی مذاق میں مشغول تھی۔

ہمارا ڈرائیور ہمیں مکہ سے تقریباً چھ میل دور منیٰ لے گیا' جہاں رات ہم نے ایک آرام دہ ائیر کنڈیشنڈ خیمے میں بسر کرنی تھی۔ یہ انتظام کریم نے کیا تھا۔ ہم پہلی بار حج کر رہے تھے۔ اس لیے بچے بہت پرجوش تھے۔ لاتعداد بسیں حجاج کرام کو وادیٔ منیٰ کی طرف لیے جا رہی تھیں۔ گزرگاہ کے دونوں طرف لاکھوں حجاج کرام آہستہ آہستہ پیدل مسافت طے کر رہے تھے۔ پوری دنیا سے ہر رنگ اور قومیت کے مسلمان فریضہ حج کی ادائیگی کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سب کی زبان پر اللہ کا نام تھا۔

وادیٔ منیٰ میں قیام کے دوران کریم کو اس کی جوانی کے دنوں کا یوسف نامی دوست ملا' جس کا تعلق مصر سے تھا۔ وہ انگلستان میں دوران تعلیم اس کے ہمراہ تھا۔

دونوں دوست ایک دوسرے سے بڑی محبت سے ملے۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر تھے۔ جب کریم نے اونچی آواز میں اس کا نام پکارا تو مجھے اس اجنبی کا غائبانہ تعارف یاد آ گیا جو کریم مجھ سے کرا چکا تھا۔ ہم جب بھی قاہرہ جاتے اور وہاں اپنے بنگلے میں قیام کرتے تو کریم اپنے زمانۂ طالب علمی کے دوست سے ملنے کے منصوبے بناتا۔ مگر ہماری خانگی زندگی اس قدر بھرپور تھی کہ اس کو اپنے دوست کو تلاش کرنے کا موقع میسر نہ آتا۔

کریم نے مجھے یوسف کی ذہانت اور طور اطوار کے بارے میں بتایا۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ عورتیں اس کی طرف کھینچی چلی آتی تھیں۔ وہ کبھی اکیلا نہ سوتا اور جوا کھیلنے کیسینو بھی جاتا تھا۔ اس کی دوست لڑکیاں ہر ہفتے بدلتی تھیں۔ یوسف نے کریم سے ایک سال پہلے لاء اسکول سے گریجویشن کر لی تھی اور اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے مل نہیں پائے تھے۔

جب دونوں دوست آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے، میں مہا اور امانی کے ساتھ مسجد کے صحن میں بیٹھی تھی مگر ان کی گفتگو ہمیں صاف سنائی دے رہی تھی۔ ان کی باتوں سے معلوم ہوا کہ یوسف اب مکمل طور پر تبدیل ہو چکا تھا۔ اب میرے شوہر اور اس میں کوئی قدر مشترک نہ رہی تھی۔ یوسف اب اسلام کے روایتی طریقوں سے زیادہ وابستہ ہونے کا اظہار کر رہا تھا۔ اس نے کریم کو فخریہ بتایا کہ اس نے دو شادیاں کی ہیں۔ اس نے بتایا کہ پہلے اس نے جس عورت سے شادی کی تھی، اس سے اس کے دو بیٹے تھے۔ پھر اس نے اس عورت کو طلاق دے کر دوسری شادی کر لی۔ اس بیوی سے اس کے پانچ بیٹے تھے اور اس کو سات بیٹوں کا باپ ہونے پر بہت فخر و غرور تھا۔ اس نے پہلی بیوی سے دونوں بیٹے لے لیے تھے۔ اس نے پہلی بیوی کو طلاق دینے کی وجہ یہ بتائی کہ وہ استانی تھی اور گھر سے باہر جانے اور ملازمت کرنے کی خواہاں تھی۔ یوسف کی کوئی بیٹی نہ تھی۔ وہ اس بات پر بہت خوش تھا اور کہتا تھا کہ اس پر خدا کی بہت زیادہ مہربانی ہے کہ اس نے اس کو کوئی بیٹی نہ دی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ جلد ہی مصر میں سیکولر نظام کے ناگوار قوانین کا خاتمہ ہو جائے گا اور مصر میں قوانین محمدی کا نفاذ عمل میں آئے

گا۔

کریم نے اپنے پرانے دوست کو اپنے بچوں کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس کی دو خوبصورت بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے اور وہ تینوں سے یکساں پیار کرتا ہے۔ اس پر یوسف اس کو بیٹوں کے فوائد بتانے لگا۔ اس نے کریم کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسری شادی کر لے اور دونوں بیٹیوں کو بھی پہلی بیوی کو دے دے جبکہ بیٹا خود رکھ لے۔ اس پر میرا دل چاہا کہ اس لعنتی شخص کا منہ نوچ لوں مگر میں کسی بھی کی مداخلت سے باز رہی کیونکہ کریم مجھے ان باتوں میں دخل اندازی سے منع کر چکا تھا۔

کریم نے یوسف کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات یاد دلاتے ہوئے کہا: ''یوسف تم کہتے ہو کہ تم ایک باعمل اور اچھے مسلمان ہو مگر شاید تمہیں پاک پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ الفاظ یاد نہیں جب ایک آدمی آپ کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ آپؐ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس دوران ایک بیٹا اور بیٹی مسجد میں آ گئے۔ لڑکا پہلے آیا' باپ نے شفقت کا مظاہرہ کیا۔ اس کو چوم کر گود میں بٹھا لیا۔ جب لڑکی آئی تو باپ نے اس کو چوما بھی نہیں نہ گود میں بٹھایا بلکہ اس کو سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص سے پوچھا کیا تم اپنے بچوں سے یکساں برتاؤ نہیں کرتے؟ تم نے اپنے بیٹے کی طرح بیٹی کو چوم کر گود میں کیوں نہیں بٹھایا؟ اس پر وہ آدمی بہت شرمندہ ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بیٹے اور بیٹیاں دونوں عطیۂ خداوندی ہیں' لہٰذا ان سے یکساں سلوک کیا کرو۔''

یوسف جنونی اور کٹ حجتی مسلمان تھا۔ وہ اپنے مؤقف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے مغرب میں خاندانی اکائی کی شکست وریخت کا ذکر کرتے ہوئے بولا: ''اللہ نے عورتوں اور مردوں کو مخصوص فرائض تفویض کیے ہیں۔ عورتوں کا فریضہ نسل انسانی کو بڑھانا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ عورت فطری طور پر اپنے حسن و جمال کا اظہار کرنا چاہتی ہے اب یہ مرد کا فرض ہے کہ وہ اس کو دوسرے مردوں کی للچائی ہوئی نگاہوں سے بچا کر رکھے۔''

کریم اپنی بات کا کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر غصے سے یوسف کے پاس سے اٹھ کر آ گیا۔ وہ غصے کی وجہ سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ وہ ہمارے نزدیک آ کر مجھ سے کہنے لگا: ''یہ یوسف تو خطرناک آدمی بن چکا ہے۔'' پھر اس نے موبائل فون پر اپنے بہنوئی شہزادہ محمد سے رابطہ کیا' جو کہ سعودی سیکورٹی میں اعلیٰ افسر تھا۔ کریم نے اس کو یوسف کے انتہا پسندانہ خیالات کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس کی سرگرمیوں کی سخت نگرانی کرائی جائے۔ چند گھنٹوں کے بعد محمد نے فون پر اطلاع فراہم کی کہ یہ آدمی ایک ماہر قانون دان ہے اور وہ مصر کی انتہا پسند تنظیم الجماعۃ الاسلامیہ سے تعلق رکھتا ہے' جو مصری حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے سرگرم عمل ہے۔ کچھ ہی عرصے کے بعد کریم کو یوسف کے بارے میں پتا چلا کہ اس کو اسیوط میں گرفتار کر لیا گیا ہے' جہاں وہ ایک مسلم انتہا پسند گروہ کا سرغنہ بنا ہوا تھا۔ کریم نے اپنے پرانے دوست کو ٹی۔ وی پر پابند سلاسل دیکھا۔ اس کے بعد وہ باقاعدگی سے اپنے دوست کے مقدمے کی کارروائی ٹی۔ وی پر دیکھتا تھا۔ جب اس کو سزائے موت ہوئی تو اس کو قدرے سکون ہوا۔

دورانِ حج ایک رات ہم رات کا کھانا کھانے کے بعد اکٹھے بیٹھے تو یوسف موضوع بحث بن گیا۔ ہم نے بچوں سے ان کے خیالات سنے۔ سب سے پہلے عبداللہ نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسلام جارحانہ پیش رفت کر رہا ہے اور انتہا پسند گروہ سعودی بادشاہت ختم کرنے کے چکر میں ہیں۔ سعودی عرب میں بھی ایران کی طرح کا انقلاب آئے گا۔ اس کا خیال تھا کہ السعود خاندان کو فرنچ ریویرا میں پناہ لینی چاہیے۔ یہ بات عبداللہ کے لیے پریشانی کا باعث تھی۔

یوسف کے عورتوں کے متعلق مخالفانہ خیالات سن کر مہا غصے میں آ گئی۔ اس کا کہنا تھا کہ یوسف کو جاسوسی کے الزام میں فوراً گرفتار کر لینا اور اس کا سر قلم کر دینا چاہیے۔ امانی نے کہا کہ یہ مسلمانوں کی مغربی اشیاء سے محبت کرنے کا نتیجہ ہے کہ اسلامی ممالک میں یوسف جیسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں۔ ہم لوگوں نے امانی کی اس بات کو ناپسند کیا۔ مہا نے اپنی بہن کے چٹکی لیتے ہوئے اس پر الزام لگایا کہ وہ یوسف کی حمایت کر

رہی ہے۔ اس پر امانی نے تردید کرتے ہوئے کہا: ”میرا ہرگز یہ مقصد نہیں۔ میں صرف یہ کہتی ہوں کہ معاشرے میں جب خواتین کا کردار محدود تھا تو زندگی بہت سادہ تھی اور شہروں کی تعمیر سے پہلے بدوی زندگی میں مرد اور عورتیں آج کی طرح پریشان نہ تھے۔“

مجھے جو اندیشہ تھا وہ بات میرے سامنے آ گئی۔ میری بیٹی کے خیالات و افکار ماضی سے وابستہ تھے اور وہ اپنی نسوانیت پر فخر کھو رہی تھی۔ اس کو جدید عورت بننے کا کوئی شوق نہ تھا۔ عبداللہ نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا: ”کیا تم اس دور میں واپس جانا چاہتی ہو جب لڑکیوں کو ریت میں دفن کر دیا جاتا تھا؟“

کریم نے یہ جانتے ہوئے کہ امانی کی دماغی حالت نازک ہے' عبداللہ کو ڈانٹا کہ اس کی بات مذاق میں اڑانے کی نہیں۔ پھر اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کا ایک واقعہ سنایا کہ ایک عرب قبیلے میں بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینے کا رواج تھا۔ اس قبیلے کے سردار کا نام قیس بن عاصم تھا۔ جب قیس نے اسلام قبول کیا تو اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک خوفناک واقعہ سنایا۔ اس نے کہا:

”یارسول اللہ! میری بیوی کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جبکہ میں اپنے گھر سے باہر سفر پر تھا۔ بیوی کو خوف تھا کہ میں بچی کو زندہ دفن کر دوں گا۔ چنانچہ چند روز بعد اس نے اپنی بیٹی کو اپنی بہن کے گھر بھیج دیا۔ جب میں سفر سے واپس آیا تو مجھے اطلاع دی گئی کہ میری بیوی کے ہاں مرا ہوا بچہ پیدا ہوا تھا۔ اس طرح معاملہ ختم ہو گیا۔ اس عرصہ میں میری بیٹی اپنی خالہ کے گھر پلتی رہی۔ ایک دفعہ مجھے تمام دن گھر سے باہر رہنا پڑا تو میری بیوی نے ممتا کے جذبے سے مجبور ہو کر بیٹی کو اپنے گھر بلا لیا۔ مگر میں غیر متوقع طور پر اپنا پروگرام بدل کر وقت سے پہلے گھر آ گیا۔ جب میں گھر میں آیا تو میں نے ایک پیاری سی بچی کو صحن میں کھیلتے پایا۔ میں نے اس کو محبت بھری نگاہ سے دیکھا۔ اس بات سے میری بیوی یہ سمجھی کہ میرا دل بیٹیوں کے معاملے میں نرم ہو گیا ہے۔ جب میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ کس کی لڑکی ہے تو اس نے مجھے تمام بات بتا دی اور میری بیٹی سے کہنے لگی کہ یہ تمہارے ابو ہیں۔ لڑکی پیار سے ابو ابو کہتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی۔

میں بہت خوش ہوا۔ میں نے اسے گود میں اٹھالیا اور پیار کیا۔

وقت گزرتا گیا اور بچی ہمارے ہاں پیار محبت کے ساتھ پلتی رہی لیکن بعض اوقات مجھے یہ خیال بے چین کر دیتا کہ ایک دن ایسا آئے گا جب مجھے اپنی بیٹی کا ہاتھ کسی اور مرد کے ہاتھ میں دینا پڑے گا' یہ اس کی بیوی بنے گی۔ یہ خیال میرے لیے بہت پریشان کن اور شرمندہ کرنے والا تھا۔ یہ خیال میرے دل اور ذہن کو رہ رہ کر تنگ کرتا تھا۔ ایک دن میرا صبر و تحمل ختم ہو گیا۔ میں نے بچی سے چھٹکارہ پانے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے اپنی بیوی کو کہا کہ وہ بچی کو تیار کر دے' میں اس کو ایک دعوت پر اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ میری بیوی نے بچی کو نہلا دھلا کر خوبصورت کپڑے پہنا دیئے۔ میں اسے اپنے ساتھ لے کر گھر سے باہر نکلا۔ وہ میرے ساتھ شرارتیں کرتی اور توتلی زبان میں باتیں کرتی چل رہی تھی۔ آخر کار ہم ایک سنسان جگہ پر جا پہنچے۔ یہاں ٹھہر کر میں نے ایک گڑھا کھودنا شروع کیا۔ بچی وقفے وقفے سے مجھ سے پوچھتی ابو آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ مٹی کیوں کھود رہے ہیں؟ مگر میں نے اس کی باتوں پر توجہ نہ دی۔ گڑھا کھودتے ہوئے میرے اوپر مٹی گر رہی تھی۔ بچی اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے مٹی جھاڑ دیتی تھی۔ گڑھا تیار کر کے میں نے بچی کو اس کے اندر پھینک دیا اور اوپر تیزی سے مٹی ڈالنے لگا۔ بچی چیخ چلا رہی تھی مگر مجھے اس پر رحم نہ آیا۔ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس قدر پتھر دل تھا کہ مجھے اپنی معصوم بچی پر بالکل رحم نہیں آیا بلکہ اس کو زندہ دفن کر کے میں نے سکھ محسوس کیا۔

جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دردناک واقعہ سنا تو آپ کے آنسو بہنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عاصم کے سردار سے کہا: ''یہ سراسر ظلم ہے' جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ تعالیٰ رحم نہیں کرتا۔''

بچے بہت دلچسپی سے سن رہے تھے۔ کریم نے عہد نبوی کا ایک اور واقعہ سنایا۔ ایک شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے آپ کو بتایا: ''اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے اور اپنے ہاتھوں سے اپنی

بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ میری ایک بہت پیاری ننھی منی بچی تھی جب میں اسے اپنے پاس بلاتا تو وہ خوشی خوشی میری طرف دوڑی آتی ایک دن میں نے اس کو بلایا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا۔ وہ بہت خوش ہوئی اور میرے ہمراہ چل دی۔ میں اسے ایک کنویں پر لے گیا وہ ویران تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس ویران کنویں میں پھینک دیا۔ بچی چیختی چلاتی اور مجھے پکارتی رہی۔ اس کے معصوم لبوں پر آخری لفظ تھا۔

"ابو!"

اس دل کو تڑپا دینے والے واقعہ کو سن کر حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم اتنا روئے کہ آپؐ کی داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آنسوؤں سے ہماری جہالت کو دھو دیا اور آج بچیوں کو زندہ دفن کرنا یا کنوؤں میں پھینکنا اسلامی تعلیمات کی رو سے گناہ عظیم اور انتہائی ظالمانہ فعل ہے۔

اس پر میں نے کہا کہ آج کل بعض اسلامی ممالک میں عورتوں پر ناروا پابندیوں میں جکڑنے والی جو بندشیں ہیں یہ انہی بچی کھچی قدیم ظالمانہ روایات کی عکاسی کرتی ہیں حالانکہ قرآن ان پابندیوں کی نفی کرتا ہے۔ اس پر یہ بحث شروع ہو گئی کہ آخر عورتیں خوامخواہ مردوں کے سامنے مجبور کس لیے ہیں جبکہ ان کو فطرت نے جو صلاحیتیں ودیعت کی ہیں وہ کسی طرح بھی مردوں سے کم نہیں۔ اس پر امانی نے عبداللہ کو یہ بات یاد دلائی کہ اسکول میں ہر مضمون میں تمہارے نمبر اس سے کم آتے ہیں۔ اسے اس بات پر بھی افسوس تھا کہ وہ کیوں ایسے معاشرے میں پیدا ہوئی ہے جو معاشرتی تبدیلیوں کے خلاف ہے۔

☆☆☆

جبل عرفات کی ڈھلان پر چڑھتے ہوئے میں لبیک اللھم لبیک کا ورد کر رہی تھی۔ اس دن اللہ تعالیٰ اپنے گناہگار بندوں کے گناہ بخش دیتا ہے۔ یہاں پر میرے ذہن میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری تاریخی خطبے کے درج ذیل الفاظ تازہ ہو گئے جو آپ نے میدان عرفات میں اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمائے تھے:

"تمہیں اپنے رب کے سامنے پیش ہونا ہے جو تم سے تمہارے
اعمال کا حساب لے گا۔ جان لو کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی
بھائی ہیں۔ تم ایک ہی برادری ہو' کوئی شخص اپنے بھائی کی کوئی
شے اس کی آزادانہ مرضی کے بغیر نہ لے۔ بے انصافی سے باز رہو'
جو یہاں موجود ہیں وہ یہ باتیں ان لوگوں کو بتا دیں جو یہاں
موجود نہیں۔ ہوسکتا ہے بعد میں سننے والا پہلے سننے والے کی نسبت
بات کو بہتر طور پر یاد رکھنے والا ہو۔"

میں اور میرے اہل خانہ صحرا کی ریت پر لاکھوں حاجیوں کے ساتھ پانچ گھنٹے کھڑے رہے۔ ہم قرآنی آیات پڑھ رہے تھے۔ میری بچیوں نے اپنے اوپر چھتریوں سے سایہ کیا ہوا تھا۔ مگر میں نے کڑی دھوپ برداشت کرنے کو ترجیح دی۔ میرے اردگرد کئی مرد اور عورتیں لو لگنے سے بے دم ہو رہے تھے۔ رضا کار انہیں سٹریچروں پر ڈال کر ایمبولینس گاڑیوں کی طرف لے جا رہے تھے تاکہ ان کو ہسپتال لے جایا جائے۔ مزدلفہ عرفات اور منیٰ کے درمیان واقع ہے' ہم وہاں غروب آفتاب کے وقت پہنچے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد ہم نے نمازیں ادا کیں۔ عبداللہ اور کریم نے اگلی صبح شیاطین کو مارنے کے لیے کنکریاں اکٹھی کیں۔ اس آخری رات ہم نے آرام کیا۔ آرام کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے حج کے آخری دن کی تیاری کی۔

پتھر کے ستون جنہیں جمرات کہا جاتا ہے' شاہراہ منیٰ کے ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے شیطان کو کنکریاں مار کر بھگایا تھا' جب وہ ایک بزرگ کی شکل میں آپ کو یہ کہہ کر ورغلا رہا تھا کہ خواب میں دیئے گئے اللہ کے حکم کے مطابق اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو ذبح نہ کرو کیونکہ خواب جھوٹے ہوتے ہیں۔ اس واقعے کی یاد میں آخری صبح ہم نے بسم اللہ پڑھ کر شیطان سے نفرت کا اظہار کیا اور اللہ اکبر کہتے ہوئے پتھر کے ستون یعنی جمرات پر سات' سات کنکریاں پھینکیں' جو شیطان کی علامت ہیں۔ ہم گناہوں سے پاک ہو گئے۔ اس کے بعد ہم میدان منیٰ کی طرف چلے آئے' جہاں

حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے بکرے اور اونٹ ذبح کیے جا رہے تھے۔ قصاب اپنی اجرت لیتے اور دنبے، مینڈھے یا بکرے کو زمین پر لٹاتے اور گردن پر چھری چلا دیتے۔ اللہ کی راہ میں خون بہتا اور کھال اتار لی جاتی۔ ہم نے بھی خدا کی تسلیم و رضا کے لیے قربانی کی۔ کھال اتارنے کے لیے قصاب ذبح شدہ جانوروں کی ٹانگوں میں ایک چھوٹا سا چیرا دیتا اور منہ سے اس میں ہوا بھرتا تا کہ کھال گوشت سے الگ ہو جائے ہوا بھرنے کی وجہ سے کھال پھول جاتی اور قصاب ایک مضبوط چھری کی مدد سے جانور کے جسم کو تھپتھپاتا تا کہ ہوا یکساں طور پر پھیل کر اس کی کھال کو آسانی سے اتارنے میں مدد دے۔ ذبح ہوتے جانوروں کا خون بہتا دیکھ کر اور چیخیں سن کر امانی پاگلوں کی طرح چلانے لگی اور بے دم ہو کر زمین پر گر گئی۔ کریم اور عبداللہ اسے قریبی ٹرالر تک لے گئے جہاں کمزوروں اور ضعف قلب کے مریضوں کو طبی امداد دی جاتی تھی۔ باپ بیٹے نے واپس آ کر بتایا کہ امانی کو بستر پر آرام سے لٹا دیا گیا ہے لیکن پھر بھی وہ چیخ چلا رہی ہے۔

اختتام حج کے موقعہ پر ہم نے اپنے سر کے بال کاٹے اور احرام کے سادہ لبادے اتارے کر رنگ دار ملبوسات زیب تن کیے۔ جب کہ مردوں نے صرف سوتی ثوب پہن لیے۔ اس سہ پہر اصل دعوت کی ابتدا ہوئی۔ امانی کا رنگ اب تک زرد تھا۔ مگر وہ اتنی صحت یاب ہو چکی تھی کہ گھر والوں کی خوشیوں میں شریک ہوتی۔ اس نے گوشت کھانے سے سختی سے انکار کر دیا۔ ہمارا خاندان اپنے رہائشی خیمے میں اکٹھا ہو گیا۔ ہم نے ایک دوسرے کو تحائف دیئے اور پر جوش طریقے سے حج کی مبارک باد دی۔ نماز کی ادائیگی کے بعد ہم کھانا کھانے کے لیے دستر خوان پر بیٹھ گئے اور چاولوں کے ساتھ مینڈھے کا گوشت کھایا۔ دعوت کے بعد جو سامان خورونوش بچ گیا اس کو ہم نے غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ بہت سے حجاج کرام نمازوں کی ادائیگی کے لیے مکہ ہی میں ٹھہر گئے تھے۔ مگر ہم لوگ جدہ میں اپنے گھر آ گئے۔

میرے بیٹے اور بیٹیاں اپنے ناموں کے ساتھ حاجی کہلوانے کے حقدار ہو گئے

تھے۔ مگر میں یہ جانتی تھی کہ وہ ایسا نہیں کریں گے۔ یہ احترام کا لقب تمام مسلمانوں کو اس بات کی یاد دلاتا ہے کہ مذکورہ شخص نے اسلام کا پانچواں رکن ادا کر لیا ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنے رب سے دعا کی کہ وہ میری بیٹی امانی کو انتہا پسندانہ رجحانات سے بچائے' جو ظاہراً اس کی روح اور ذہن کو گرفتار کیے ہوئے تھے لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ معلوم نہیں میں نے خدا کو رضامند کیا تھا کہ نہیں مگر اپنی بیٹی کے متعلق اس کے فیصلے پر مجھے خوشی نہ ہوئی۔ مکہ مکرمہ کا یہ سفر بعد میں میرے خاندان کے لیے خوش قسمتی اور بدقسمتی دونوں کا حامل رہا۔ میرے اور کریم کے ازدواجی تعلقات میں شادی کے اولین برسوں جیسی شدت پیدا ہو گئی۔ مہا اور عبداللہ میں ذمہ داری کا احساس بڑھا اور وہ ملک کے ذمہ دار شہری بن گئے مگر امانی کے بارے میں میرے خدشات سچ بن کر سامنے آئے۔ امانی تکلیف دہ تنہائیوں میں گم ہو رہنے لگی۔

☆☆☆

حج کی ادائیگی کے بعد ہم جدہ آ گئے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ اگلے دن ہم ریاض جائیں گے مگر اس پروگرام میں اچانک تعطل پیدا ہو گیا کیونکہ کریم نے بتایا کہ ائیر ٹریفک کنٹرول کے مطابق ریت کا ایک شدید طوفان ربع الخالی کے صحرا سے ریاض کی طرف بڑھ رہا ہے۔ عام دنوں میں بھی ریاض پر ہزاروں ٹن ریت برستی ہے۔ جبکہ یہ تو ایک شدید طوفان تھا' جس میں ریت جسم کے مسام بند کر دیتی ہے۔ یہ ریت آنکھوں میں گھس کر تکلیف کا باعث بنتی ہے' اس لیے کریم نے پرواز منسوخ کرا دی۔ مجھے اس تعطل سے بہت خوشی ہوئی کہ اس بہانے کچھ اور دن جدہ کی مرطوب آب و ہوا میں گزاریں گے۔ عبداللہ اور مہا بھی اس پروگرام سے بہت خوش تھے کیونکہ ان کے لیے بحیرۂ احمر کے نیلگوں پانی میں بہت دلکشی تھی۔ وہ اس میں تیرنا پسند کرتے تھے۔ بحیرۂ احمر ہمارے محل کی چار دیواری سے نظر آتا تھا۔ ہم نے مزید دو ہفتے جدہ میں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا لیکن میری بیٹی امانی ہم سب سے الگ تھلگ تھی۔ وہ اپنے کمرے میں قرآن مجید لیے بیٹھی رہتی تھی۔ وہ اس میں کھوئی رہتی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اپنے اردگرد کی کوئی خبر

نہ ہو۔ حالانکہ اس سے پہلے وہ جدہ آ کر بحیرۂ احمر کے نیلگوں پانی میں تیرتے نہیں تھکتی تھی۔ ایک دن میں گارڈن روم کی طویل غلام گردش میں گھٹنوں کے بل جھکی دروازے کے ساتھ کان لگائے یہ سننے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ کیا پڑھ رہی ہے؟ اسی اثنا میں باغیچے سے مہا نے مجھے اس حالت میں دیکھ کر پکارا: ''امی! آپ کیا کر رہی ہیں؟'' اصل میں وہ میری نیت کا اندازہ لگا چکی تھی۔ دفعتاً امانی اپنی جگہ سے اٹھی اور دروازے کی طرف آئی۔ میں نے گھبرا کر اٹھنا چاہا تو میرے جوتے کی ایڑی میرے لباس کے حاشیے میں الجھ گئی۔ اتنے میں امانی نے دروازہ کھول دیا۔ میں اس دوران بمشکل سیدھی کھڑی ہو سکی۔ میری بیٹی مجھے گھور رہی تھی۔ میں نے اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے قالین کی طرف اشارہ کیا اور کہا: ''میری جان! کیا تم نے اس پر یہ سرخ دھبے دیکھے ہیں؟ نوکر بڑے کام چور ہو گئے ہیں۔ صفائی پر دھیان نہیں دیتے۔'' امانی نے میرے جھوٹ کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہا: ''یہ دھبے نہیں، یہ تو قالین پر بنے ہوئے سرخ گلاب ہیں۔'' مہا بھی اس دوران وہاں آن پہنچی تھی اور اس کی دبی دبی ہنسی مجھے خفت میں مبتلا کر رہی تھی جبکہ امانی کے ان الفاظ نے مجھے بہت شرمندہ کیا۔ ''امی! اگر آپ مجھے سننا چاہتی تھیں تو بخوشی کمرے کے اندر تشریف لے آتیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے گارڈن روم کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔

میری آنکھوں سے آنسو بہنا شروع ہوئے۔ جب سے ہم مکہ سے واپس آئے تھے۔ امانی نے سر سے لے کر پاؤں تک سیاہ لباس پہننا شروع کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ موٹی کالی جرسی اور لمبے سیاہ دستانے بھی پہننے لگی تھی۔ وہ اپنے خوبصورت سیاہ بالوں کو ایک سیاہ سکارف میں لپیٹے رکھتی، جس سے وہ مجھے ایک یمنی چرواہی لگتی۔ حتیٰ کہ گھر کی خلوت میں بھی صرف اس کا چہرہ برہنہ ہوتا اور جب محل کی چار دیواری سے باہر جانا ہوتا تو وہ چہرے پر موٹے سیاہ کپڑے کا نقاب ڈال لیتی۔ حالانکہ جدہ کے مطوعین ریاض کے مطوعین کی طرح بے نقاب چہروں کو سبق سکھانے میں زیادہ سخت نہ تھے۔

امانی کا یہ مذہبی جذبہ یہاں تک محدود نہ تھا بلکہ بات بڑھ چکی تھی۔ وہ دوسروں

کو بھی اپنا ہم خیال بنانا چاہتی تھی۔ اسی لیے اس نے آج اپنی چند قریب ترین سہیلیوں اور چار کزن لڑکیوں کو اپنے ہاں بلوایا ہوا تھا۔ وہ ان کو قرآن و حدیث کا درس دینا چاہتی تھی۔ جیسے حکومتی ادارے کے لوگ حق بات رائج کرنے کے لیے کرتے تھے۔ جب میں اپنے کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے بستر پر آڑی لیٹ گئی تب بھی امانی کی بچگانہ آواز میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ میں نے امانی کو قرآن کی آیات پڑھتے ہوئے سنا تھا۔

میں اس وقت خوف سے کانپ اٹھی جب امانی نے سعودی شاہی خاندان کے افراد کو ان گناہگاروں سے مشابہہ قرار دیا' بے قرار رہا جن کا ذکر قرآن کی ان آیات میں کیا گیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی: ''اپنے اردگرد دیکھو جس گھر میں میں بات چیت کر رہی ہوں اس کی دولت اور شان وشوکت دیکھو' ایسی شان وشوکت کا صرف اللہ ہی سزا وار ہے۔ کیا ہم یہ قیمتی اور پر تعیش طرز زندگی اپنا کر اللہ کے احکامات کی خلاف ورزی نہیں کر رہے؟ ہمیں اپنی زندگیوں سے اسراف کو ختم کر دینا چاہیے۔ اس کے لیے میں پہلی مثال خود پیش کروں گی۔ مجھے اپنے خاندان کی طرف سے جو ہیرے جواہرات ملے ہیں وہ میں غریبوں میں تقسیم کر دوں گی۔ اگر تم لوگ بھی خدا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر یقین رکھتی ہو تو تمہیں بھی اس مثال کی پیروی کرنا ہو گی۔''

میں اپنے بستر سے اٹھی اور امانی کی خوابگاہ کی طرف گئی۔ کمرے کے اندر جا کر میں نے دونوں بہنوں کی مشترکہ الماری کھول کر قیمتی گلوبند' بالیاں' ہار اور انگوٹھیاں وغیرہ نکال کر کریم کے دفتر کی ایک الماری میں رکھ دیئے اور الماری کو مقفل کر دیا۔ میں امانی کے زیورات کے ساتھ ساتھ مہا کے زیورات بھی نکال لائی تھی۔ کیا پتا مذہبی جنون میں مبتلا میری بیٹی کیا کر گزرتی! صرف امانی کے جواہرات کی مالیت کئی ملین ڈالر تھی۔ میں نے دل میں سوچا اگر امانی واقعی غریبوں کی مدد کرنا چاہے گی تو اس مقصد کے لیے اس کو نقد رقم دی جا سکتی ہے۔ میں اور کریم کئی برسوں سے کئی ملین ریال غریبوں میں بغیر کسی پر ظاہر کیے بانٹتے آ رہے تھے اور جو زکوۃ ہم پر واجب تھی اس کے علاوہ بھی ہم اپنی آمدنی کا مزید پندرہ فیصد مختلف غریب مسلم ممالک میں تعلیمی مقاصد اور طبی ضرورتوں پر

خرچ کرتے تھے۔ ہم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کبھی نہیں بھلایا:

"اگر تم زکوۃ علانیہ دو تو ٹھیک ہے لیکن اگر ضرورت مندوں کو خفیہ طریقے سے دو تو یہ تمہارے لیے کہیں بہتر ہے اور یہ تمہارے بعض برے اعمال کا کفارہ بن جائے گی۔ اللہ ان تمام کاموں سے آگاہ ہے، جو تم کرتے ہو۔"

میں نے حیرت زدہ ہو کر سوچا کہ ہم غریب مسلم ممالک میں ہسپتالوں، اسکولوں اور رہائش کی سہولتوں پر بھاری رقوم خرچ کرتے ہیں۔ امانی کی نگاہ میں یہ سب امداد غیر اہم ہے؟ اور کیا وہ چاہتی ہے کہ ہم بھی ان لوگوں کی طرح فقیر ہو جائیں جو اس وقت ہماری امداد کے محتاج ہیں؟ ان سوچوں میں ڈوبی میں واپس اپنے کمرے میں آئی اور دو گھنٹے اپنے بستر پر لیٹی رہی۔ جب کریم اندر داخل ہوا تو اس وقت کمرے میں اندھیرا پھیل رہا تھا۔

سلطانہ! خیر تو ہے؟ یہ کہتے ہوئے اس نے تمام بلب روشن کر دیئے اور آ کر میرے چہرے پر جھک گیا۔ اس نے پوچھا: "کہیں تمہیں بخار تو نہیں؟"

میں نے گہرا سانس لیتے ہوئے تکلیف کے ساتھ کہا: "کریم! تمہارا ہی خون، یعنی ہماری اولاد سعودی سلطنت کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہی ہے۔" کریم کے چہرے کا رنگ بدل گیا وہ سرخ ہو گیا "کیا کہا؟" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ اپنا ہاتھ بمشکل بلند کرتے ہوئے میں بولی: "آج ہماری بیٹی امانی نے، نوجوان شہزادیوں اور اپنی سہیلیوں کی ایک میٹنگ بلائی ہوئی تھی۔ میں نے اتفاقیہ طور پر اس کی باتیں سن لی ہیں۔ وہ اپنی نوجوان کزنوں اور سہیلیوں کو اپنے خاندان کی قیادت کے خلاف ورغلانے کے لیے قرآن کو استعمال کر رہی ہے۔"

کریم کو میری بات پر یقین نہ آیا۔ اس نے کہا: "سلطانہ! تم پاگل ہو گئی ہو۔ امانی سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ تشدد کا پرچار کرے گی۔"

"اب وہ پہلے جیسی نہیں رہی۔ ہماری بچی کے ذہن پر مذہب سوار ہو گیا ہے۔

وہ اب ایک معصوم میمنے کی بجائے بھوکی شیرنی دکھائی دیتی ہے۔'' میں نے اپنے شوہر کی سوچ کی نفی کرتے ہوئے بتایا۔

کریم بولا: ''سلطانہ! یقین کرو امانی کا یہ جوش و جذبہ جلد ہی ختم ہو جائے گا۔ اسے نظرانداز کر دو۔'' اس طرح کی باتیں کر کے اس نے امانی کے متعلق میری تشویش کو مذاق میں اڑا دیا۔ میں اور کریم عشائیے سے پہلے ہوا خوری کے لیے باغیچے میں آ گئے جہاں پیار بھری مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ پھر ہم خوبصورت وسیع صحن میں آ گئے۔ ایک اطالوی ڈیزائنر نے اس بے مثال ٹرکش روم کا ڈیزائن تیار کیا تھا۔ ہمارے کئی کزنوں نے بعد میں اس کی نقل کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ کمرے کے عقب میں آبشار کا پانی ایک بڑے گول تالاب میں گرتا ہے۔ جس میں نایاب مچھلیاں تیرتی ہیں۔ تالاب کے گرد نفیس پتھروں کی روش ہے اور اس کے ساتھ ساتھ خوبصورت پھولوں کے پودے ہیں۔ دائیں بائیں دو چبوترہ نما نشست گاہیں ہیں، جن پر نیلگوں گاؤ تکیے رکھے ہیں۔ ان نشست گاہوں میں رتن کی لکڑیوں کا فرنیچر ہے، جن پر تھائی لینڈ سے لائی گئی سرسبز و شاداب بیلیں سایہ فگن ہیں۔ ان کے آگے میزیں رکھی ہیں جو شیشے سے آراستہ ہیں۔ ٹرکش روم کی دیواریں ہلکے رنگ کے خاص شیشے سے بنی ہیں۔ بیلوں کا سائبان اس قدر گھنا ہے کہ سورج کی گرم شعاعیں ہم تک نہیں پہنچ پاتیں۔ روش کے پتھروں پر جنگلی جانوروں کی شبیہیں کندہ ہیں۔ ایک زرافے کے چہرے پر قدم رکھتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ یہ حیوانی کندہ کاری کریم نے خاص طور پر اپنی حیوان دوست بچی امانی کے لیے کرائی تھی۔

روش پر چلتے چلتے ہم ٹرکش باتھ کے علاقے میں پہنچ گئے۔ ہمارے قاہرہ والے محل میں بھی ایسا کمرہ موجود ہے۔ میں نے اطالوی ڈیزائنر سے کہہ کر ویسا ہی ڈیزائن اپنے جدہ والے محل میں بنوایا تھا۔ یہاں چار حمام ہیں۔ ہر حمام میں سیڑھیاں اترتی ہیں اور ایک بڑے حمام پر پتھر کا محراب دار پل ہے۔ پانی سے بھاپ اٹھ کر خنک ہوا میں گھل مل رہی تھی۔ میں نے کریم کو بتایا کہ امانی اب عورتوں کے امام بننے کی باتیں

کرتی ہے۔ میں یہ تو چاہتی تھی کہ وہ ایک اچھی مسلمان بنے مگر اس بات کی خواہش مند نہیں تھی کہ وہ کٹر عقائد پر کاربند ہو۔ جب کریم نے میری اس تشویش پر کان نہ دھرے تو میں نے اس کی دکھتی رگ چھیڑی۔ میں نے کہا: ''کریم! یہ جو ہم نے ٹرکش باتھ بنوایا ہے' وہ اسے گناہ عظیم خیال کرتی ہے۔''

کریم خاموش رہا تو میں نے مزید چٹکی لی ''کریم! کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا ہی گوشت پوست اس بغاوت کی رہنمائی کرے جو آل سعود کا تختہ الٹ دے؟''

لیکن کریم نے معاملے کی سنگینی نظرانداز کرتے ہوئے کہا: ''سلطانہ! یہ ناخوشگوار موضوع یہیں دفن کر دو۔ اگر امانی کو مذہب میں سکون ملتا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔'' ہم ریاض میں اپنے گھر واپس آ چکے تھے۔امانی ہر سہ پہر یہاں بھی درس قرآن کی مجلس منعقد کرنے لگی تھی۔ ایک بدھ کی سہ پہر میں نے اپنی خوابگاہ کی بالکنی سے دیکھا کہ اس کی دیگر سب سہیلیاں اور رشتے دار لڑکیاں ایک ایک کر کے رخصت ہو گئیں' میری بھتیجی اور علی کی بیٹی فاتن بھی چلی گئی تو میں نے آہستگی سے امانی کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے امانی کے رونے کی آواز سنی تو بے اختیار دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوگئی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی' اس کے ایک ہاتھ میں قرآن تھا اور وہ دوسرے ہاتھ سے اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میں نے پیار سے اس کے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے مجھ سے لپٹ کر ہچکیاں لیتے ہوئے کہا: ''امی! ایک خوفناک گناہ کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ اللہ نے مجھے اشارہ کیا ہے کہ اس گناہ کو افشا کر دوں۔''

''کون سا گناہ؟'' میں نے چیخ کر کہا۔ میں سمجھی شاید امانی کو مہا کے اپنی سہیلی عائشہ کے ساتھ غیر فطری تعلقات کا پتا چل گیا ہے۔

''فاتن نے مجھے ایک راز سے آگاہ کیا ہے جو اس قدر خوفناک گناہ ہے کہ میری روح کو کھائے جا رہا ہے۔'' امانی نے کہا۔

مجھے یہ جان کر قدرے اطمینان ہوا کہ وہ مہا کی بات نہیں کر رہی' پھر میرا ذہن خاندان سعود کے مردوں کے جنسی اسکینڈلوں اور جوا بازیوں کی طرف چلا گیا۔

مغرب میں خاندانی تعطیلات گزارنے کے بعد کوئی سعودی شہزادہ وطن لوٹتا ہے تو پیچھے اس کے ایک آدھ ناجائز بچے کی پیدائش متوقع ہوتی ہے۔ خود میرا بھائی علی جب نوجوانی میں امریکہ میں مقیم ہوتا تو وہاں بے شمار گوریوں سے تعلقات اس کا من پسند مشغلہ تھا اور جب وہ شادی شدہ ہو گیا تو اپنی بیویوں سے کنیزوں کا سا برتاؤ کرتا۔ وہ نوخیز کلیوں سے بیاہ رچاتا تاکہ وہ مرد کی فطرت کے بارے میں کم ہی جان سکیں' چار منکوحہ بیویوں کے علاوہ گھر میں یکے بعد دیگرے لونڈیاں رکھتا تھا۔ اسی طرح علی کا بیٹا ماجد ایک اذیت پسند نوجوان بن کر ابھرا تھا جو عورتوں کو جنسی اشیاء سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ وہ ہسپتالوں اور غیر ملکی ہوائی کمپنیوں کی غیر مسلم نرسوں اور ائیر ہوسٹسوں کے ساتھ تفریحی شاموں سے لطف اٹھاتا تھا۔

امانی نے راز افشا کرتے ہوئے کہا: ''امی! گناہ کا ارتکاب کرنے والا ماجد ہے' اس نے جنسی گناہ کیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ سسکیاں لینے لگی۔ مجھے اس انکشاف پر حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے بمشکل سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا: ''امانی! اگر تم اس مسئلے کو اچھالو گی تو ہمارے خاندان کے مرد اس پر فقط ہنس دیں گے۔ علی کو مغربی عورتوں سے اپنے بیٹے کے تعلقات پر فخر ہے اور اس نے ماجد کو اپنے ملک میں بھی ایسی حرکتوں سے کبھی نہیں روکا۔''

میں اٹھی اور کریم کو بلا لائی۔ اس اثنا میں امانی کے آنسو غائب ہو گئے تھے اور اس کی مرکوز نگاہوں سے لگتا تھا کہ وہ کسی نتیجے تک پہنچ گئی ہے۔ کریم کے استفسار پر وہ کہنے لگی: ''ابو! ماجد نے جو کچھ کیا ہے اس پر اسے سزا ملنی چاہیے۔ مجھے پوری بات کہتے شرم آتی ہے' میں نے اس مسئلے کو بہت پڑھا ہے اور شرعی سزا کے سوا کوئی راستہ نہیں۔''

پھر کریم کے حوصلہ دلانے پر اس نے یہ کہانی سنائی: ''ایک شام ماجد نے ایک امریکی فرم لاک ہیڈ کے ملازمین کی ایک دعوت میں شرکت کی۔ وہاں ایک عورت کو یہ معلوم ہوا کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے ہے تو اس نے اس میں خاصی دلچسپی لی۔ اس نے ماجد کے ساتھ اس کے دوست کے گھر چلنے کی دعوت بھی قبول کر لی۔ لیکن شام گہری

ہونے پر امریکی حسینہ نے ماجد کو نشے میں دھت دیکھ کر اپنا ارادہ بدل لیا۔ جب ماجد کو یہ یقین ہو گیا کہ آج رات اس کو اس امریکی جنسی کھلونے سے دل بہلانے کا موقع نہ ملے گا تو وہ شدید غصے میں آ گیا اور وہاں سے چلا آیا۔ راستے میں وہ اپنے ایک دوست، جسے کار حادثے میں معمولی چوٹیں آئی تھیں، کی عیادت کے لیے ہسپتال چلا آیا۔ دوست کی عیادت تو وہ بھول بھال گیا اور کسی حسینہ یا غیر ملکی دوشیزہ کی تلاش میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چکراتا پھرا تاکہ کسی کو ورغلا کر یا پیسے کا لالچ دے کر اس اختلاط پر راضی کر سکے۔ آدھی رات بیت چکی تھی۔ ہسپتال کے عملے کے صرف چند افراد جاگ رہے تھے۔ یہ سب بیان کرتے ہوئے امانی کے ہونٹ شدتِ غم سے کپکپانے لگے۔ کریم نے بیٹی کی ہمت بڑھائی۔ ''امانی پھر کیا ہوا؟''

ہماری بیٹی نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا: ''ماجد نے ہسپتال کی ایک شدید زخمی اور بیہوش مریضہ کی عصمت دری کی۔''

کریم کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ اس نے اپنا ہاتھ دائیں سے بائیں ہلاتے ہوئے کہا: ''امانی! فاتن نے تم سے یہ من گھڑت بات کہہ دی ہوگی۔''

ہسپتال کے ایک ملازم نے مریضہ کے کمرے سے ماجد کو نکلتے دیکھا اور جب مریضہ کا بستر درہم برہم دیکھا تو ماجد کا پیچھا کر کے حکام کو بلانے کی دھمکی دی جب اس شخص کو معلوم ہوا کہ ماجد شہزادہ ہے تو وہ ماجد سے اس کی تمام رقم جو اس وقت اس کی جیب میں موجود تھی لے کر ٹل گیا۔

وہ غیر ملکی عیسائی خاتون ایک کار حادثے میں سر کی شدید چوٹ کے باعث سکتے کی حالت میں چھ ماہ سے ہسپتال میں داخل ہے اور اب تین ماہ کے حمل سے ہے۔ اس پر مجرمانہ حملے کے متعلق ہسپتال میں زور شور سے تحقیقات کی جا رہی ہیں۔ ماجد کو اندیشہ ہے کہ اس اسکینڈل میں اس کا نام لیا جائے گا۔ فاتن نے ماجد کو باپ کی تجوری کھولتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا تو اس کے دھمکانے پر ماجد نے بہن کو اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا کہ ایک غیر ملکی نے اس کی شاہی شناختوں کو چھپانے کے لیے دس لاکھ ریال کا

مطالبہ کیا ہے۔ اس شخص نے ایک ہفتے کی مہلت دی ہے جبکہ وہ والد سے بغیر وجہ بتائے اتنی بڑی رقم نہ مانگ سکتا۔

اس پر مجھے یاد آیا کہ ماجد نے ایک دفعہ عبداللہ کو ایک امریکی عورت سے، جو کہ عمر میں عبداللہ سے دگنی بڑی تھی، اختلاط کرنے کی پیشکش کی تھی مگر ہمارے بیٹے نے انکار کر دیا۔ جس پر ماجد نے عبداللہ کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا: ''ایک اصلی مرد کے جذبات تو ایک اونٹنی دیکھ کر بھی برانگیختہ ہو جاتے ہیں۔ تم کیسے مرد ہو؟'' پھر اس نے عبداللہ کو بتایا کہ وہ اس عورت سے تو بہتر ہے جس سے وہ آخری بار ''ملا'' تھا۔ ایک بیہوش عورت جو جنسی فعل سے گزرنے کے باوجود اس کی لذت سے بے خبر تھی۔ اس واقعے پر گفتگو کرتے ہوئے ہمارا یہ خیال تھا کہ اس عورت کو نشہ پلایا گیا ہوگا۔ مگر اب امانی کے انکشاف سے معلوم ہوا کہ وہ بے چاری تو سر کے زخم کی وجہ سے اپنے ہوش و حواس میں نہ تھی۔ علی نے ایک ایسی عورت سے زنا کیا جو وہ بول بھی نہ سکتی تھی۔ عبداللہ نے یہ کہانی اپنے والد کو سنائی تھی اور کریم نے مجھے سنائی تھی۔ اس کے بعد کریم نے عبداللہ کو اپنے کزنز کے ساتھ غیر ملکی پارٹیوں میں جانے سے منع کر دیا تھا۔

امانی کہہ رہی تھی: ''میں وجدان سے کہوں گی کہ وہ ماجد کے کالے کرتوتوں کے بارے میں اپنے باپ کو بتائے۔ ماجد کو سزا ملنی چاہیے۔''

ہم جانتے تھے کہ وجدان کا باپ مذہبی آدمی ہے، جو شاہی مسجد سے فتوے صادر کرتا ہے۔ اس کو شاہی خاندان کے افراد سے کوئی دشمنی نہیں۔ مگر مذہب اور اپنے ضمیر کی آواز پر سختی سے عمل درآمد کرتا ہے اور اس کو خریدنا ناممکن ہے۔ وہ معاملے کو شوریٰ اور بادشاہ کے سامنے لازمی زیر بحث لاتا۔ کریم نے امانی سے کہا: ''امانی یہ موضوع نوجوان لڑکیوں کے گفتگو کرنے کا نہیں۔ میں ان الزامات کی جانچ پڑتال کروں گا اور اگر یہ درست نکلے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ ماجد کو اس کے کیے کی سزا ملے گی۔ تمہیں بھی وعدہ کرنا ہوگا کہ اس معاملے میں اپنی زبان بند رکھو گی۔''

امانی نے اپنے والد سے وعدہ کر لیا کہ وہ اس سلسلے میں کسی سے کچھ نہ کہے

گی۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔

تین دن کے اندر اندر کریم نے تلخ حقیقت معلوم کر لی۔ امانی کی بات سچ نکلی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ اس حقیقت کو علی کے علم میں لانا چاہیے۔ چنانچہ ہم دونوں کار میں علی کے محل پہنچے۔ ہماری غیر متوقع آمد پر اس نے خوشدلی سے ہمارا استقبال کیا۔ خوشگوار باتیں کرتے اور چائے پیتے ہوئے آخرکار کریم نے لب کھولنے کی ہمت کی۔ اس کے منہ سے بیٹے کے کرتوت جان کر علی کے چہرے پر غم اور شدید کرب کے اثرات ظاہر ہوئے۔ اپنی زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے بھائی پر ترس آ گیا۔ اس وقت کسی دانا کے یہ الفاظ میرے ذہن میں در آئے:

''جن لوگوں کے ہاتھ پانی میں ہوں' انہیں ان لوگوں سے خوشی کی امید نہیں رکھنی چاہیے جن کے ہاتھ آگ میں ہوں۔''

علی وہ آدمی تھا جس کے ہاتھ آگ میں تھے۔ ماجد کو بلایا گیا۔ وہاں آنے پر جب اس نے اپنے باپ کا طیش سے سرخ چہرہ دیکھا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ مجھے اس لمحے اپنا بچپن یاد آ گیا۔ جب کسی معمولی خلاف ورزی پر علی کی سرزنش کی گئی تو اس نے ہماری ماں کو ''جاہل بدویہ'' کہہ دیا اور اپنی ماں کو ٹھوکریں مارنے لگا تھا۔ جب ہم بہنوں نے ماں کو کہا کہ وہ علی کی پٹائی بڑی چھڑی سے لگائے تو اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا تھا: ''نوجوان لڑکے کو اپنے باپ کی طرح ہونا چاہیے۔''

جس طرح علی کردار و عمل میں اپنے باپ جیسا تھا' اسی طرح ماجد بھی اپنے باپ سے مشابہہ تھا۔ جب ہم ماجد کو علی کے غضب کا نشانہ بنا چھوڑ کر محل سے باہر آئے تو ماجد باپ کے تشدد کا سامنا کر رہا تھا۔

ایک ہفتہ گزر جانے کے بعد کریم کو علی سے معلوم ہوا کہ مسئلہ ختم ہو گیا۔ اس نے ایشیائی ملازم کو خاموش کرانے کے لیے اس کو بہت سی دولت دی تھی' اس کو یورپی ملک میں سرمایہ کاری کروائی تھی' اس کے لیے اس یورپی ملک کے پاسپورٹ کا انتظام بھی علی کی وجہ سے آسان ہو گیا تھا۔ اس طرح ہمارا خاندان ایک غیر متوقع تکلیف سے

بچ گیا۔ علی نے ماجد کو تعلیم کے حصول کے لیے یورپ کے ایک سکول میں داخل کرا دیا اور امانی کو اس بات سے خاصی تسلی ہو گئی تھی کیونکہ اس کے خیال میں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی سرزمین سے دوری بھی ماجد کے لیے خاصی بڑی سزا تھی۔

☆☆☆

ایک سہ پہر میری بیٹیوں مہا اور امانی نے مجھے خوشگوار قیلولے سے بیدار کیا۔ میں ان کے چلانے کی آواز سے جاگی تھی جو کہ مجھے اپنی خواب گاہ کے بھاری دروازے کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سوچا نامعلوم اب امانی نے کیا گل کھلایا ہے؟ میں تیزی سے باہر نکلی۔ ہمارے بہت سے ملازمین باورچی خانے کے دروازے میں کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ وہ اس تماشے میں کوئی دخل اندازی نہیں کر رہے تھے۔ یہ تماشا ان کے لیے لطف کا باعث تھا۔ مہا بہت بدمزاج اور امانی کے مقابلے میں زیادہ طاقتور تھی۔ وہ امانی کو زمین پر گرائے اس کا چہرہ صبح کے اخبار پر رگڑ رہی تھی۔ ایک ہفتہ قبل امانی اور اس کے مذہبی گروہ نے فیصلہ کیا تھا کہ اخبارات جن میں اللہ اور اس کے نبیؐ کے فرموذات شائع ہوتے ہیں۔ ان کو عام استعمال میں لانے سے اجتناب کیا جائے۔ اس لیے امانی نے گھر والوں کو سختی سے منع کیا تھا کہ سب لوگ اخبارات میں شائع شدہ آیات اور ارشادات نبویؐ کو بے حرمتی سے بچانے کی کوشش کریں۔ آج امانی نے مہا کو آیات قرآنی کی بے حرمتی کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھی۔ میں مہا پر چلائی: ''مہا! بہن کو چھوڑ دو'' مگر اس نے میری بات پر کان نہ دھرے۔ میں نے مہا اور امانی کو الگ کرنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ ہم دونوں سے زیادہ طاقتور تھی اور میرے قابو میں نہ آ رہی تھی۔ میں نے مدد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ ایک مصری ڈرائیور میری مدد کے لیے آگے آیا۔ اس نے اپنی طاقت کا استعمال کرتے ہوئے ان دونوں کو الگ کیا۔ امانی اب بھی زمین پر پڑی سسک رہی تھی اور بہن کو اس کی حرکات کی بنا پر ملحد قرار دی رہی تھی جبکہ مہا اب بھی اس پر گرج برس رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ وہ دونوں کسی صورت خاموش نہیں ہو رہی ہیں تو میں نے ان

دونوں کے بازوؤں پر چٹکی بھری، پھر کہیں جا کر وہ خاموش ہوئیں۔ امانی نے خاموشی سے اٹھ کر اخبار کے اوراق اکٹھے کیے اور ان کو ٹھیک کرنے لگی۔ میں ان دونوں کو کان سے پکڑ نشست گاہ میں چلی آئی۔ اس کے ساتھ میں نے ملازمین کو ہدایات دیں کہ وہ اس طرف نہ آئیں۔ میں ایک نشست پر بیٹھ گئی اور اپنے آپ کو یہ سکون کرنے کے لیے میں نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں موند لیں۔ اس کے بعد میں ان دونوں سے کہا اب وہ اپنا اپنا موقف بیان کریں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان کو ہدایت کی کہ وہ اپنے ہاتھ قابو میں رکھیں۔ میری یہ بات سنتے ہی مہا کا صبر و تحمل ختم ہو گیا اور وہ ابل پڑی۔ یہ امانی مجھے پاگل کر دے گی اور اگر یہ اپنی ان حرکتوں سے باز نہ آئی تو میں اس کے کمرے میں جا کر قرآن پاک کے اوراق پھاڑ دوں گی (نعوذ باللہ) اپنی بڑی بہن کی یہ خوفناک بات سن کر امانی غضب ناک ہو گئی اور زور زور سے سانس لینے لگی۔ میں نے مہا کو اس کی اس نامعقول حرکت سے باز رہنے کے لیے کہا۔ مگر وہ غصے میں چلائی: ''پرانے اخبارات کو ضائع نہ کرنے کا خیال کتنا بیوقوفانہ ہے، ان بیکار اخبارات کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک بڑے کمرے کی ضرورت ہو گی۔'' پھر امانی سے کہنے لگی ''امانی تمہاری عقل ختم ہو گئی ہے۔'' اس کے بعد اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا: ''امی! جب سے ہم حج سے واپس آئے ہیں، امانی خود کو میری مالکہ سمجھنے لگی ہے۔'' مجھے مہا سے کامل اتفاق تھا۔ چند روز پہلے امانی نے دیکھا کہ فلپائنی مالی کے پاس ربڑ کی چپل تھی، جس کے تلے پر لفظ ''اللہ'' لکھا ہوا تھا۔ وہ فخر سے دوسرے نوکروں کو اپنی نئی چپل دکھا رہا تھا مگر امانی نے اس کی خواہش کے برعکس اس کی خریداری کی داد دینے کے بجائے اسے توہین الٰہی کا مرتکب ٹھہرایا اور سخت سزا کی دھمکی دی۔ اس پر مالی نے روتے ہوئے بتایا کہ اس نے چپل ریاض کے ایک مشہور سوق (بازار) سے خریدی ہے۔ امانی نے اس چپل کو شیطانی حرکت قرار دیتے ہوئے اپنی مذہبی شوریٰ کا اجلاس بلایا اور معاملہ ان کے سامنے پیش کیا۔ پھر یہ پیغام دوسرے مذہبی گروہوں تک پہنچا، شہر بھر میں پمفلٹ تقسیم کیے گئے اور لوگوں کو تاکید کی گئی کہ وہ ایسے چپل خریدنے یا پہننے سے باز رہیں۔ یہ درست ہے کہ

مسلمانوں کے نزدیک اس طرح کی حرکت توہین خداوندی شمار ہوتی ہے مگر مالی تو غیر مسلم تھا۔

جب مہا نے امانی کو قرآن کے حوالے سے دھمکی دی تو امانی کو اس کی بات ماننا پڑی۔ امانی نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی بڑی بہن کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گی۔ اس کے بعد دونوں لڑکیاں اپنے اپنے کمروں میں چلی گئیں۔ پھر میں نے گھنٹی بجا کر کورا کو بلایا اور اس سے کوکا اور بوربن کا تیز مشروب لانے کو کہا۔ لڑکیوں کے اس جھگڑے کا فیصلہ کراتے کراتے میں نقاہت محسوس کر رہی تھی اور میرے لیے سکون پانے کا یہی ایک طریقہ تھا۔

کورا حیرت زدہ رہ گئی۔ کیونکہ یہ پہلا موقعہ تھا کہ اس کی مالکہ نے دن کے وقت الکحل کا مشروب طلب کیا تھا۔ میں نے اسے حکم کی بجا آوری کے لیے کہا اور اخبار لے کر بیٹھ گئی۔ اسی اثنا میں میرا بیٹا گھر آیا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ فواد کی بیٹی فائزہ جعفر کے ساتھ ملک سے فرار ہو گئی ہے۔ میں غیر یقینی کے عالم میں اپنے بیٹے کے چہرے کو تکنے لگی۔

جعفر طلال بیس بائیس سال کا ایک خوبصورت، تنومند، خوش کلام اور بڑا مؤدب نوجوان تھا۔ وہ عبداللہ کا گہرا دوست تھا۔ جب وہ بارہ سال کا تھا تو اس کی ماں مر گئی تھی اور جب جعفر کی عمر سترہ سال ہوئی تو اس کا باپ بھی لبنان کی خانہ جنگی میں مارا گیا۔ اسی خانہ جنگی میں اس کا بڑا بھائی جو اس سے چار سال بڑا تھا شدید زخمی ہوا تھا اور جنوبی لبنان کے ایک ہسپتال میں مستقل طور پر داخل تھا۔ جعفر یتیم و بے آسرا ہو کر آخر کار اپنے چچا کے پاس کویت چلا آیا۔ کویت پر عراقی حملے کے بعد تنظیم آزادیٔ فلسطین (پی۔ ایل۔ او) نے صدام حسین کی طرف داری کی۔ جب جنگ ختم ہوئی تو فلسطینیوں کو کویتی شہری نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے حالانکہ جعفر کا چچا اور اس کا خاندان اپنے کویتی سپانسر کے وفادار رہے تھے اور وہ کویت میں اب بھی قیام کر سکتے تھے مگر فلسطینیوں کے خلاف کویتیوں کے جذبات اس قدر بھڑکے ہوئے تھے کہ ان کے آقا

نے فی الحال ان کو کسی اور ملک میں چلے جانے کو کہا۔ اس کا کہنا تھا کہ چند سال میں یہ بحران ختم ہو جائے تو وہ واپس آ جائیں۔

کریم اس کویتی کا کاروباری پارٹنر تھا۔ اس نے کریم کو پیغام دیا کہ جعفر کا چچا ریاض میں کمپنی کا دفتر چلانے میں فائدہ مند ثابت ہو گا۔ سعودی عرب میں بھی فلسطینیوں کی شہرت خلیجی جنگ کے بعد اچھی نہ رہی تھی مگر کریم نے اپنے پارٹنر کے کہنے پر جعفر کے چچا کو اپنے ہاں ملازم رکھ لیا۔ اس طرح جعفر اپنے چچا کے ساتھ ریاض آیا۔ کریم اس نوجوان کی صلاحیتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسے ایک انتظامی عہدہ دے کر اپنے قانونی دفتر میں رکھ لیا۔ رفتہ رفتہ جعفر اور عبداللہ گہرے دوست بن گئے۔ عبداللہ اس کو اپنا بھائی قرار دینے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے گھر کے افراد میں شمار ہونے لگا۔ جعفر اتنا پرکشش نوجوان تھا کہ جب وہ شہر میں نکلتا تو عورتیں اس کی طرف دیکھتی رہ جاتیں۔ وہ کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھا ہوتا تو خواتین اسے رقعے کے ذریعے دعوتیں دیتیں۔ ایک دفعہ وہ عبداللہ کے ساتھ کنگ خالد اسپشیلسٹ ہسپتال، عبداللہ کے ایک کزن کی عیادت کے لیے گیا تو تین غیر ملکی نرسوں نے جعفر سے ازخود بات چیت کی اور اپنے رابطے کے فون نمبر دیئے۔ میں سمجھتی تھی کہ جعفر اپنی عمر سے بڑھ کر عقل مند ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے ملک میں بظاہر وہ کنواروں کی زندگی بسر کر رہا تھا جہاں مردوں اور عورتوں میں ناجائز میل جول کو برداشت نہیں کیا جاتا۔ عبداللہ کا کہنا تھا کہ وہ عورتوں کی ہر قسم کی پیشکش ٹھکرا دیتا تھا۔

کریم، جعفر کے مستقل کنوارپن پر اسے مذاق کا نشانہ بناتا تھا اور سنجیدگی سے اسے کہتا تھا کہ وہ لبنانی یا فلسطینی افراد سے جعفر کا رابطہ کرا دے جو اس کے لیے مسلمان دلہن ڈھونڈ لیں گے۔ تاہم جعفر نے کریم کی عورتوں سے ملانے والی ہر پیشکش، ہر بات رد کر دی اور اس وقت عبداللہ مجھ سے اپنے گہرے دوست کی شکایت کر رہا تھا: ”جعفر نے مجھے کبھی فائزہ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔“

عین اسی وقت کریم غصے کی حالت میں وہاں آن پہنچا۔ وہ آتے ہی اپنے بیٹے

پر برس پڑا اور کہنے لگا: ''عبداللہ! تم نے اپنی اور دوسرے کئی معصوموں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔'' اس نے بتایا کہ جعفر کے غائب ہونے کی خبر سن کر وہ بہت تیزی سے گاڑی چلاتے ہوئے آیا ہے۔ جب کہ اس طرح راستے میں کہیں بھی حادثہ ہو سکتا تھا۔

فائزہ کا والد فواد جدہ کا ایک مشہور تاجر تھا اور کریم کے تین غیر ملکی کاروباروں میں پارٹنر تھا۔ وہ شاہی خاندان کی ایک دوشیزہ سے شادی کر کے خاندانِ سعود کا رشتے دار بن گیا تھا' اگرچہ اس کا خاندان بادشاہت کی تشکیل کے ابتدائی دنوں میں سعودیوں کے خلاف لڑتا رہا تھا۔ فواد نے شادی کے وقت معمولی شکل وصورت والی شہزادی سمیعہ کو جواہرات سے لاد دیا تھا اور سمیعہ نے بھی اس سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ ان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے تھے۔ فواد نے بس اسی ایک بیوی پر اکتفا کیا تھا۔ فائزہ بہت خوبصورت تھی۔ وہ ماں کی طرح ذہانت اور حس مزاح رکھتی تھی۔ وہ یمن سکول ریاض میں پری ڈینٹسٹری کی طالبہ تھی۔ مستقبل میں دانتوں کے علاج کا کلینک کھولنا چاہتی تھی' مگر فواد نے یہ طے کر رکھا تھا کہ فائزہ گریجوایشن کر لے تو اسے تین خوشحال گھرانوں کے تین نوجوانوں سے ملایا جائے گا تاکہ وہ ان میں سے کسی ایک کا بطور شوہر انتخاب کرے۔ لیکن فائزہ نے ان سب پر ایک قلاش فلسطینی کو منتخب کیا اور اس کے ساتھ ملک سے فرار ہو گئی۔

جعفر کے فواد کے دفتر میں کام شروع کرنے کے چند ہفتے بعد فواد خاندان بعض کاغذات پر دستخط کرنے دفتر آیا تھا۔ فواد نے بیرونِ ملک اپنا کاروبار پھیلایا تھا اور اسے اپنے بچوں کے نام کر دیا تھا۔ جعفر ان کا بااعتماد نوکر تھا۔ اس لیے سمیعہ اور فائزہ نے اس کے سامنے کاغذات پڑھے اور دستخط کرتے وقت اپنے نقاب الٹ دیئے تھے۔

فائزہ کے فرار کے بعد فواد سے گفتگو کرتے ہوئے اب سمیعہ کو یاد آیا کہ اس روز دستخط کرتے وقت جعفر اور فائزہ ایک دوسرے کو تکتے رہے تھے' پھر جعفر نے ماں بیٹی کو چائے پلائی تھی اور پین اور چائے کی پیالی پکڑتے وقت فائزہ کا ہاتھ جعفر کے ہاتھ

سے مس ہوا تھا لیکن اس وقت سمیعہ نے ان ساری باتوں کو حادثاتی خیال کیا تھا۔ فائزہ کی ذاتی فلپائنی نوکرانی نے بتایا کہ عشق میں ابتدائی پیش قدمی جعفر نے نہیں بلکہ فائزہ نے کی تھی۔ وہ اول روز ہی سے جعفر کی محبت میں اس بری طرح گرفتار ہوگئی تھی کہ کھانا پینا بھی بھول گئی تھی۔ اس نے کونی کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا کہ وہ جعفر کو حاصل کر کے رہے گی ورنہ کوئی مرد اس کی زندگی میں داخل نہیں ہو پائے گا۔ کونی کے بقول اس نے فائزہ کو خبردار کیا تھا کہ شاہی خاندان سے منسلک ایک مالدار سعودی گھرانے کی بیٹی کا ایک معمولی فلسطینی کلرک سے نباہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کے باوجود فائزہ بڑی جرأت مندی سے جعفر کے دفتر جا کر اس سے ملی تھی۔ دونوں میں عہد و پیمان ہوئے تھے۔ ٹیلی فون پر ان کی گفتگوئیں طویل تر ہونے لگی تھیں اور جعفر نے اسے یقین دلایا تھا کہ اگر وہ اسے حاصل کرنے میں کامیاب رہا تو کبھی اپنی پیاری شہزادی سے جدا نہیں ہوگا۔ اس کے یہ الفاظ فائزہ کی روح کو سرشار کر گئے تھے۔ پھر ان میں العکر یہ شاپنگ سنٹر میں ملاقات طے پائی۔ اس روز سیاہ نقاب اوڑھے فائزہ، جعفر کے ہم دوش اس کی عزیزہ کے روپ میں ایک دکان سے دوسری دکان کی سیر کرتی رہی۔ وہ کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کیونکہ ایسی جگہوں پر مطوعین حضرات (سرکاری محاسبوں) کی عقابی نگاہوں سے بچنا محال ہوتا ہے۔ وہ لوگ تاک میں لگے رہتے ہیں اور گاہکوں سے شناخت طلب کر سکتے ہیں۔ اگر ثابت ہو جائے کہ کوئی جوڑا، میاں بیوی، بھائی بہن یا باپ بیٹی کا تعلق نہیں رکھتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ وہ مسلمان ہوں تو انہیں کوڑے لگائے جا سکتے ہیں اور غیر مسلم ہوں تو انہیں جیل بھیج دیا جاتا ہے یا ملک بدر کر دیا جاتا ہے۔

پھر جعفر نے ایک اپارٹمنٹ دریافت کر لیا جہاں وہ تنہائی میں مل سکتے تھے۔ یہ جعفر کے ایک لبنانی دوست کا گھر تھا۔ چونکہ فائزہ بحیثیت عورت گاڑی نہیں چلا سکتی تھی، مجبوراً اس نے ایک خاندانی ڈرائیور کو خاصی رقم دے کر وہاں لے جانے پر آمادہ کر لیا۔ اس اپارٹمنٹ میں دو دلوں کی محبت مزید پروان چڑھی اور عین اس وقت جب وہ اپنے

ارادوں سے اپنے خاندانوں کو آگاہ کرنے والے تھے ایک بحران پیدا ہو گیا۔ سعودی عرب کے ایک بہت دولت مند شیخ نے اپنے بیٹے کے لیے فواد سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ لیا۔ جب فائزہ پر گھر والوں کا دباؤ بڑھا تو ان دونوں نے ملک سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔

ان کے فرار سے فواد کی انا بری طرح مجروح ہوئی۔ اس کی عزت خاک میں مل گئی تھی۔ اس کے لیے اپنی بیٹی کو ڈھونڈے بنا کوئی چارہ نہ تھا۔

سعودی خواتین کے لیے محرم کے بغیر سفر کرنے کی ممانعت ہے۔ محرم اس کا وہ رشتہ دار ہوسکتا ہے جس سے وہ شادی نہیں کر سکتی۔ مثلاً باپ، بھائی، بیٹا، چچا، تایا، بھتیجا، بھانجا، سوتیلا باپ، سسر یا داماد۔ فائزہ نے اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے اپنے والدین کو کہا کہ اسے ذہنی یکسوئی کے ساتھ کسی فیصلے پر پہنچنے کے لیے بیرون خانہ تفریح پر بھیج دیا جائے۔ وہ اپنی ایک کزن، جو کہ دوبئی میں بیاہی ہوئی تھی، کے ہاں جا سکتی ہے۔ اس صورت میں اس کا فیصلہ یقیناً مثبت ہو گا۔ فائزہ کی ماں اپنے کمر درد کی وجہ سے اس کے ہمراہ نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے اس کے چھوٹے بھائی کو اس کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا اور کیسا ''حسین اتفاق'' تھا کہ انہی دنوں جعفر نے سالانہ چھٹی لے لی۔ مگر فواد کے خاندان کے کسی فرد نے اس بارے میں سوچنے کی زحمت نہ کی۔

جب فائزہ دوبئی پہنچ گئی تو وہ اپنے چھوٹے بھائی کو آسانی سے دھوکا دے کر نکل سکتی تھی اور اس نے ایسا ہی کیا۔ جب اس کا بھائی تازہ دم ہونے کے لیے غسل خانے میں گیا تو اس نے اس کے سفری بیگ سے اپنا پاسپورٹ نکال لیا۔ اس نے منصوبے کے مطابق خواتین کے ساتھ خریداری کے لیے جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ بھائی نے ان کو رضاکارانہ پیشکش کی کہ وہ اپنے سعودی دوست، جو کہ شکاگو بیچ ہوٹل میں قیام پذیر ہے، ملنے کے لیے جاتے ہوئے ان لوگوں کو الفرید سنٹر چھوڑ دے گا۔ اور اس نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح فائزہ کے فرار کی راہ ہموار ہو گئی۔ الفرید سنٹر میں ''خریداری'' کرتے ہوئے فائزہ نے اپنی کزن سے کہا کہ وہ ٹائلٹ جانا چاہتی ہے۔ اس کی کزن

خوشبو کے انتخاب میں محو رہی اور فائزہ اس عرصے میں چپکے سے وہاں سے رفو چکر ہو گئی۔

ریاض میں کونی کو جب معلوم ہوا کہ اس کی محبت میں مبتلا مالکہ غائب ہو گئی ہے تو اس نے روتے ہوئے فائزہ اور جعفر کی داستان عشق کا پردہ چاک کر دیا۔ فواد کو یقین تھا کہ اس کی بیٹی گمراہ نہیں ہو سکتی اور یہ سب کھڑاگ جعفر کا پھیلایا ہوا ہے۔ کونی بے چاری پر افتاد اس طرح نازل ہوئی کہ اس کو ملازمت سے برخاست کر کے منیلا جانے والی پہلی پرواز پر سوار کرا دیا گیا۔ پھر فواد غصے سے بھنایا ہوا کریم کے دفتر آدھمکا۔ جعفر کے چچا پر برسنے لگا۔ اس نے اس کو دھمکایا کہ اگر اس کی کنواری بیٹی اس کو اسی حالت میں واپس نہ کی گئی تو وہ اس کو جان سے مار دے گا۔ لڑائی کے ہنگامے سے گھبرا کر ساتھ والے دفتر کے بھارتی سکیورٹی گارڈ نے پولیس کو بلا لیا۔

سعودی عرب میں نقص امن کا ذمہ دار ہمیشہ غیر ملکی افراد کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ پولیس نے معذرت خواہانہ انداز میں فواد سے پوچھ گچھ کی۔ اگر کریم کا مرتبہ اور اثر ورسوخ فواد سے بڑھ کر نہ ہوتا تو جعفر کے چچا کو اسی وقت گرفتار کر لیا جاتا۔

میں اور سارہ افسوس کرنے کے لیے سمیعہ کے پاس گئیں۔ جب میں نے اس کو کہا کہ "محبت سے خالی زندگی ایک غلطی ہے" تو اس کا بدنما چہرہ اور زیادہ بھدا ہو گیا۔ مگر سارہ نے اس سے بہت مناسب الفاظ میں افسوس کا اظہار کیا اور اس کا غم بانٹا۔

بیٹی کا کوئی پتا نہ لگا تو فواد نے امریکی اور فرانسیسی تفتیشی اداروں سے رجوع کیا اور فائزہ کے غائب ہونے کے ایک ہفتہ بعد اس کو بتایا گیا کہ وہ امریکی ریاست نیواڈا میں جعفر کی بیوی کی حیثیت سے ایک ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ خبر ملتے ہی فواد اپنے تینوں بیٹوں کے ساتھ امریکہ روانہ ہو گیا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ وہ فائزہ کو واپس گھر لائے گا۔ بیٹی سے اپنی جنوں خیز محبت کا اظہار کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی بدنامی پر فائزہ کی موت کو ترجیح دے گا اس "حادثے" پر ہمارے گھر کے افراد کی مختلف آراء تھیں۔ میں نے اپنے دانتوں سے ناخنوں کو اتنا کاٹا کہ ان سے خون رسنے لگا۔ عبداللہ اپنے دوست کے غم میں غرق تھا اور امانی دو محبت کرنے والوں کے لیے دعا

کرتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ ان دونوں نے دنیاوی عیش کے لیے نہایت بیوقوفانہ حرکت کی ہے اور اگلے جہان میں ان کو آگ میں جلایا جائے گا۔ اس پر عبداللہ کا ردعمل یہ تھا کہ شاید جعفر یہ خیال کرتا ہے کہ فائزہ کا نسوانی حسن اس لائق ہے کہ اس کے لیے جنت کو چھوڑ دیا جائے۔ مہا ہر اس شخص کے خلاف تھی اور اس کو برا بھلا کہتی تھی جو محبت کرنے والوں کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اس کا خیال تھا کہ سچے عاشقوں پر کوئی شخص یا حکومت پر پابندی نہیں لگا سکتی۔

جب ہمیں اطلاع ملی کہ فواد اور اس کے بیٹے امریکہ کے لیے روانہ ہو گئے ہیں تو عبداللہ اور میں نے کریم سے التجا کی کہ وہ جعفر کو خبردار کر دے تاکہ وہ دونوں کہیں چلے جائیں۔ میرا کہنا یہ تھا کہ اس طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ فائزہ کے مرد رشتہ داروں کا غصہ کم ہو جائے گا اور وہ بہتر انداز میں سوچ سمجھ سکیں گے۔ لیکن کریم نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی اور اپنے سعودی مرد ہونے کا پورا پورا ثبوت دیا۔

میں نے ہمت نہ ہاری اور عبداللہ کے ذریعے کریم کے دفتر سے وہ تمام معلومات جو مغربی اداروں نے فراہم کی تھیں حاصل کر لیں۔ جب کریم مسجد میں نماز ادا کرنے گیا ہوا تھا اور امانی اپنے کمرے میں عشاء کی نماز ادا کر رہی تھی تو میرے کہنے پر عبداللہ نے لاس ویگاس، نیواڈا کے میراج ہوٹل فون کیا' جہاں فائزہ اور جعفر ٹھہرے ہوئے تھے۔ کال مل گئی اور عبداللہ نے اپنے دوست کو آنے والے خطرے سے آگاہ کیا۔ اس پر جعفر نے بتایا کہ وہ شادی کر چکے ہیں' اس لیے فائزہ کے گھر والے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں نے خود فون پر جعفر سے بات کی اور کہا: ''جعفر! بیوقوفی کا ثبوت مت دو۔ تم عرب ہو اور ایک عرب باپ کے جذبے سے بخوبی واقف ہو!'' فائزہ فون پر آئی تو اس نے بتایا کہ جعفر نے اس مشکل وقت میں بھی اس کا ہاتھ محبت سے تھام رکھا ہے۔ میں نے اس سے کہا: ''فائزہ! تم ابھی بیس سال کی ہو اور تم نے عرب روایات سے انحراف کیا ہے۔ تمہارا باپ صحرائی ذہنیت کا مالک ہے' اس کے نزدیک تم نے جرم کا ارتکاب کیا ہے' لہٰذا تم دونوں جلد از جلد یہ جگہ چھوڑ دو۔'' میری ان التجاؤں کا ان

پر یمیوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جعفر نے کہا کہ وہ فائزہ کے گھر والوں کے غصے کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گا۔ ان دونوں کی سوچ بچگانہ تھی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ گھر والوں کی طرف سے پیش آنے والے طوفان پر غالب آ جائیں گے۔

چار دن بعد فواد سعودی عرب لوٹ آیا۔ کریم نے اپنے دفتر سے فون پر مجھے یہ خبر سنائی تو میرے الفاظ گلے میں پھنس گئے۔ توقف کے بعد کریم نے بتایا کہ فواد اپنی بیٹی کو لے کر واپس آیا ہے اور جعفر ساتھ نہیں آیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا: ''کیا جعفر مر گیا؟'' کریم نے جواب دیا: ''نہیں، جعفر نہیں مرا۔'' اس کے یہ الفاظ نا قابل بیان لگ رہے تھے۔

فواد نے میرے خاوند کو صرف اتنا بتایا تھا کہ ہوٹل کے کمرے میں معمولی سی جھڑپ ہوئی تھی اور جعفر بیہوش ہو گیا تھا۔ اگر چہ اس کی چوٹ تشویشناک نہیں تھی تاہم صدمے سے بے حال فائزہ اب ریاض کے محل میں تھی اور اسے اب آور دوائیں دی جا رہی تھیں۔

دو ہفتے بعد ہمیں جعفر کی فون کال موصول ہوئی۔ وہ لبنان پس آ گیا تھا۔ اس نے فون پر مجھ سے کہا تھا: ''سب کچھ کھو گیا...... بس میری جان بچ ئی۔'' پھر عبداللہ نے فون لیا اور اپنے عزیز ترین دوست سے پوری کہانی سن کر اس کو تسلی دیتے ہوئے کہا: ''میں آ رہا ہوں!'' اس کا مطلب تھا کہ وہ جلد لبنان جا رہا ہے اور کوئی چیز اسے اپنے دوست کا ساتھ دینے سے نہیں روک سکتی۔ میں نے عبداللہ کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا: ''نہیں، تم نہیں جاؤ گے۔''

ٹھیک وقت پر کریم کمرے میں داخل ہوا۔ عبداللہ نے فون رکھ دیا اور اس کے ساتھ ہی اپنا سر اپنے بازوؤں میں چھپا کر زار و قطار رونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا: ''جعفر برباد ہو گیا، جعفر برباد ہو گیا۔'' جب وہ پرسکون ہوا تو اس نے ہمیں بتایا کہ فواد اور اس کے بیٹوں نے کس طرح جعفر سے فائزہ کو چھینا تھا۔

ایک فون کال نے رات کو انہیں جگا دیا تھا۔ فائزہ کا باپ فواد اور بھائی ہوٹل

کی لابی میں تھے۔ ''کیا ہم کمرے میں آ سکتے ہیں؟'' فواد کی آواز مہذبانہ تھی۔ اس سے جعفر کی ہمت بندھی اور جسمانی حملے کا کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ جعفر کو دیکھتے ہی فائزہ کے بھائیوں نے اس پر ہلہ بول دیا۔ اس کے سر پر کسی بھاری شے کی ضرب لگی اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ گھنٹوں بعد جب اسے ہوش آیا تو اس کی دلہن اور اس کے والد اور بھائی جا چکے تھے۔

جعفر کو معلوم تھا کہ سعودی قانون کے مطابق اس کی فائزہ سے شادی غیر قانونی تھی، کیونکہ کوئی سعودی لڑکی کسی غیر ملکی سے شادی نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود اس نے پرواز پکڑی اور لندن پہنچا۔ اس نے سعودی عرب میں داخل ہونے کی اپنی سی کوشش کی مگر اسے بتایا گیا کہ سعودی عرب کے لیے اس کا رہائشی ویزا منسوخ کر دیا گیا ہے۔ مایوس ہو کر اس نے میرے خاوند سے بات کرنے کی کوشش کی کہ شاید وہ اپنی شہزادگی کی بنا پر اس کی کوئی مدد کر سکے۔ کریم نے جواب دیا کہ وہ مدد کر سکتا ہے مگر کرے گا نہیں۔ جعفر زندہ تھا اور کریم نہیں چاہتا تھا کہ وہ سعودی عرب آ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ وہ شاید اس لیے بھی اس کی مدد نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جعفر نے ایک بااعتماد نوکر ہوتے ہوئے اس کے دوست اور بزنس پارٹنر کی اکلوتی بیٹی کو بھگا لے جانے کی حرکت کی تھی۔ ادھر عبداللہ اپنے دوست کے پاس لبنان جانے پر بضد تھا، مگر ہم دونوں نے اسے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے رویے سے یوں لگتا تھا کہ اسے ہماری طرف سے اجازت نہ ملنے کی پروا نہیں۔ رات کو میں بستر پر لیٹی اس ادھیڑ بن میں جاگ رہی تھی کہ بیٹے کو کس طرح اس جذباتی سفر سے روکا جائے۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ یہ ناممکن ہے کیونکہ جوانی کا جوش آسانی سے شکست تسلیم نہیں کرتا۔

☆☆☆

عبداللہ نے حتمی طور پر کہہ دیا تھا کہ دنیا کی کوئی بھی چیز اسے لبنان کا خطرناک سفر کرنے سے روک نہیں سکتی۔ اس کی اس ضد نے مجھے بے حد پریشان کر دیا تھا۔ میں اس معاملے میں کریم سے لڑ پڑی جسے کوئی خاص پریشانی نہ تھی۔ تاہم کریم کی اس بات

سے مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ عبداللہ کا پاسپورٹ الماری میں مقفل ہے، جس کے بغیر اس کا ملک سے باہر جانا ناممکن ہے۔

عبداللہ اپنے سوٹ کیس پیک کر رہا تھا۔ اس کی غمناک حالت میں میرے لیے سوہان روح تھی۔ جبکہ امانی کو ایک ہی فکر تھی کہ وہ اپنے بھائی اور بڑی بہن کے اخلاق کس طرح سدھار سکتی ہے۔ اس کی نگاہیں ساٹھ نوکروں پر مشتمل ہمارے عملے کا بھی تنقیدی جائزہ لیتی رہتی تھیں، جن میں کئی خفیہ رومانی داستانیں جنم لیتی رہتی تھیں۔ وہ ہمارے مسیحی اور ہندو ملازمین اور ملازماؤں کو وعظ و تبلیغ سے دائرۂ اسلام میں لانے پر بھی تل گئی تھی۔ اس نے غیر مسلم نوکروں کے خلاف جو سخت اور امتیازی رویہ اپنا رکھا تھا، اس پر بیسیوں بار امانی سے میرا جھگڑا ہوا تھا۔

ان دنوں میری عجیب حالت ہو رہی تھی۔ میں مسلسل اپنے بچوں کے حوالے سے پریشانی اٹھاتی آ رہی تھی۔ میں اپنے بڑھتے ہوئے نفسیاتی خلجان کا شکار ایسے وقت میں ہوئی تھی جو کریم کے کاروباری پھیلاؤ کا مصروف ترین دور تھا۔ مجھے تنہائی کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ میری نیند کم ہو گئی اور میں بسیار خوری پر اتر آئی، جس سے میرا وزن بڑھنے لگا۔ یہی نہیں، میں نے ایک اور عجیب عادت اپنا لی۔ میں اپنے بالوں کو بل دینے، انہیں کھینچنے اور دانتوں سے کاٹنے لگی تھی۔ اس سے میرے بالوں کی لمبائی کم ہونے لگی حتیٰ کہ ایک روز کریم نے طنزیہ طور پر کہہ دیا کہ وہ سمجھتا ہے، میں نے کوئی نئی ہیر ڈریسر ملازم رکھ لی ہے۔ جبکہ میں بچوں کی طرح بال اکھاڑنے کی بدعادت کا شکار تھی۔ میں نے کریم کو ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا کہ اسے کسی سے محبت نہیں اور اپنے بچوں کی تنہا مجھے فکر کرنی پڑتی ہے۔ اس پر کریم خلا میں گھورنے لگا۔ قدرے توقف کے بعد اس نے کہا کہ اس نے ایک بار بچوں کی پرورش کے متعلق پڑھا تھا: ''آپ اپنے بچوں کو پیار دے سکتے ہیں مگر اپنے خیالات نہیں دے سکتے کیونکہ ان کے اپنے خیالات ہوتے ہیں۔''

''یہ خلیل جبران ہے۔'' میں بولی۔

"نہیں تو۔"

"ہاں! یہ بات میں نے تمہیں سنائی تھی، جب ہم اپنے پہلے بچے کی پیدائش کا انتظار کر رہے تھے۔"

کریم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس نے کہا: "سلطانہ! تم ایک حیرت انگیز مخلوق ہو۔ تمہیں برسوں بعد بھی سب کچھ یاد ہے۔"

مجھے اس کے اس اعتراف پر خوشی ہوئی مگر میری بے اطمینانی کا سبب اس قدر گہرا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے دور نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے بچوں سے ٹکراؤ کے نتیجے میں میرے جنوں خیز جذبوں نے مجھے اپنے شوہر کے صاف اور منطقی ذہن سے دور کر دیا تھا، چنانچہ میں بار بار کریم سے الجھتی رہی۔ آخر تنگ آ کر اس نے طنز کا ایک اور تیر پھینکا: "میں سمجھتا ہوں کہ ایک روز تمہیں پاگل خانے میں داخل کرنا پڑے گا۔" اس پر میں سانپ کی طرح پھنکارنے لگی تو کریم اٹھ کر چلا گیا اور پھر دو روز میرے پاس نہ آیا۔ اس جھڑپ کے بعد میں غیر شعوری طور پر اپنے بالوں کو بل دیتے ہوئے غیر ملکی رسالوں کے اوراق الٹ پلٹ رہی تھی، جب ایک امریکی جریدے میں ایک مضمون نظر سے گزرا۔ اس مضمون میں ایک عجیب بیماری کا ذکر تھا، جو صرف خواتین کو لاحق ہوتی ہے۔ اس مرض میں عورتیں اپنے ابروؤں، پلکوں اور جسمانی بالوں کو کھانے لگتی ہیں۔ یہ پڑھتے ہی میں نے اپنے بال نوچنے چھوڑ دیے۔ میں گنجی ہونا نہیں چاہتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ثابت ہو گیا کہ مجھے وہ بیماری لاحق نہیں اور اپنے حسن کی پرداخت کے جذبے نے مجھ سے وہ بری عادت چھڑا دی۔

اپنے بال نوچنے کی عادت ترک کرنے کے باوجود مجھے خوف لاحق تھا کہ میرا زندہ رہنے کا جذبہ ٹوٹ پھوٹ رہا ہے اور اگر میں نے اضمحلال پر قابو نہ پایا تو میں جلد بوڑھی ہو جاؤں گی اور یوں موت آہستگی سے مجھے آئے گی۔ میرے اس خود تخریبی رویے سے مجھے میری عزیز ترین بہن سارہ نے نکالا۔

سارہ نے میری کیفیت بھانپ لی تھی، چنانچہ وہ گھنٹوں میرے پاس رہتی اور

اپنی دلچسپ باتوں سے مجھے محظوظ کرتی۔ سارہ کے اپنے مسائل بھی تھے۔ پھر بھی وہ میرے لیے وقت نکال لیتی تھی۔ اس کے پانچ بچے تھے اور ان میں سے ایک بچی جس کا نام نشوہ تھا اس روز پیدا ہوئی تھی، جس روز امانی نے جنم لیا تھا۔ سارہ نے مجھے اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا کہ تمہیں شکر ادا کرنا چاہیے کہ امانی مذہب کی طرف راغب ہو گئی ہے، میری بچی کا معاملہ تو اس کے برعکس ہے۔ اس نے انکشاف کیا کہ نشوہ مخالف جنس کی طرف بری طرح مائل ہو گئی ہے اور دو مرتبہ اسد نے ایک شاپنگ سنٹر کی میوزک شاپ میں اسے سعودی لڑکوں سے ملتے ہوئے پکڑا ہے۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ بتایا کہ اس کی بیٹی ہر اس مرد سے فلرٹ کرنے لگتی ہے جو ان کے محل کے احاطے میں داخل ہوتا ہے۔ ایک ہفتہ پہلے وہ دو نوجوان فلپائنی ڈرائیوروں کے ساتھ کھلم کھلا جنسی گفتگو کر رہی تھی کہ اس کے بھائی نے گفتگو سن لی۔ جب اس نے بہن کو ڈانٹا تو اس نے اپنی اس حرکت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اسے اپنی زندگی کی یکسانیت کو بدلنے کے لیے کچھ تو کرنا ہوتا ہے۔ نشوہ کے باپ اسد نے دونوں فلپائنی ڈرائیوروں کو فی الفور فارغ کر دیا تھا اور ان کی جگہ مصری مسلمان ڈرائیور بھرتی کر لیے تھے، جو اسلامی آداب کا احترام کرنا جانتے تھے، یعنی یہ کہ اس گھر کی من موجی عورتوں کو نظر انداز کر دیں، جیسے معصوم چہرے والی خوبصورت نشوہ کو۔

اسی روز سارہ نے نشوہ کو اپنی ایک سہیلی سے فون پر گفتگو کرتے ہوئے سنا تھا۔ ان دونوں میں اس لڑکی کے سب سے بڑے بھائی کی مردانہ وجاہت زیر بحث تھی۔ سارہ کو یوں لگا جیسے نشوہ کو اس لڑکے میں کشش محسوس ہوتی ہے اور اب اسے اپنی بچی کے اس گھر میں آنے جانے پر نگاہ رکھنی پڑتی ہے۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ میرے لیے امانی کی پیدا کردہ مشکلات سارہ کے لیے نشوہ کے کھڑے کیے ہوئے مسائل کی نسبت کچھ بھی نہیں تھیں۔

ہمیں یہ حیرت ناک اطلاع مل چکی تھی کہ فائزہ کی حالت اب بہتر ہے اور وہ سہیلیوں اور رشتے داروں سے ملنے لگی ہے، چنانچہ سارہ اور میں نے اس سے ملنے کا

پروگرام بنایا۔ اس دوران سارہ پلے گراؤنڈ میں کھیلتے اپنے بچوں کو دیکھنے چلی گئی اور میں غسل کر کے کپڑے بدلنے لگی۔ اتنے میں دفتر سے کریم کا فون آیا۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی: ''سلطانہ! سیف میں عبداللہ کا پاسپورٹ تو دیکھو۔''

انجانے خدشے کے تحت ریسیور میرے ہاتھ سے گر گیا اور میں پہلی منزل پر واقع کریم کے دفتر کی طرف بھاگی۔ میں تیسری کوشش میں ''کمبائنڈ سیف'' کھولنے میں کامیاب ہوئی۔ تمام کاغذات الٹ پلٹ دیے مگر عبداللہ کا پاسپورٹ نہ ملا۔ یہی نہیں، مہا کا پاسپورٹ بھی موجود نہ تھا۔ کریم اپنا پاسپورٹ باہر دفتر میں رکھتا تھا مگر میرا اور بچوں کے پاسپورٹ اس کے گھریلو دفتر میں رکھے ہوتے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس مخصوص سیف کے کوڈ سے کریم اور میں ہی واقف تھے۔ کریم وہ خصوصی کاغذات بھی دستخط شدہ تیار رکھتا تھا، جن پر اس کے گھر کی خواتین محرم کے بغیر بیرون ملک سفر کر سکتی تھیں۔ وہ خصوصی اجازت نامے بھی نہ ملے تو میں سچ مچ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اتنے میں گھریلو دفتر کے فون کی گھنٹی بجی۔ کریم کا فون تھا۔ اسے عبداللہ اور مہا کے پاسپورٹ غائب ہونے کی منحوس خبر سنائی تو اس نے ان ڈالروں کے متعلق پوچھا، جو ہم بڑی تعداد میں رکھتے تھے تاکہ ملک میں مذہبی انقلاب برپا ہونے کی صورت میں ہم لوگ ملک سے فرار ہو سکیں۔ میں نے سیف کے اوپر والے حصے میں بڑی دراز دیکھی تو محفوظ ڈالر بھی غائب پائے۔ عبداللہ ایک ملین ڈالر سے زائد اڑا لے گیا تھا۔

کریم کو میں نے محفوظ ڈالر غائب ہونے کی خبر سنائی تو اس نے کہا: ''تم جا کر دیکھو کیا مہا اسکول میں ہے؟ میں ہوائی اڈے پر جا رہا ہوں۔''

میں نے جلدی سے سادہ لباس پہنا، عبا، نقاب اور شائلہ اوڑھے، سارہ کو صورتحال بتا کر ساتھ چلنے کو کہا۔ پھر مصری ڈرائیور موسیٰ کو بلایا جو شہر میں سپیڈ کی حد کو توڑ سکتا تھا۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی پوری رفتار سے دوڑا دی اور ہم دس منٹ میں مہا کے اسکول پہنچ گئے۔ وہاں مہا کی تاریخ کی کلاس میں سترہ لڑکیاں مرد استاد سے سبق لے رہی تھیں جس کی تصویر کمرے کے وسط میں رکھے ٹی وی سکرین پر نمایاں تھی۔

گویا استاد وہاں موجود نہیں تھا اور سبق وڈیو کے ذریعے پڑھایا جا رہا تھا۔ سعودی عرب میں خواتین کے تعلیمی اداروں میں مرد اساتذہ وڈیو پر ہی پڑھاتے ہیں۔

مہا کلاس میں موجود تھی۔ اپنی بچی کا چہرہ دیکھتے ہی میں اس کے ڈیسک تک گئی اور اس سے لپٹ گئی۔ حیرت زدہ مہا نے بمشکل اپنے آپ کو مجھ سے الگ کیا۔ میں نے ہیڈ مسٹریس سے مہا کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت لی تو انہوں نے پوچھا: کیا مہا ایک ہفتے سے زیادہ باہر رہے گی۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلے تو مہا نے پوچھا: ''امی! بات کیا ہے؟'' اسے پاسپورٹ غائب ہونے کا بتایا تو اسے یقین نہ آیا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ تیزی سے فواد اور سمیعہ کے گھر لے چلے۔

میں اور سارہ ایک ہی نتیجے تک پہنچی تھیں۔ عبداللہ نے مہا کا پاسپورٹ جعفر کی بیوی فائزہ کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے استعمال کیا ہو گا۔ نقاب اوڑھے سعودی خواتین کے لیے کسی اور کے پاسپورٹ پر بیرون ملک کا سفر کرنا ممکن ہوتا ہے۔ جب مہا کو اپنے بھائی کے کرتوت کی نوعیت معلوم ہوئی تو اس نے التجا کی کہ امی اپنے گھر چلیں اور عبداللہ اور فائزہ کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ اب میں عجیب مشکل میں تھی۔ اگر میں فائزہ کے والدین کو نہ بتاتی تو وہ مجھے عبداللہ کے فعل میں شریک ٹھہراتے اور کہتے کہ فائزہ کو فرار کروانے میں میرا بھی ہاتھ ہے۔ اگر میں فائزہ کی اس کے شوہر سے مستقل جدائی کا سبب بنوں گی تو میں اپنے ملک میں عورتوں کے حقوق کی جنگ لڑنے کا دعویٰ کس طرح کر سکوں گی؟ میں نے سارہ کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہوں میں خواتین کے حقوق کی جنگ لڑتے رہنے کی شمع فروزاں تھی؛ جس کا سبب اس کی پہلی شادی کا خوفناک تجربہ تھا۔ یوں مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گئی اور میں نے ڈرائیور سے کہا کہ اب ہمیں گھر لے چلو۔ اس پر مہا خوشی سے بار بار میرا منہ چومنے لگی۔

مصری ڈرائیور کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اسے ہمارے فیصلے سے اتفاق نہ تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ ڈرائیور سمجھ نہ سکے، فرنچ میں کہا: ''ذرا ڈرائیور کی طرف دیکھو! اسے ہم سے اتفاق نہیں۔''

مہا بولی: ''اس ملک میں کون سا مرد ہو گا جو عورت کو اپنا شوہر چننے کا حق دینا پسند کرتا ہو؟ کسی ایک کا نام بتائیں' میں اس سے شادی کر لوں گی۔'' مجھے اپنے بیٹے عبداللہ پر فخر محسوس ہوا کہ اس نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے اور وہ سعودی خواتین کو ان کے حقوق دلوانے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔ میں نے موسیٰ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ میں خواتین کے لیے کامل آزادی کی علمبردار ہوں' حتیٰ کہ اس کی بیوی کو بھی یہ آزادی ملنی چاہیے جو مصر کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں اس کے والدین کے پاس مقیم رہنے پر مجبور ہے۔ کریم گھر میں بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اسے میرے چہرے سے پھوٹتی خوشی پر مطلق حیرت نہ ہوئی۔ وہ سمجھتا ہو گا کہ میرے خوشگوار موڈ کی وجہ مہا کا صحیح سلامت مل جانا ہے' حالانکہ میری خوشی کا سبب میرا بیٹا تھا جس نے عورتوں سے ہونے والی ناانصافیوں کے خلاف جدوجہد کرنے کا راستہ اختیار کیا تھا۔ عقبی صحن میں امانی کی ابھرتی دھیمی پڑتی آواز سنائی دے رہی تھی جو اپنے رب سے لو لگائے ہوئے تھی۔

سارہ اپنے بچوں کو لے کر رخصت ہو گئی۔

تخلیے میں کریم نے چھوٹتے ہی کہا: ''سلطانہ! فائزہ کے فرار میں تمہارا ہاتھ ہے۔''

میں چند لمحے خاموش رہی۔ اس کا یہ الزام میرے لیے ناقابل برداشت تھا' چنانچہ میں نے غصے کی حالت میں اس کے بازو پر مکا مارنا چاہا مگر وہ طرح دے گیا۔ پھر تحمل کے ساتھ بولا: ''سلطانہ! یہ لڑائی کا وقت نہیں۔ ہمارا بیٹا اور فائزہ ملک سے فرار ہو گئے ہیں۔ تم اس کے سفری منصوبے مجھے بتا دو۔''

میں نے یقین دلانے کی بہت کوشش کی کہ عبداللہ اور فائزہ کے فرار میں میرا کوئی ہاتھ نہیں' مگر ناکام رہی۔ کریم کو اعتبار نہ آیا۔ اس نے کہا: ''میں نے ایک ایسی عورت سے شادی کی ہے جو نصف فرشتہ اور نصف شیطان ہے۔ تمہارے وجود پر اکثر شیطان غالب رہتا ہے۔ جب معاملہ خواتین کی زندگیوں کا ہو تو تم جھوٹ بولے اور دغا دیئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔'' میرا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ میں نے کریم کے پاؤں پر تھوکا اور

پیر پٹختی کمرے سے باہر چلی آئی اور دل میں تہیہ کر لیا کہ آئندہ اس شخص سے کبھی بات چیت نہیں کروں گی۔ اس پر کریم نے اپنے تمام شبہات بالائے طاق رکھ دیئے کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ میری مدد کے بغیر وہ عبداللہ کو ڈھونڈنے اور فواد کی بیٹی کو واپس لانے میں کامیاب نہیں ہو گا۔ وہ میرے پاس آیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ مگر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور معافی دینے سے انکار کر دیا۔

پانچ دن ہمارے گھر میں بے سکونی رہی کیونکہ ہم دونوں پرامن طریقے سے بات نہیں کرتے تھے۔ امانی روتے ہوئے اللہ سے دعائیں کرتی تھی جبکہ مہا محبت کے گیت گاتی اور فائزہ کے فرار پر خوشیاں مناتی تھی۔

مجھے پہلے سے اندازہ نہیں تھا کہ فائزہ کے فرار پر فواد اور سمیعہ کا ردعمل کیا ہو گا۔ چنانچہ جب مجھے یہ پتا چلا کہ فواد نے اپنی بیٹی کے فرار کو بادل نخواستہ قبول کر لیا ہے تو اس پر مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی۔ پانچویں دن عبداللہ کا قبرص سے فون آیا۔ اسے ہمارے ردعمل کی کوئی پروا نہ تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے فائزہ اور جعفر میں ملاپ کروا کر انصاف کا پرچم بلند کیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ایک گھنٹہ پہلے فائزہ نے اپنے والدین کو فون کیا ہے اور یہ کہ فواد اور سمیعہ نے اپنا غصہ تھوک دیا ہے اور جعفر کو اپنے داماد کے طور پر قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ جعفر کو پھانسنے کی چال نہ ہو مگر ان لوگوں کے عمل نے اس خدشے کی تردید کر دی۔ فواد اور اس کے اہل خانہ بذریعہ طیارہ یونان پہنچے اور وہاں جعفر اور فائزہ سے ملے۔ فائزہ کے لیے ایک غیر ملکی مسلمان سے شادی کی خصوصی اجازت لی گئی اور قاہرہ کے مینا ہاؤس ہوٹل میں ایک زبردست تقریب میں باقاعدہ شادی کی رسوم انجام پائیں۔ جعفر اور فائزہ کے اصرار پر یہ تقریب مخلوط تھی۔ میں اور کریم بھی اس میں شریک ہوئے۔ فواد نے اعتراف کیا کہ عبداللہ کے فائزہ کو رہائی دلانے سے بہت پہلے وہ دونوں میاں بیوی اس نتیجے پر پہنچ گئے تھے کہ ان کی پیاری بیٹی کا دکھ دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے اس کے شوہر سے ملنے دیا جائے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ایک خاندانی سانحہ پرمسرت ملاپ میں

تبدیل ہو گیا تھا۔

اس شام قاہرہ میں اپنے محل کے صحن سے ہم دونوں مصری آسمان کا حسن دیکھ رہے تھے۔ میرے شوہر نے دل کی گہرائیوں سے معذرت کا اظہار کیا تو مجھے حیرت ہوئی۔ عبداللہ نے اسے بتایا تھا کہ فائزہ کو رہائی دلانے کے منصوبے میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ کریم نے وعدہ کیا کہ وہ آئندہ کبھی میرے بارے میں بدگمانی کا شکار نہیں ہو گا۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے طلائی زنجیر میں جڑا ہیرا نکالا اور بڑے پیار سے گلوبند میرے گلے میں ڈال دیا۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے ہونٹ میرے شانے سے مس ہوئے تو میری خوشی دو چند ہو گئی۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک عرب کہاوت آئی: ''اگر تمہارا شوہر شہد کا بنا ہو تو اسے سارا چٹ نہ کر جاؤ۔'' میں نے نئی روشنی میں کریم کی طرف دیکھا۔ میں نے اپنے خاوند سے بارہا گستاخی کی تھی۔ ان گستاخیوں کو یاد کرتے ہوئے میں نے اللہ سے دعا کی کہ وہ مجھے اپنی زبان پر قابو رکھنے کی توفیق دے (آمین)۔

☆☆☆

اگلی صبح کریم اور میں اپنے بچوں کے ساتھ محل کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ باغیچے میں کھلے گلابوں کی بھینی بھینی خوشبو ہوا میں شامل ہو رہی تھی۔

ہمارے تینوں بچوں نے سرگوشی کی کہ بھلکڑ فاطمہ پھر ٹھنڈا مشروب لانا بھول گئی ہے، جیسے کہ اکثر بھول جایا کرتی ہے۔ میں نے بچوں کو منع کیا کہ وہ فاطمہ کا مذاق نہ اڑایا کریں کیونکہ اب وہ بزرگی کی عمر میں داخل ہو گئی ہے۔

فاطمہ ہمارے محل مین اس وقت سے ملازم تھی جب ہم نے یہ محل خریدا تھا۔ عبداللہ دو سال کا تھا جب یہ مصری خادمہ ہماری زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ اس کے بھلکڑ پن کے باعث کریم نے کئی بار شکایتاً کہا تھا کہ اسے فارغ کر کے کوئی زیادہ مستعد خاتون رکھ لی جائے مگر میں اس پر آمادہ نہ ہوئی کیونکہ فاطمہ بھروسے کے قابل تھی اور اسے ہمارے تینوں بچوں سے حقیقی محبت تھی۔ چنانچہ کریم نے مجھے الزام دیا کہ تم فاطمہ کی

جدائی شاید اس لیے برداشت نہیں کر سکتیں کہ وہ تمہیں قاہرہ کے اسکینڈلوں کی تازہ بہ تازہ کہانیاں سنا کر خوش کرتی رہتی ہے۔

اسی وقت فاطمہ سنگِ مرمر کے فرش پر اپنے سینڈل کھڑکھڑاتی نمودار ہوئی۔ میں نے کریم کی طرف دیکھا تو اس نے ناخوشگوار موڈ میں سر ہلا دیا۔ میں نے شرارت سے کہا: ''شوہر صاحب! یہ نہ بھولو کہ خدا تمہیں دیکھ رہا ہے۔''

کریم نے ترت جواب دیا: ''سلطانہ! تمہیں میرے خدا سے لگاؤ کی کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔'' بچوں کو خطرہ لاحق ہوا کہ ہماری تکرار سے کہیں خوشگوار سہ پہر برباد نہ ہو جائے' چنانچہ امانی نے اپنے بازو باپ کے گلے میں ڈال دیئے جبکہ مہا یہ کہتے ہوئے میرے شانے سہلانے لگی: ''امی! پرسکون رہیں۔'' عبداللہ نے آگے بڑھ کر فاطمہ کے ہاتھوں سے لیمن جوس سے بھرے جگ اور کرسٹل گلاسوں کی ٹرے لے لی اور میز پر رکھ دی۔ اس نے اصرار کیا کہ وہ مشروب پیش کرے گا۔ اس پر کریم کے ہونٹ بطور احتجاج بھنچ گئے۔ اسے یہ بات پسند نہ آئی کہ اس کا بیٹا خادم کے فرائض انجام دے۔ میں نے کریم کی توجہ ہٹانے کے لیے عبداللہ سے کہا کہ وہ اپنی لبنان کی مہم پر روشنی ڈالے۔ اس نے بتایا کہ وہ لبنانیوں کے جذبہ تعمیر سے بہت متاثر ہوا ہے' جو طویل خانہ جنگی کے دور سے گزرے ہیں۔ اب اس ملک میں سرمایہ کاری کی بہت گنجائش ہے۔ اس پر کریم کا چہرہ کھل اٹھا کیونکہ سرمایہ کاری اس کا دل پسند موضوع تھا۔ لیکن جب عبداللہ نے بتایا کہ اس نے دس لاکھ ڈالر کا بڑا حصہ اس ہسپتال کو بطور عطیہ دے دیا جس میں جعفر کا بڑا بھائی داخل تھا تو اس کے باپ کی ساری خوشی ہوا میں تحلیل ہوگئی۔ اسے ایک ملین ڈالر ہاتھ سے جانے کا بڑا قلق تھا۔ اب عبداللہ لبنانی خانہ جنگی کے زخمیوں اور اپاہجوں کی حالت زار بیان کرنے لگا۔ اپاہج کمروں تک محدود رہتے تھے کیونکہ ان کے لیے وہیل چیئرز اور مصنوعی اعضا میسر نہ تھے۔ کئی ایک کے جسم بے حس ہو چکے تھے۔ ایک خوشی کی بات یہ تھی کہ فواد نے اصرار کیا تھا کہ اس کے داماد کا بھائی ان کے ساتھ سعودی عرب چلے اور ان کے خاندان کا فرد بن کر رہے۔ عبداللہ نے ایک تجویز

پیش کی کہ ہم لبنان میں جدید ترین ساز وسامان سے آراستہ ایک ہسپتال قائم کریں۔
اس پر کریم آنکھیں بند کر کے اپنی پیشانی ملنے لگا۔

اسی اثنا میں اندر سے فاطمہ کی چیخ سنائی دی۔ عبداللہؑ میں اور میری دونوں بچیاں آگے پیچھے لپک کر اندر گئے تو دیکھا کہ فاطمہ بھیڑ کا گوشت بھونتے ہوئے روئے جارہی تھی۔ عبداللہ نے آگے بڑھ کر پوچھا: ''کیا بات ہے فاطمہ؟''

''اے عبداللہ! سب سے خوش قسمت عورت وہ ہے جو کبھی پیدا نہ ہوئی ہو اور خوش قسمتی میں دوسرا درجہ اس عورت کا ہے جو شیر خوارگی ہی میں مر جائے۔'' یہ کہتے ہوئے فاطمہ اپنا سینہ پیٹنے لگی۔

مہا نے لکڑی کا کفگیر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور امانی اچھے لفظوں سے اس کی دلداری کرنے لگی۔ میرے ذہن میں آیا کہیں فاطمہ کے خاوند نے اسے طلاق دے کر دوسری شادی نہ کر لی ہو۔

فاطمہ کا خاوند عبدل ہمارا مالی بھی تھا اور ڈرائیور بھی۔ ہمارے قاہرہ کے محل میں رہ کر ان کے پاس اپنے بچوں کو دینے کے لیے کافی وقت ہوتا تھا جو اپنی دادی کے ساتھ ایک اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ ہم نے فاطمہ کو بیٹھک میں لا کر آرام کرسی پر بیٹھا دیا جبکہ باورچی خانے میں مہا اس کا نامکمل کام انجام دیتی رہی۔ میں نے عبداللہ اور امانی کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور پھر فاطمہ سے پوچھا: ''کیا عبدل نے تمہیں طلاق دے دی ہے؟'' فاطمہ چنک کر بولی: ''عبدل مجھے طلاق دے گا؟ وہ بوڑھا ایسا کرے تو سہی، میں اس گنجے کا سر انڈے کی طرح توڑ کر اس کا بھیجا بھون ڈالوں گی!''

میں بمشکل اپنی ہنسی روک پائی کیونکہ ماضی میں کریم نے بارہا کہا تھا کہ عرب دنیا میں کم از کم ایک شادی شدہ عورت ایسی ہے جس سے اس کا خاوند بری طرح خوفزدہ رہتا ہے۔ ایک مرتبہ کریم نے خود دیکھا تھا کہ فاطمہ ایک چوبی تختی عبدل کی پشت پر برسا رہی تھی۔ عبدل جسامت میں فاطمہ سے نصف تھا اور اس کی مجال نہیں تھی کہ اف بھی کرے۔

میرے استفسار پر فاطمہ نے بتایا: ''معاملہ میری نواسی کا ہے۔ اس کا باپ انسان کی شکل میں گدھا ہے۔ اگر میری بیٹی اجازت دے تو میں ناصر کا اپنے ہاتھوں سے گلا دبا دوں لیکن وہ کہتی ہے کہ وہ اور اس کے گھر والے جیسے بہتر سمجھتے ہیں' زندگی بسر کر رہے ہیں۔ غضب خدا کا' میری اپنی بیٹی کہتی ہے کہ میں ان کے خانگی معاملات سے دور رہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے داماد کو صلواتیں سنانے اور نواسی کی سلامتی کی دعائیں مانگنے لگی۔

جب میں نے سختی سے کہا کہ فاطمہ پہیلیاں نہ بجھواؤ اور اصل بات کہو تو اس نے بتانا شروع کیا:

''آج رات وہ الحان کو مکمل عورت بنا دیں گے۔ انہوں نے نو بجے ایک حجام بلا رکھا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ یہ رسم ضروری نہیں۔ میری کسی بیٹی کو اس اذیت سے نہیں گزرنا پڑا تھا۔ اب یہ ناصر کروا رہا ہے۔ مالکہ! میری مدد کریں۔'' میرے ذہن میں وہ خوفناک واقعہ گھوم گیا جو میری سب سے بڑی بہن نورہ نے سنایا تھا' جب وہ عورت بننے کی اذیت سے گزری تھی۔ ان دنوں کریم سے میری شادی نہیں ہوئی تھی اور میں سولہ برس کی تھی۔ میری ماں تھوڑا عرصہ پہلے فوت ہو گئی تھی اور نورہ نے بڑی بہن کی حیثیت سے عورت کے ختنے کے متعلق تفصیلات مجھے بتائی تھی۔ اس وقت تک مجھے معلوم نہ تھا کہ نورہ اور اس کے بعد ہماری دو دوسری بہنوں کے بھی ختنے ہو چکے ہیں' جو ان کے لیے زندگی بھر کا روگ بن چکے ہیں۔

ماضی قریب میں سعودی عرب میں نسوانی ختنے عام تھے۔ گزشتہ سال میں نے ایک کتاب پڑھی تھی' جو میرے بیٹے عبداللہ نے لندن میں خریدی تھی۔ کتاب کا عنوان تھا:

"The Empty Quarter"

(الربع الخالی)

اور اس کتاب کا مصنف مشہورِ زمانہ برطانوی صحرائی مہم جو سینٹ جان فلبی

تھا۔ میرے دادا ملک عبدالعزیز ابن سعود کی مدد سے فلبی نے عشرہ 1930ء میں عرب کی وسیع سیاحت کی تھی۔ مجھے اس میں عرب قبیلوں کی تاریخ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی تھی۔ ایک باب میں اس انگریز نے خواتین کے ختنے کا ذکر کیا تھا۔ اس کی تفصیلات پڑھتے ہوئے مجھے اپنی بہنوں کی اذیت کا حقیقی اندازہ ہوا تھا اور میں چیخ اٹھی تھی۔ فلبی نے قبیلہ مناسر میں رائج خواتین کے ختنے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: ''وہ لوگ عورتوں کو بالغ ہونے دیتے ہیں اور ان کی اندام نہانی کا اندرونی حصہ ان چھوا ہوتا ہے۔ جب کسی لڑکی کی شادی کا مرحلہ درپیش ہو تو ایک دو ماہ پہلے ضیافت منعقد کرتے ہیں۔ اس ضیافت میں لڑکی کا ختنہ کیا جاتا ہے جبکہ دوسرے قبائل قحطان' مرۂ بنی مجر اور عجمان یہ کام لڑکی کی پیدائش کے ساتھ ہی کر ڈالتے ہیں۔ اس طرح ان کی عورتیں دوسروں کے لیے زیادہ شہوانی اور زیادہ آتشیں ہو جاتی ہیں۔ ختنے کا کام ان کی عورتیں خیموں کے اندر انجام دیتی ہیں اور انہیں اس کا معاوضہ ایک آدھ ڈالر ملتا ہے۔''

یہ کس قدر احمقانہ بات تھی کہ ختنے کی وحشت سے گزر کر عورت کی شہوت بڑھ جاتی ہے۔ یہ فقط مردوں کا گھڑا ہوا افسانہ تھا کیونکہ مجھے بتایا گیا کہ اس عمل سے گزرنے کے بعد عورت کا جنسی جذبہ بڑھنے کے بجائے اس میں جنسی بے رغبتی پیدا ہو جاتی ہے۔

میرے دادا عبدالعزیز ابن سعود اپنے وقت سے بہت آگے تھے اور ہر معاملے میں بہتر پہلو کو ترجیح دیتے تھے' چنانچہ وہ عورتوں کے ختنے یا مردوں کے زیرناف ختنے کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ مردوں کے زیرناف ختنے میں ناف کے نیچے ٹانگوں کے اندر تک کھال اتار دی جاتی تھی۔ ہمارے اس پہلے بادشاہ نے ختنے کے ظالمانہ عمل کو دیکھتے ہی اس پر پابندی لگا دی۔ میرے دادا کے حکم کے باوجود پرانے طریقے عرصے تک برقرار رہے۔ خود میری ماں نے شاہی حکم کو پس پشت ڈالتے ہوئے اپنی تین بیٹیوں کے ختنے کروا ڈالے۔ بعض قبائل نے عورتوں کے ختنے یکسر ممنوع قرار دے دیئے۔ تاہم دوسرے قبیلوں میں یوٹرس کے اندرونی بڑے لبوں کا ختنہ کیا جاتا رہا جو اس قدر عام نہیں اور مردانہ ختنے سے مشابہت رکھتا ہے۔ ان قبیلوں کی خواتین کس قدر مظلوم تھیں' جن میں

بڑے اور چھوٹے لبوں دونوں کا ختنہ رائج تھا۔ نسوانی ختنے کا یہ طریقہ بہت عام ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے مرد کے رکن کا سر کاٹ دیا جائے۔ میری تین بہنوں کا ختنہ بھی اسی طریقے سے ہوا تھا۔ ہمارے خاندان کی دوسری عورتیں ختنے کے آپریشن سے بچ گئیں کیونکہ میرے والد میری والدہ کو قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ نسوانی ختنہ دور جاہلیت کی کافرانہ رسم ہے اور اسے روکنا ضروری ہے۔

ایک اور ظالمانہ اور خوفناک طریقہ فرعونی ختنہ ہے۔ اس میں خواتین کو جو اذیت برداشت کرنی پڑتی ہے وہ ناقابل تصور ہے۔ اس میں یوٹرس کا اندرونی حصہ مکمل طور پر نکال دیا جاتا ہے۔ ختنے کے یہ مختلف طریقے مصر اور دیگر افریقی ممالک میں آج بھی رائج ہیں، تاہم سعودی عرب میں ان کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا ہے۔ عرب میں یہ رسوم بھی زیادہ تر افریقی نژاد خاندانوں میں رائج تھیں جو سزا کا خطرہ مول لے کر بھی ان پر عمل کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورتوں کی جنسی لذت میں کمی ہی سے ان کی پاک دامنی محفوظ رہ سکتی ہے۔

فاطمہ نے میرا بازو پکڑ کر کھینچا تو میں ماضی سے حال میں واپس آئی۔ نوجوان لڑکی الحان کا معصوم چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا جو کئی بار اپنی دادی سے ملنے ہمارے محل میں آئی تھی۔ میرے تصور میں وہ یوں آئی کہ اسے حجام کے سامنے لایا گیا ہے، اس کی ماں اس کی شلوار اتارتی ہے، اس کی ٹانگیں حجام کے سامنے پھیلی ہوئی ہیں، جس کے ہاتھ میں خوفناک استرا ہے۔ یہ سوچ کر میرے بدن میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ ایک ماں اپنی خوبصورت بچی کو ایسی اذیت سے گزارنا پسند کرتی ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کے مطابق دنیا بھر میں آٹھ دس کروڑ عورتوں کو ختنے کروانے پڑتے ہیں۔

فاطمہ نے پرامید ہو کر پوچھا: ''مالکن! کیا آپ میری نواسی کو بچا سکتی ہیں؟''

''میں وہ کام کیسے کر سکتی ہوں فاطمہ، جسے تم نہیں کر سکتیں؟''

''آپ شہزادی جو ہوئیں۔ میری بیٹی ایک شہزادی کی بات مان لے گی۔ آپ میرے ساتھ میری بیٹی کے ہاں چلیں تو سہی۔ ناصر اس وقت اپنے کام پر ہو گا۔'' فاطمہ

نے کہا۔

میں نے بال سنوارے اور لپ سٹک لگائی۔ میرا خیال تھا کہ کریم سے کہہ دوں گی کہ فاطمہ کو آج صبح ہی پتا چلا کہ اس کی بیٹی کسی نسوانی بیماری میں مبتلا ہے لیکن وہ یہ کہتے ہوئے علاج نہیں کرا رہی کہ خدا کی مرضی یہی ہے' لہٰذا میں فاطمہ کے ساتھ اس کی بیٹی کو سمجھانے جا رہی ہوں۔ میں سمجھتی تھی کہ اگر میں حقیقت بیان کر دوں تو کریم مجھے کبھی نہ جانے دے گا لیکن اس غلط بیان کی نوبت ہی نہ آئی کیونکہ فاطمہ اور میری گفتگو کے درمیان کریم کے لیے فون آ گیا تھا اور وہ میرے لیے یہ پیغام چھوڑ کر چلا گیا تھا کہ وہ اپنے کزن سے ملنے قاہرہ کیسینو جا رہا ہے اور شام کو دیر سے لوٹے گا۔

عبداللہ ٹی وی پر مصری سوپ اوپرا دیکھنے میں محو تھا۔ میں نے دیکھا کہ امانی کے ہونٹ بری طرح بھنچے ہوئے تھے۔ وہ اپنے بھائی کی پسند پر ناخوش تھی کیونکہ اس مصری اوپرا میں کئی نامناسب جنسی مناظر تھے۔ اسی وجہ سے سعودی عرب میں اس پر پابندی لگی تھی۔

جب میں نے عبداللہ سے کہا کہ مجھے نئی سفید مرسیڈیز مین فاطمہ کے گھر لے چلو تو وہ اچھل پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کریم کبھی اسے نئی سفید مرسیڈیز قاہرہ کے مصروف اندروانی شہر میں چلانے کی اجازت نہ دیتا بلکہ وہ تو ڈرائیور سے بھی کہتا کہ پرانی مرسڈیز لے جاؤ۔ نئی مرسیڈیز اس نے خاص قاہرہ والے محل کے لیے درآمد کی تھی۔

راستے میں عبداللہ نے پوچھا کہ ہمارا فاطمہ کی بیٹی کے ہاں چلنے کا مقصد کیا ہے۔ میں نے اس سے معاملہ خفیہ رکھنے کی قسم لی اور راز کی بات کہہ دی۔ عبداللہ کے چہرے پر غصے کی لہر دوڑ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ آج کے دور میں بھی لوگ ایسی ظالمانہ رسوم پر عمل کرتے ہیں۔ پہلے تو جی میں آیا کہ میں اسے اس کی خالہ نورہ کا المناک قصہ سنا دوں مگر پھر مصلحتاً میں نے ارادہ بدل لیا اور نسوانی ختنے کی تاریخ بیان کرنے لگی۔

مرسیڈیز سڑک پر ایک دکان کے سامنے کھڑی کر کے ہم ایک تنگ گلی میں

داخل ہوئے جس کا فرش پتھر کی اینٹوں کا تھا۔ فاطمہ کی بیٹی گلی کے وسط میں ایک تین منزلہ عمارت کی بالائی منزل پر رہتی تھی۔ عبداللہ نیچے رک گیا کہ بحیثیت غیر مرد اس کا اس گھر کے اندر جانا مناسب نہیں اور قریبی کیفے میں بھیڑ کے گوشت کے سینڈوچ ''شوارمہ'' سے اپنی بھوک مٹانے چلا گیا۔ اسے علم نہیں تھا کہ فاطمہ کے گھرانے میں غیر مرد کے داخلے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ الہام اور اس کی تین بیٹیوں نے اوپر سے ہمیں دیکھ لیا تھا اور انہوں نے سیڑھیوں میں ہمارا استقبال کیا۔ انہیں ہماری اس اچانک آمد پر حیرت تھی اور جب فاطمہ نے میرا بطور سعودی شہزادی و مالکہ الہام سے تعارف کرایا تو وہ میری طرف تکنے لگی۔ فاطمہ کی اس بیٹی سے میں پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔ میرے کانوں میں ہیرے کے آویزے تھے۔ یہاں آ کر مجھے خیال آیا کہ اس غربت کے ماحول میں اتنے قیمتی آویزے اور شادی کی انگوٹھی پہن کر نہیں آنا چاہیے تھا۔ الہام کی سب سے چھوٹی بیٹی چھ سال کی تھی؛ اس نے اپنی ننھی منی انگلیوں سے میری انگوٹھی کے قیمتی ہیرے کو چھوا تو اس کی ماں نے اسے تھپڑ رسید کر کے روک دیا۔ الہام ہمیں چھوٹی سے بیٹھک میں بٹھا کر خود چائے بنانے چلی گئی۔ فاطمہ کی دونواسیاں اس کی گود میں تھیں اور ایک اس کے قدموں میں بیٹھی تھی۔ الحان کہیں دکھائی نہ دی۔ کمرے میں قالین پرانا اور گھسا ہوا تھا اور غلاف وغیرہ پھٹے ہوئے تھے۔ کونے میں چوکور میز پر دینی کتابیں دھری تھیں۔ چھت سے ایک گیس لیمپ لٹک رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس اپارٹمنٹ میں بجلی کی سہولت نہیں تھی۔ البتہ الہام نے اپنا گھر صاف ستھرا رکھا ہوا تھا۔ الہام نے چائے اور باداموں والے بسکٹوں سے ہماری تواضع کی۔ اس نے بتایا کہ بسکٹ آج شام کی تقریب کے لیے اس نے خود تیار کیے ہیں۔ اس کے بقول الحان اس تقریب کے لیے پرجوش تھی اور چھت پر قرآن مجید کی تلاوت کر رہی تھی۔

آخرکار فاطمہ نے نازک موضوع چھیڑا اور الہام سے التجا کی اپنی بچی کو اذیت سے بچانے کے لیے شام کی تقریب منسوخ کر دے۔ بیٹی کے رویے میں کوئی نرمی نہ پا کر اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس تعلیم یافتہ اور روشن خیال خاتون

کی بات پر ہی دھیان دو، جس نے بڑے قابل معالجین سے سنا ہے کہ ہمارا دین لڑکیوں کے ختنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ یہ محض دور جاہلیت کی ایک رسم ہے جس کی عہد حاضر میں کوئی تک نہیں۔ میں نے الہام سے کہا کہ قرآن مجید میں اس رسم کا کوئی ذکر نہیں اور اگر اللہ ضروری سمجھتا کہ عورتوں کا ختنہ کیا جائے تو وہ اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یقیناً اس کے بارے میں کوئی حکم نازل فرماتا۔

شام کی روشنی کمرے سے رخصت ہو رہی تھی۔ ناصر کے آنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اتنی بحث وتکرار کے بعد بھی الہام قائل نہ ہوئی تھی، اس کا کہنا تھا کہ ختنے کا فیصلہ اس کے شوہر کا ہے۔ اس کی نگاہوں سے اندازہ ہو گیا کہ وہ اب مجھے رخصت کرنا چاہتی ہے، چنانچہ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ فاطمہ ناکامی پر رونے پیٹنے لگی تو الہام نے اپنی ماں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ مجھے الوداع کرتے ہوئے الہام نے کہا: ''شہزادی سلطانہ! میرے گھر تشریف لا کر آپ نے مجھے اعزاز بخشا ہے۔ کسی اور روز بھی تشریف لائیے گا۔'' فاطمہ وہیں رہ گئی کہ ختنے کی رسم ادا ہوتے وقت حجام کو تلقین کرے گی کہ وہ بچی کو زیادہ تکلیف نہ دے۔

کیفے کے باہر عبداللہ میرا انتظار کر رہا تھا۔ مرسیڈیز میں بیٹھ کر میں نے اسے اپنی ناکامی سے آگاہ کیا تو عبداللہ کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ راستے میں ہم خاموش رہے۔

کریم کیسینو سے لوٹا تو اس کے منہ سے شراب کی بدبو آ رہی تھی۔ اس پر امانی لمبی دعا مانگنے لگی کہ ''اللہ تعالیٰ میرے ابو کے گناہ معاف کر دے اور میرے گھر والوں کو دینی احکام کی پابندی کرنے کی توفیق دے اور انہیں جنت کا مستحق بنا۔'' وہ بھڑکتی ہوئی آگ کے جہنم والی آیات بھی پڑھ رہی تھی جو گناہ گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

مجھے امانی کی طرف سے عذاب کے یہ ڈراوے پسند نہ آئے۔ میں نے اس سے کہا کہ اللہ نے کب تمہیں خوف زدہ انسانیت کی اصلاح کا فریضہ سونپا ہے۔ میں نے اس کا گال نوچنے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا مگر کریم نے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ساتھ ہی امانی کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے نجی کمرے میں جا کر دعا مکمل کرے۔ وہ نشے

میں مجھے ڈانٹنے لگا کہ تمہیں غصے میں اپنے آپ پر کنٹرول نہیں رہتا اور اب وقت آ گیا ہے کہ تمہیں سبق سکھایا جائے۔ کریم کے ہونٹ نفرت سے بھنچے ہوئے تھے اور وہ لڑنے مرنے پر آمادہ تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا کہ کوئی ہتھیار میسر آئے جس سے اپنے خاوند کے سر پر زور دار ضرب لگاؤں مگر کریم بھی چالاک تھا' وہ میرے اور پیتل کے گلدان کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ میں نے سوچا کہ خالی ہاتھ تو میں جسامت میں دگنے شوہر سے مغلوب ہو جاؤں گی خصوصاً اس حالت میں جب کہ وہ نشے میں ہے۔ میں دل میں خود کو برا بھلا کہنے لگی کہ میں نے اس وحشی سے محبت کیوں کی تھی۔ پھر مصلحت کوشی اختیار کرتے ہوئے میں ہنس پڑی اور کریم سے کہا: ''دیکھو تم ایک ہاتھی لگتے ہو جو ایک چیونٹی کو دھمکا رہا ہے۔'' پھر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے بولی: ''مجھے خوشی ہے کہ تم جلد گھر آ گئے۔ ان افسردہ لمحات میں مجھے تمہاری محبت کی شدید ضرورت تھی۔'' کریم کے حواس ابھی پورے طرح بحال نہیں ہوئے تھے' لہٰذا وہ داؤ میں آ گیا اور اپنے الفاظ پر معذرت کرنے لگا' پھر میرے شانے تھپتھپاتے ہوئے بولا: ''میں حیران ہوں میری پیاری بیوی پریشان کیوں ہے؟'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو نو بج رہے تھے۔ تب مجھے معصوم بچی الحان کا خیال آیا جو اس وقت ختنے کے ظالمانہ آپریشن کی تکلیف اٹھا رہی ہو گی۔ مجھے اپنا غم بھول گیا اور میں نے اداسی میں ڈوب کر اپنے شوہر سے کہا کہ عورتوں کی زندگی میں کوئی کشش نہیں اور میرے خیال میں تمام عورتوں کے لیے مر جانا بہتر ہے۔ کریم فکرمند ہو کر پوچھنے لگا: ''کیا تمہاری زندگی مکمل نہیں؟ آخر تمہیں کس چیز کی خواہش ہے جو میں فراہم نہیں کر سکا۔'' جب اسے معلوم ہوا کہ میری پریشانی کا سبب خواتین سے روا رکھی جانے والی سماجی ناانصافیاں ہیں تو اس نے مجھے یاد دلایا کہ اس نے اپنے گھر میں ان ناانصافیوں کا سایہ تک نہیں پڑنے دیا۔ تب میں نے سوچا' کریم دل جیتنے والی کشش سے بہرہ ور ہے جو اس کی ناگوار عادات کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اس نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا کہ سعودی عرب میں پیدا ہونا تمہاری ناگزیر قسمت تھی اور عورتوں کو اپنی ثقافت کی حدود کی پابندی کرنی چاہیے۔ میرا جذباتی بحران ابھی دور نہیں ہوا تھا'

چنانچہ میرے ذہن میں ایک بار پھر کریم کے لیے نفرت امڈ آئی۔

میں سوچ رہی تھی کہ سارے مردوں کو کسی طرح عورتوں میں تبدیل کیا جائے تا کہ وہ بذات خود ثقافت کی حدود کا مزہ چکھ سکیں اور عورتیں مردوں کے مرتبے پر فائز ہو کر تمام مراعات سے لطف اندوز ہو سکیں۔ پھر اسے خام خیال جان کر میں نے کریم سے کہا کہ ہمیں جلدی سو جانا چاہیے تا کہ صبح تر و تازہ اور نئے خیالات کے ساتھ بیدار ہو سکیں۔ کریم مان گیا کیونکہ صبح ہمیں قاہرہ سے روانہ بھی ہونا تھا۔

جب فاطمہ نے ہمیں صبح بخیر کہا تو خوش باش نظر آنے کی کوشش میں اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔ لگتا تھا اسے ہمارے اس اچانک اعلان پر کہ ہم قاہرہ سے مونٹی کارلو جا رہے ہیں، ہرگز خوشی نہیں ہوئی۔ مونٹی کارلو میں فرنچ ریویرا پر میری تین بہنیں اور ان کے اہل خانہ ہمارا انتظار کر رہے تھے جو مناکو کی ننھی ریاست میں تعطیلات گزار رہے تھے۔

فاطمہ نے سوگوار لہجے میں بتایا کہ ننھی الحان سے ہرگز رعایت نہیں کی گئی اور اس کے داماد کی ہدایت پر معصوم بچی کا اندرونی فرج چھوٹے لبوں سمیت نکال دیا گیا ہے اور خون کے بہاؤ کو روکنے کے لیے خصوصی طریقہ اختیار کیا گیا تھا۔ الحان کے کرب کا اندازہ کرتے ہوئے میرا جی بھر آیا اور فاطمہ میرے گلے سے لگ کر کہنے لگی: ''مالکن! آپ نے اپنی سی کوشش کی تھی۔ میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں کہ آپ کا دل ان لوگوں کے لیے محبت کے جذبے سے معمور ہے، جن سے آپ کا خون کا رشتہ نہیں۔ آپ اداس نہ ہوں۔'' مجھے اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ نہ ملے۔ فاطمہ مجھ سے الگ ہوئی۔ ہم نے دیر تک ایک دوسری پر نگاہیں جمائے رکھیں۔ پھر فاطمہ بولی: ''شہزادی سلطانہ! گزشتہ شام آپ میرے خواب میں آئی تھیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ مجھے اس خواب کا پیغام آپ تک پہنچا دینا چاہیے۔''

خوف کے مارے میرا سانس رک گیا کہ پتا نہیں وہ کیا کہہ دے۔ فاطمہ اداس لہجے میں کہنے لگی:

''مالکن! آپ زندگی کی مصروفیات میں گھری ہوئی ہیں، تاہم اندر سے آپ

خالی لگتی ہیں۔ یہ بے اطمینانی اس لیے ہے کہ ایک عورت کے جسم میں ایک بچے کا دل ہے۔ ایسا ملاپ انسان کی روح کے لیے بڑی مشکلات لاتا ہے۔ آپ یا کوئی اور ساری انسانیت کے مسائل حل نہیں کر سکتا۔ مجھے خواب میں بتایا گیا کہ میں آپ سے کہہ دوں کہ اس امر میں کوئی شرمساری نہیں کہ انسان حقیقت کے سامنے جھک جائے اور یہ کہ آپ کو اپنی رگوں میں جاری تصادم کی خواہش کو سرد ہونے دینا چاہیے۔''

اس وقت اپنی ماں کا چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں رہا تھا کہ میری ماں اپنی سب سے چھوٹی بیٹی سے روحانی رابطے کے لیے فاطمہ کو استعمال کر رہی ہے۔ فاطمہ کے الفاظ میں وہی نصیحت تھی جو میری ماں میرے بچپن میں اکثر کیا کرتی تھی اور اس کے لفظوں کی معنویت اب مجھے سمجھ آ رہی تھی۔ مجھ پر رقت طاری ہو گئی اور پھر ہچکی بندھ گئی۔ میں نے خود کو فاطمہ کی آغوش میں دے دیا۔ میں نے فاطمہ سے کہا: ''وہ کتنے خوش نصیب ہیں جن کی مائیں زندہ ہیں!''

☆☆☆

سہ پہر ختم ہونے کو تھی، جب ہمارا نجی جیٹ طیارہ نائس کوٹ انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر اترا۔ میری تینوں بہنوں کے خاوندوں نے مناکو کے اوپر پہاڑیوں میں ایک بڑا محل کرائے پر لے رکھا ہے۔ اسد نے تین لیموزین گاڑیوں کا بندوبست کر رکھا تھا جو ہمیں سامان سمیت ائیر پورٹ سے محل تک لے جانے کے لیے تیار تھیں۔

کرائے پر لیا گیا محل دراصل کسی فرانسیسی نواب کا محل تھا۔ اس میں ساٹھ سے زائد کمرے تھے۔ میری بہنوں کے خاوند سب ایک ایک بیوی پر اکتفا کیے ہوئے تھے، چنانچہ آٹھ بالغوں اور سولہ نابالغوں پر مشتمل چار گھرانوں کے لیے وہ محل خاصا وسیع تھا۔

ہم ساحلی الپس کی ڈھلانوں کے ساتھ نائس سے مناکو جانے کے لیے گرانڈے کورنشے پر روانہ ہوئے۔ صحرائی ملکوں کے بھورے اور خاکستری رنگ دیکھ دیکھ کر اب یورپ کا گھنا سبزہ آنکھوں کو سکون بخش رہا تھا۔

جب ہماری کار محل کے احاطے میں گول ڈرائیو وے میں ٹھہری تو میں اپنی

بہنوں سارہ' طاہانی اور نورہ کو سراپا انتظار دیکھ کر بہت خوش ہوئی لیکن یہ خوشی اس وقت کافور ہوگئی جب نورہ نے یہ بتایا کہ ریما ہسپتال میں ہے۔

''کیا؟'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میں حیران تھی کہ عمر کے لحاظ سے میری سب سے چھوٹی بہن کو کیا بیماری لاحق ہوئی ہے۔

''وہ زخمی ہوگئی ہے۔'' سارہ نے کہا۔

''ہائیں!'' بڑی مشکل سے میری آواز نکلی۔ فوری طور پر مجھے کار کے حادثے کا خیال آیا جو سعودی عرب میں اموات کا سب سے بڑا سبب ہیں' جہاں لڑکے سڑکوں پر بے دھڑک ریس لگاتے رہتے ہیں۔

میری بہنیں میرے سامنے خاموش کھڑی تھیں۔ کریم اور اسد بھی پاس کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے' مگر خاموش تھے۔ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا تو میں نے کہا: ''کیا میری بہن مر گئی ہے؟ کیا خاندان کے کسی فرد میں اتنی ہمت نہیں کہ مجھے بتا سکے؟ کیا وہ شدید زخمی ہے؟''

اب نورہ بولی: ''لگتا ہے کہ اس کے زخم جان لیوا نہیں۔''

عربوں کا بری خبر سنانے کا طریقہ بھی پاگل کر دینے والا ہے۔ میں چیخنا چاہتی تھی کہ کوئی پوری خبر سنا کر مجھے بے خبری کی اذیت سے نجات دلائے۔

''آخر ہوا کیا ہے؟ اس تکلیف دہ شک وشبہ کی نسبت کسی بھی خبر کو برداشت کرنا میرے لیے زیادہ آسان ہوگا۔''

میری بہنوں نے عجب انداز سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ یقیناً میری بہن مر چکی تھی! اس نے سارہ کو بازو سے تھامتے ہوئے کہا: ''آؤ' محل کے اندر چلیں۔ میں چائے بناؤں گا۔''

سارہ کے پیچھے میں بھی اندر چلی گئی۔ مجھے بے چاری ریما کا رہ رہ کر خیال آرہا تھا۔ ہماری پانچوں بہنوں کو خاندان میں ہر کسی کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ پیدائش سے لے کر ریما ظاہری حسن سے محروم تھی۔ اس کا چہرہ دغدار یا بگڑا ہوا بھی نہیں تھا' پھر

بھی نسوانی حسن سے خالی تھی۔ ایک بار نورہ نے مجھ سے کہا تھا: ریما واحد بیٹی ہے جسے ہماری ماں نے نیلے پتھر سے محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی، جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ وہ بدروحوں کو دور رکھتا ہے۔ ماں کا خیال تھا کہ اتنی بدصورت شیر خوار بچی پر کون بری نظر ڈالے گا۔ مزید براں ریما لڑکپن میں بھاری جسم والی ہو گئی جس کے باعث وہ ہم بچوں کے استہزا کا نشانہ بنتی تھی۔ میری نو بہنوں میں سے سارہ سب سے خوبصورت ہے۔ بقیہ میں سے چار بہنیں نمایاں حسن کی مالک ہیں۔ تین پرکشش ہیں جبکہ ریما کے چہرے پر خوبصورتی کا کوئی نشان نہیں۔ وہ اسکول اور کھیلوں میں بھی پیچھے رہی۔ اس کا واحد نمایاں کارنامہ یہ تھا کہ اس نے کھانے پکانے کے گر ٹھیک ٹھیک سیکھ لیے تھے۔ وہ لذیذ فرانسیسی اور عرب کھانے تیار کرنا سیکھ گئی تھی، جو اس کے پھیلتے ہوئے جسم کو کوئی فائدہ نہیں دیتے تھے۔

ہم نشست گاہ میں بیٹھ گئیں تو کریم اور اسد ہمیں چھوڑ کر چائے بنانے چلے گئے۔

''اب مجھے حقیقت بتاؤ۔ کیا ریما مر گئی ہے؟'' میں سراپا استفسار تھی۔

''نہیں'' نورہ نے اداسی ملی سنجیدگی سے کہا۔

''اس پر سلیم نے حملہ کیا تھا۔'' آخرکار طاہانی نے کہا۔ میرا جسم سن ہو گیا۔ نورہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی: ''ہماری پیاری بہن پر اس کے خاوند نے بری طرح حملہ کیا تھا۔''

''سلیم بھلا ریما کو نقصان کیوں پہنچانا چاہتا ہو گا۔ یقیناً ریما نے اسے کوئی بہانہ فراہم نہیں کیا ہو گا۔''

کئی پرکشش لوگوں کی طرح ریما ہمیشہ یہ چاہتی تھی کہ اپنے اردگرد والوں کو خوش رکھے۔ بدقسمتی سے ریما کی طرح سلیم بھی جسمانی حسن سے محروم تھا۔ اسے انتہائی خاموش، شریف اور ریما کا مکمل ساتھی سمجھا جاتا تھا۔ میں نے نورہ کے سامنے ایک منطقی توجیہہ پیش کرتے ہوئے کہا: ''کیا سلیم پاگل ہو گیا تھا؟ کیا اس وجہ اس نے ریما پر حملہ

کیا؟"

نورہ نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی کہ ایک سال پہلے ریما نے نورہ کو اعتماد میں لیتے ہوئے بتایا تھا کہ سلیم کے رویے میں اچانک تبدیلی آ گئی۔ وہ چڑچڑا ہو گیا اپنی بیوی اور چار بچوں میں بلاوجہ کیڑے نکالنے لگا۔ اس نے کام میں دلچسپی لینی چھوڑ دی اور نصف سہ پہر تک بستر میں پڑا رہتا۔ پھر ایک روز اس نے ریما کو بتایا کہ اسے اس سے کبھی محبت نہیں رہی اور اس نے محض سماجی مقام حاصل کرنے کے لیے ریما سے شادی کی تھی۔ اس سے پہلے سلیم شاذ و نادر شراب پیتا تھا مگر اب وہ بلانوش بن گیا تھا اور نشے میں اپنی بڑی بیٹی کو پیٹ ڈالتا۔ ریما نے نورہ سے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ وہ جلد اسے طلاق دے دے گا اور اسے دونوں چھوٹے بیٹوں سے جدا کر دیا جائے گا۔ نورہ اپنی بہن کو کوئی مشورہ دینے سے قاصر تھی کیونکہ دونوں خاندانوں میں چپقلش تھی۔ سلیم کے خاندان والوں نے نورہ کی ایک بیٹی کا رشتہ مانگا تھا۔ چونکہ نورہ اور احمد اپنی اس بیٹی کا رشتہ طے کر چکے تھے لہٰذا انہوں نے انکار کر دیا یوں ریما سے سلیم کی نفرت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ جلدی جلدی مشرق بعید کے دوروں پر جانے لگا۔ یہ دورے کاروباری نہ ہوتے تھے۔ ریما کو اس کے سامان میں سے کچھ بروشر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ وہ بنکاک اور منیلا جنسی عیاشی کے لیے جاتا ہے۔

تقریباً ایک ماہ پہلے ریما نورہ کے گھر آئی۔ اس کا چہرہ زخمی تھا۔ اس نے یہ گھناؤنا انکشاف کیا۔ اس نے سلیم کو ایک سری لنکن خادمہ کے ساتھ دیکھ لیا۔ اس نے جب احتجاج کیا تو اس نے ریما کو دھمکایا اور کہا کہ اگر اس نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو کچھ بتانے کی کوشش کی تو وہ اس سے بچے بھی چھین لے گا۔

اگرچہ کئی سعودی مرد غیر عورتوں سے جنسی آسودگی کے لیے رجوع کرتے ہیں مگر ہمارے خاندان کی کسی لڑکی کی شادی کسی ایسے مرد سے نہ ہوئی جو کہ غیر عورتوں سے جنسی تعلقات رکھتے ہوں جبکہ یہاں تو نوبت گھریلو خادمہ سے منہ کالا کرنے تک آ پہنچی تھی۔

پریشانی کے عالم میں ریما ایک مصری عالمہ سے ملنے گئی اور اس سے کہا کہ وہ اس کے سوال کا تحریری فتویٰ کی صورت میں جواب دے ''کیا اسلام کسی مرد کو اجازت دیتا ہے کہ وہ اپنی خادمہ سے نکاح کیے بغیر مباشرت کرے؟''

ریما یہ چاہتی تھی کہ اس دینی تحریری فتوے کی صورت میں سلیم اپنی عادات بد پر غور کرے گا اور اس پر توجہ دے گا۔ ہماری معصوم بہن سمجھتی تھی کہ اس کا شوہر قرآنی احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا۔ لیکن نورہ نے اس کو منع کر دیا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ سلیم مکمل شعوری حالت میں نہیں تھا۔

میرے پوچھنے پر نورہ نے اس فتوے کے بارے میں بتایا کہ اس مصری عالمہ کے فتوے میں لکھا تھا: ''اسلام ایک آقا اور ایک خادمہ کے درمیان جنسی تعلق کی اجازت نہیں دیتا۔ ایسے جنسی تعلق کا تصور اللہ کے غضب کو دعوت دینے والا ہے اور اسلام میں جنسی تعلق صرف نکاح کے ذریعے ہی قائم کیا جا سکتا ہے۔'' مگر نورہ کا کہنا تھا کہ یہ فتویٰ بھی سلیم کے حملے کی وجہ نہیں بنا۔

جب نورہ نے اس سانحے کی تفصیل بتانی شروع کی تو سارہ روتے اور یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی کہ اس میں اس دردناک تفصیل کو دوبارہ سننے کا حوصلہ نہیں ہے۔ طاہانی اس کو دلاسا کے لیے اس کے پیچھے گئی لیکن اسد دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ مجھے اس کی جھلک نظر آئی اس نے اپنی بیوی کے گرد بازو حمائل کیا' طاہانی واپس آ گئی اور میرے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ نورہ بتانے لگی: ''ڈاکٹر نے ہمیں ساری تفصیل نہیں بتائی لیکن ابا اور علی اس کے دفتر میں گئے تھے اور اس نے ان کو اصل واقعہ کی تفصیلات بتائی ہیں جس کا اعتراف سلیم نے ڈاکٹر کے سامنے کیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلیم بنکاک کا چکر لگا کر آیا تھا اور فحش فلم کی کیسٹ ساتھ لایا تھا۔ آدھی رات تک شراب نوشی اور فلم بینی کرنے کے بعد وہ اپنی بیوی سے محبت کرنا چاہتا تھا۔ حالانکہ کچھ عرصے سے اس نے ریما سے محبت کے اظہار کا سلسلہ بند کر دیا۔ اس نے بیوی کو اس مقصد کے لیے جگایا تو بیوی نے اس کو بتایا کہ اس کے ماہانہ ایام شروع ہو گئے ہیں۔''

نشے کی حالت میں بیوی کی مخصوص حالت اور اس کے انکار پر وہ غصے میں آ گیا۔ اس نے ریما کو بری طرح زودوکوب کیا۔ اور اس سے خلاف وضع فعل کیا۔ جس کی یکسر ممانعت ہے۔ پرائیویٹ کلینک کے ڈاکٹر نے والد کو بتایا کہ سلیم کا حملہ اس قدر وحشیانہ اور جارحانہ تھا کہ کلینک پر ان کو ریما کے مقعد کا آپریشن کرنا پڑا۔ اب بقایا زندگی ریما کو ایک مخصوص تھیلی پہننا پڑے گی۔

میرے منہ سے بے اختیار دبی دبی چیخ نکل گئی۔ افسوس صد افسوس ہماری معصوم بہن ریما ساری زندگی کے لیے معذور ہوگئی؟ اب مجھے اندازہ ہوا کہ سارہ کس وجہ سے کمرے سے چلی گئی تھی؟ کیونکہ جب اس کی مرضی کے خلاف اس کی شادی ایک ذہنی مریض سے کی گئی تو وہ بھی ایسی ہی آبروریزی سے گزری تھی۔ جب میں نے استفسار کیا کہ کیا سلیم کو جیل بھیج دیا گیا تو طاہانی چلاتے ہوئے بولی: ''جیل؟ وہ آزاد ہے کہ جو اس کا دل چاہے کرتا پھرے!''

میں نے کہا: ''سلیم کا رویہ خلافِ شرع ہے۔ ہم غیر شرعی رویے پر اس کے خلاف مقدمہ کر سکتے ہیں۔''

نورہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی: ''سلطانہ میری بہن! بچوں کی طرح کی باتیں نہ کرو۔ اس ملک میں کون ہے جو شوہر کے خلاف بیوی کا ساتھ دے گا؟ خود ہمارے بھائی اور باپ نے کہا ہے کہ یہ ان دونوں یعنی سلیم اور ریما کا ذاتی معاملہ ہے اور اس میں خاندان کا کوئی فرد دخل نہیں دے گا۔''

طاہانی بولی: ''والد نے ہمیں منع کیا تھا کہ تمہیں اس واقعہ کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ مگر ہم نے مناسب خیال کیا کہ تمہیں بتا دیا جائے۔''

میں نے تلخی سے کہا: ''ریما کو چاہیے سلیم سے فوراً خلع لے لے۔''

اور اپنے بچوں سے ہاتھ دھو بیٹھے؟ دونوں لڑکیاں بالغ ہو گئی ہیں جبکہ لڑکے آٹھ اور نو سال کے ہیں۔ سلیم کو حق حاصل ہے کہ وہ انہیں ان کی ماں سے لے لے، اور وہ یقیناً ایسا ہی کرے گا۔'' ''سلطانہ! اپنے بچوں کے بغیر ریما تو مر ہی جائے گی۔''

نورہ نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

آخر میں ہم بہنوں نے فیصلہ کیا کہ ریاض میں ریما کو ہماری زیادہ ضرورت ہے۔ اس لیے ہم نے اپنے شوہروں اور بچوں کو مونٹی کارلو میں چھوڑ کر اگلے دن واپس سعودی عرب روانہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ اسی شام کریم نے میری افسردگی دور کرنے کے لیے کہا کہ ریما زخموں سے مری نہیں' اور جہاں زندگی بچ گئی ہے تو کوئی تبدیلی بھی آ جائے گی۔ اس کے خیال میں سلیم اس وقت مردانہ بحران کا شکار ہے اور یہ بحران جلد ہی گزر جائے گا۔ جب میں نے کہا کہ سلیم کو شریف النفس ریما پر مجرمانہ حملے کی سزا بھگتنی پڑے گی تو کریم مجھ سے مذاق کرتے ہوئے بولا: ''سلطانہ! میں نہیں چاہتا کہ تمہیں جلاد کی تلوار کے لیے تیار پاؤں۔ تمہیں سلیم کی جان بخش دینی چاہیے۔''

☆☆☆

ملک خالد انٹرنیشنل ائیرپورٹ پر ہمارا بھائی علی ہم سے ملا۔ یہ ہوائی اڈہ ریاض سے بائیس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس نے بتایا کہ ہمیں براہ راست نجی کلینک لے جایا جائے گا' جہاں ہم ریما سے مل سکیں گے۔ راستے میں ہماری خاموشی ختم کرنے کے لیے علی نے بتایا کہ وہ ان دنوں خانگی بحران میں مبتلا ہے۔ اس نے کہا کہ اسے سلیم کے خانگی معاملے میں ملوث ہونے کی وجہ سے خواہ مخواہ پریشانی اٹھانی پڑ رہی ہے۔ اس کے خیال میں سلیم کے حملے کی ریما خود ذمہ دار ہے۔ میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکی: ''علی ہر گزرتے دن کے ساتھ تمہاری جہالت بڑھ رہی ہے اور عقل سکڑ رہی ہے۔''

میرا دل کیا کہ میں علی کے ایک چپت لگا دوں مگر میں نے نورہ اور طاہانی کا لحاظ کر کے اپنے آپ کو قابو میں رکھا۔ وہ مجھ سے صرف ایک سال بڑا تھا مگر چہرے سے وہ دس سال بڑا لگتا ہے۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں اور آنکھوں کے گرد بھی حلقے ابھر آئے تھے۔ جوانی میں وہ خوبصورت اور پرغرور جوان تھا۔ اس کی زندگی کا دل پھینک طریق اب ادھیڑ عمری میں اس کے چہرے اور شکل سے ظاہر ہوتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اپنی جسمانی کشش کھو رہا تھا۔

ہماری دس بہنوں میں واحد نورہ تھی جو علی سے حقیقی محبت کرتی تھی۔ جبکہ باقی نو بہنیں اس کے لیے ترس، نفرت، حسد اور کھلی ناپسندیدگی وغیرہ کے جذبات رکھتی تھیں۔

علی سے نورہ نے استفسار کیا کہ تمہارا خانگی بحران کیا ہے تو اس نے کار کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بتایا کہ اس نے ندا کو طلاق دے دی ہے۔

''علی! تم ندا کو طلاق کیسے دے سکتے تھے؟ جبکہ تم نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ تم اب کبھی دوبارہ اسے طلاق نہیں دو گے۔'' نورہ نے جواباً اسے کہا۔ ندا، علی کی خوبصورت ترین اور دلپسند محبوبہ اور بیوی تھی۔ اس نے سات سال پہلے اس سے شادی کی تھی۔ ان کی تین پیاری پیاری بچیاں تھیں۔ یہ درست ہے کہ اسلام مرد کو طلاق کا حق دیتا ہے مگر یقیناً مردوں کا یہ سلوک برداشت کے لائق نہیں کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر اپنی بیویوں کو طلاق دے دیں۔ جو مرد بھی اپنی بیوی کو سزا دینا چاہتا ہو۔ وہ ''میں نے تمہیں طلاق دی'' کہہ کر اپنا ازدواجی رشتہ ختم کرے اور اس کے بچے چھین کر گھر سے نکال باہر کرے، یہ اسلام کی تعلیمات کے برعکس ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ علی نے اپنی ہر بیوی کو ایک بار مگر ندا کو دوسری بار طلاق دی ہے۔ کئی بار علی کا غصہ ختم ہوتا تو طلاق کے فیصلے پر نادم ہوتا اور اس بیوی کو برقرار رکھتا ہے جس کو اس نے پچھلی رات یا دن کو طلاق دی تھی۔ شریعت میں رجعت کا حق مرد کو دوبارہ مل گیا ہے۔ اگر وہ تیسری بار طلاق دے گا تو طلاق واقعی ہوتی ہے اور پھر معاملہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ غصے میں علی نے ندا کو تیسری طلاق بھی دے دی تھی اور اب اس کو رجعت کا حق نہیں رہا تھا، البتہ اگر ندا کسی اور مرد سے نکاح کر لیتی اور وہاں سے بھی اس کو طلاق ہو جاتی تو پھر یہ ممکن تھا کہ علی، ندا سے دوبارہ نکاح کرے۔ میں نے علی سے پوچھا: ''علی! اب ندا کس سے شادی کر رہی ہے؟'' علی نے غصے سے مجھے گھورتے ہوئے سرد مہری سے کہا: ''نہیں، نہیں۔ ندا کا ارادہ کسی اور سے شادی کرنے کا نہیں ہے؟''

''ندا اپنے حسن و خوبصورتی کی وجہ سے طبقۂ نسواں میں بہت مقبول ہے۔ ایک بار اس کی آزادی کی خبر پھیلی تو کئی مائیں اور بہنیں اپنے بیٹوں اور بھائیوں کے

رشتے کے لیے ندا سے پوچھیں گی۔'' میں نے کہا۔

سارہ نے ہم بہن بھائی کی تکرار میں مداخلت کرتے ہوئے علی سے پوچھا: ''علی! تمہیں کس چیز نے طلاق پر آمادہ کیا؟'' اس پر علی نے کہا کہ طلاق اس کا نجی معاملہ ہے۔ نورہ اور طاہانی نے اس سے سے گزارش کی کہ وہ ندا کے پاس جا کر علی کی طرف سے وضاحت کریں' اور اس کو قائل کرنے کی کوشش کریں کہ اس نے طلاق کے الفاظ جلدی میں کہے تھے اور اس کو یہ ثابت کرنے کا موقع دے کہ وہ طلاق دینے کی کوئی حقیقی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ اگر ندا صورتحال کو نظرانداز کر کے حکام کو آگاہ نہ کرے۔ تو وہ اس کو اپنا گھر چھوڑنے کو نہ کہے گا۔ اس طرح وہ کسی اور مرد کی منکوحہ نہیں بنے گی۔

گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو علی نے لیموزین کے گہرے سیاہ پردوں میں سے باہر دیکھا اور نقابوں' سائلہ اور عبایہ کے سیاہ ڈھیر کی طرف اشارہ کیا: ''جلدی تیار ہو جاؤ' ہم ریاض پہنچ گئے ہیں۔''

ہم چاروں کار کے اندر تنگ جگہ میں اپنے سیاہ ملبوسات سے نبرد آزما ہو گئیں۔ علی گاڑی کو ٹارمک پر ہمارے نجی طیارے کے قریب لے گیا تھا۔ ہمیں بیرونی لبادے پہننے کا موقع نہ ملا تھا۔ ہم ایک نجی کلینک میں پہنچے' جو ایک لبنانی اور سعودی کی ملکیت تھا۔ جب رازداری کا معاملہ ہوتا تو شاہی خاندان کے لوگ اسی کلینک سے رجوع کرتے تھے۔ میں تین شہزادیوں کے متعلق جانتی تھی جو منشیات اور شراب استعمال کرنے کی بنا پر یہاں آتی تھیں۔

ریما کا ایک معالج ہمیں کلینک میں ملا۔ وہ بیروت سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کو حال ہی میں شاہی خاندان کے افراد کی دیکھ بھال کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ وہ اونچا لمبا' پرکشش اور ادب و آداب سے بخوبی واقف تھا۔ وہ ہم لوگوں کو ریما کے کمرے میں لے گیا۔ ریما اس وقت آرام کر رہی تھی۔ اس نے ہماری آوازیں سن کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور آنکھیں خوفزدہ بچوں کی طرح لگ رہی

تھیں۔ اس کو لوہے کے اسٹینڈ سے لٹکتی ہوئی بوتلوں کی مدد سے سیال اشیاء دی جا رہی تھیں۔

نورہ نے آگے ہو کر ریما کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ سارہ اور طاہانی نے دلاسا دینے کے لیے اس کے ہاتھ تھام لیے۔ وہ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مجھے وہ بمشکل نظر آ رہی تھی۔ میں نے خود کو ایک سفید آرام کرسی میں گرا لیا۔ میں نے اپنے دانتوں سے ہونٹ کاٹ لیے، یہاں تک کہ ان سے خون رسنے لگا۔ میں نے شدت جذبات سے اپنے ہاتھ اتنے زور سے کرسی پر مارے کہ میری انگلیوں کے تین ناخن ٹوٹ گئے۔ علی سارہ سے ایک گھنٹہ بعد آنے کا کہہ کر چلا گیا۔ میرے اندر اپنی بہن کی حالت دیکھ کر ایک آگ بھڑک رہی تھی۔ میرا دل کر رہا تھا کہ یہ آگ پورے ملک میں پھیل جائے اور سلیم جیسے بدقماش اور بدفطرت مرد جل کر بھسم ہو جائیں۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ سلیم آخرت میں یقیناً اپنے اعمال کی سزا ابدی جہنم کی صورت میں پائے گا مگر مجھ میں گرفت خداوندی کا انتظار کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ نورہ نے ریما کو تسلی و تشفی دی تو اس نے باری باری ہر بہن سے بات کی اور ہم سب سے التجا کی کہ ہم سلیم کے ساتھ پہلے کی طرح احترام سے پیش آئیں کیونکہ اچھے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ غلطی کرنے والے کو معاف کر دے میرے چہرے پر غیض و غضب دیکھ کر ریما نے قرآن کی ایک آیت پڑھی، جس کا مفہوم ہے کہ معاف کر دو، خواہ تم غصے کی حالت میں ہو۔

تب سارہ نے میرے چٹکی کاٹتے ہوئے مجھے احساس دلایا کہ میں ریما کی تکلیف میں اضافہ نہ کروں۔ میں ریما کے قریب ہو کر اس کے چہرے کو تکنے لگی۔ ریما نے ہونٹ بھینچ کر کہا کہ سلیم اپنے اس فعل پر پچھتا رہا ہے اور اس نے اس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ کبھی اس پر تشدد نہیں کرے گا۔ وہ اس کو طلاق نہیں دے گا اور وہ بھی طلاق نہیں لے رہی۔ وہ اپنے بچوں کی وجہ سے سلیم کو معاف کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ایک مصری نرس نے نورہ کو چپکے سے بتایا کہ آج صبح سلیم اپنی بیوی کے کمرے میں آیا تھا۔ اس نے ریما کا گاؤن اٹھا کر وہ سوراخ دیکھا تھا جو فضلہ باہر نکالنے کے لیے بنایا

گیا اور اس کو دیکھ کر نفرت سے کہا تھا کہ وہ اسے طلاق نہیں دے گا۔ مگر وہ اس کے بستر پر نہیں آئے گا کیونکہ وہ اتنی ناگوار بو برداشت نہیں کر سکتا۔

علی ہمیں کلینک سے نورہ کے گھر لے گیا۔ علی نے سارہ سے وعدہ لیا۔ انہوں نے کہا کہ نورہ کا ڈرائیور ان دونوں کو ندا کے ہاں لے جائے گا۔ علی وہ رات کسی اور بیوی کے ہاں ٹھہرے گا۔ میں نے بھی ندا کے پاس جانے کی خواہش ظاہر کی تو نورہ نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ندا کو علی سے الگ ہو جانے کا مشورہ نہیں دوں گی۔ میں نے اپنے طور پر ذہن میں یہ فیصلہ کر رکھا تھا کہ ندا سے کہوں گی کہ وہ ضرور دوسری شادی کر لے۔ تا کہ علی کو اپنی پیاری بیوی چھن جانے کا سبق ملے' جس نے بیویوں کو کھلونا سمجھ رکھا ہے۔ لیکن اب مجھے مجبوراً اس وعدے کو نبھانا تھا۔

شام کے تقریباً نو بجے ہم علی کے ہاں پہنچے۔ وہاں بالکل خاموشی تھی۔ جس وقت ہماری کار علی کے چار محلات کا احاطہ کرنیوالے چوڑے سرکلر ڈرائیو پر رکی تو ہمیں اس کی بیویوں' داشتاؤں اور بچوں میں سے کوئی بھی نظر نہ آئے۔ ندا کے محل کی مصری ہاؤس کیپر نے ہمیں بتایا کہ اس کی مالکہ اس وقت غسل کر رہی ہے۔ وہ ہمیں محل کے اندر لے گئی۔ جہاں کی آرائش و آسائش سے سعودی تیل کی دولت پوری طرح سے ظاہر ہوتی تھی۔ محل کا ہال وے ائیر پورٹ ٹرمینل جتنا چوڑا اور سفید سنگ مرمر سے بنا ہوا تھا۔ سیڑھیوں کے چھوٹے ستونوں پر خالص چاندی چڑھی ہوئی تھی' جو دمک رہی تھی۔ پندرہ فٹ اونچے دروازوں کی گول دستیاں بھی چاندی کی تھیں۔

میں نے اس سے پہلے ندا کی خواب گاہ نہیں دیکھی تھی۔ سارہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا بیڈ ٹھوس ہاتھی دانت کا بنا ہوا ہے اور آج میں نے دیکھ لیا۔ علی نے ایک بار فخر سے ان ہاتھیوں کی تعداد بھی بتائی تھی جن کی ہلاکت کے بعد یہ بھاری بھرکم بیڈ وجود میں آیا تھا۔ اس دولت کی زیادتی اور فضول خرچی کو دیکھتے ہوئے میں سوچنے لگی کہیں خاندانِ سعود کا حشر بھی مصر کے شاہ فاروق' شہنشاہ ایران رضا پہلوی اور لیبیا کے شاہ ادریس جیسا نہ ہو۔ اگر سعودی عرب کا محنت کش طبقہ شہزادہ علی السعود کی نجی رہائش گاہ کا نظارہ

کرے تو سعودی عرب میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اس بھیانک خیال نے میرے جسم کو سن کر دیا۔ ندا خیرہ کن سنہری لباس زیب تن کیے حسن کے لشکارے مارتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں سمجھ گئی کہ علی اپنی اس حسین ترین بیوی پر جی جان سے نثار کیوں ہے۔ ندا نے آتے ہی کہا: ''علی نے آپ کو بھیجا ہے' کیا ایسا نہیں؟''

اس کے اس جملے پر مجھے احساس ہوا کہ میں نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ چنانچہ نورہ اور سارہ کو ندا کے پاس چھوڑ کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے اٹھ آئی کہ میں اپنے لیے مشروب لانے کے لیے بار میں جا رہی ہوں۔ بار میں میں نے ٹانک اور جن کا مشروب پیا اور پھر اپنے بھائی کے نہایت وسیع و عریض محل میں ادھر ادھر گھومتی پھری اور اس کی نجی سٹڈی میں جا نکلی۔ وہاں رائٹنگ ٹیبل پر ایک چھوٹا سا پیکٹ پڑا تھا۔ میں نے پیکٹ کھولا تو اس میں زیر جاموں کے ایک سیٹ کی تفصیل درج تھی۔ جو علی نے ہانگ کانگ کے دورے کے دوران خریدے تھے۔ ایک اور کاغذ پر زیر جاموں کے بارے میں ہدایات دی گئی تھیں۔ ملاحظہ کیجیے: ''ونڈر گارمنٹ: اسے روزانہ پہنا جائے۔ یہ پہننے والے کو بہتر جنسی کارکردگی کی ضمانت دیتا ہے۔ اس انڈر پینٹ کا خفیہ راز یہ ہے کہ اس کی تھیلی ''جسم'' کو صحیح درجۂ حرارت پر اور انتہائی پسندیدہ حالت میں رکھتی ہے۔ یہ ونڈر گارمنٹ تمام مردوں کے لیے موزوں ہے' اور ان کے لیے موزوں ترین ہے جو مستعد جنسی زندگی بسر کرتے ہوں اور ان کے لیے بھی جو کرسی پر بیٹھ کر کام کرتے ہوں۔''

یہ تفصیل پڑھ کر میری ہنسی نکل گئی۔ پھر بدروح مجھ پر غالب آ گئی۔ میں نے پہلے پلاسٹک بیگ اور پھر ہدایت نامہ سمیت زیر جامے کا سیٹ اپنے طویل لبادے میں ٹھونس لیا۔ اس وقت کچھ ذہن میں نہیں تھا کہ اس کا کیا کروں گی' تاہم یہ طے کر لیا کہ کریم کو اس راز سے آگاہ کر دوں گی۔ اپنے بھائی کے ساتھ لڑکپن کی چھیڑ چھاڑ کے متعلق سوچتے ہوئے میں نے دل میں کہا کہ علی ان جادوئی زیر جاموں کو اپنے پورے گھر میں ڈھونڈتا پھرے گا تو مجھے کس قدر تسکین ملے گی۔ میں سیڑھیوں پر اپنی بہنوں سے ملی تو ان کے چہروں سے اندازہ ہو گیا کہ انہیں اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوئی۔ گویا ندا'

علی کو چھوڑ رہی تھی۔

ریما کے برعکس ندا کو بچوں کے حوالے سے کوئی پریشانی نہ تھی کیونکہ علی کو اپنی بیٹیوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا اور اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہ سکتی ہیں۔ میں ندا کو خدا حافظ کہے بغیر چلی آئی۔

ندا نے میری بہنوں کے سامنے روتے ہوئے اعتراف کیا تھا کہ اسے تین طلاقیں جنس کے مسئلے پر دی گئی ہیں۔ علی نصف شب گزر جانے کے بعد اسے گہری نیند سے جگا کر اختلاط کرنے پر اصرار کرتا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے ندا نے انکار کر دیا تھا اور علی نے یہ کہہ کر اصرار کیا تھا کہ جب مرد اپنی بیوی کو بلائے تو اسے انکار نہیں کرنا چاہیے' خواہ وہ اس وقت اونٹ پر ہی کیوں نہ سوار ہو۔ ندا نے پھر انکار کیا تو علی نے اسے طلاق دے دی۔ ندا نے یہ بھی کہا تھا کہ اگرچہ اسے علی کی دوسری بیویوں سے کچھ محبت ہے مگر وہ ان حرام زادوں اور حرام زادیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے تنگ آ گئی ہے' جنہوں نے علی کی حرام کاریوں کے نتیجے میں جنم لیا ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ جہاں ہمارے بھائی کے سترہ جائز بچے تھے وہاں تئیس ناجائز بچے بھی تھے اور وہ احاطہ جسے ندا اپنا گھر کہتی تھی' اس میں اس کے شوہر کی داشتائیں اور ان کے بچے کلکاریاں مارتے پھرتے تھے۔ اس پس منظر میں مجھے پھر علی کے زیر جامے کا خیال آ گیا اور میں ہنسنے لگی' حتیٰ کہ آنسو میرے گالوں پر بہہ نکلے مگر میں نے اپنی اس ناقابل ضبط خوشی کا سبب اپنی بہنوں کو بتانے سے انکار کر دیا' جو سمجھتی تھیں کہ دن بھر کے المناک واقعات نے ان کی چھوٹی بہن کے حواس چھین لیے ہیں۔

☆☆☆

مناکو سے آئے ہوئے ہمیں ایک ہفتہ ہو گیا تھا اور دو روز بعد ہمارے خاوند اور بچے سعودی عرب واپس آنے والے تھے۔ رات کے وقت ہم سب دس بہنیں نورہ کے گھر میں اکٹھی تھیں۔ اسی صبح ریما کو ہسپتال والوں نے ڈسچارج کیا تھا۔ یہ وقت خوشی اور غمی کا امتزاج لیے ہوئے تھی کیونکہ ہم اپنی پیاری ماں کی بیسویں برسی پر جمع ہوئیں

تھیں۔ جب میں نے ذکر چھیڑا کہ ہم میں سے آٹھ بہنیں اس عمر سے بڑی ہو گئی ہیں' جو ہماری ماں کی' وفات کے وقت تھی تو نورہ نے مجھے روک دیا۔ وہ خود اب نواسوں اور پوتوں والی تھی اور گزشتہ چند سالوں میں اس کی عمر پر بات چیت کرنا ممنوع قرار پایا تھا۔ تب ریما نے یہ کہہ کر ہم سب کو خاموش رہنے کا کہا کہ ماں کے حوالے سے اس کے پاس ایک ایسی کہانی ہے جو اس نے اب تک کسی کو نہیں سنائی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔ جب میں نے کہانی سننے کا اشتیاق ظاہر کیا تو ریما نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں جذبات میں آ کر اس سے بحث و تکرار نہیں کروں گی۔ میں نے ہنستے ہوئے وعدہ کر لیا۔

جب میں صرف آٹھ برس کی تھی تو ریما کو ماں نے اپنی خوابگاہ میں بلایا تھا اور اس سے پکا وعدہ لیا تھا کہ وہ اس بات کو راز میں رکھے گی۔ پھر ماں نے اسے بتایا تھا کہ ''سلطانہ چور ہے۔'' یہ سن کر میں حیرت سے آنکھیں جھپکنے لگی جبکہ میری بہنوں نے ٹھٹھا مارا۔ کہانی یہ تھی کہ امی نے اپنی سب سے چھوٹی بچی کو گھر میں دوسروں کی ذاتی چیزیں چراتے ہوئے پکڑا تھا۔ میں کھلونے' کتابیں' ٹافیاں' بسکٹ حتیٰ کہ وہ چیزیں بھی چراتی دیکھی گئی تھی جو میرے کام کی نہیں تھیں مثلاً علی کا ریکارڈوں کا مجموعہ۔ ماں نے ریما کو بتایا تھا کہ اس نے ہر کوشش کر دیکھی تھی کہ مگر میں باز نہیں آئی تھی۔ اب ماں میری روح کو بچانے کے لیے ریما کا تعاون چاہتی تھی۔ اس نے ریما سے قسم لی تھی کہ ہر بار جب وہ نماز پڑھے گی تو اللہ سے دعا کرے گی کہ وہ سلطانہ کی حفاظت کرے' اس کی رہنمائی کرے اور اسے معاف کر دے۔

ریما کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے' جب اس نے مجھ پر نظریں جماتے ہوئے کہا: ''سلطانہ! میں ہر نماز اور ہر دعا میں اپنی ماں سے کیا ہوا وعدہ پورا کرتی رہی اور ان دعاؤں کا نتیجہ ہے کہ اب تم چور نہیں ہو۔'' اس کے ساتھ ہی کمرے میں آٹھ دوسری بہنوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ ہر کوئی اپنی کہانی سنانا چاہتی تھی۔ درحقیقت ماں نے میرے سوا ہر بہن سے ایک عہد لیا تھا کہ یہ راز صرف اس تک محدود رہے۔ جب

صورتحال کی سچائی ہم پر آشکار ہوئی تو سب کو ہنسی کے دورے پڑنے لگے، جن سے نورہ کا سارا محل گونج اٹھا۔

میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں تھی کہ میری تمام بہنیں میرے حق میں دعائیں کرتی آ رہی تھیں۔ طاہانی نے مذاق کے لہجے میں مجھ سے پوچھا: ''سلطانہ! کیا ہماری دعائیں واقعی بارور ہوئی ہیں اور جوان ہو کر تم نے کبھی کوئی چیز نہیں چرائی؟''

میری بہن توقع کر رہی تھی کہ میرا جواب ''نہ'' ہوگا۔ کیونکہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ میں ایک گھٹیا چور ہوں۔ میں اپنے چہرے پر چور مسکراہٹ سجائے علی کے وِنڈر گارمنٹ کے بارے میں سوچ رہی تھی، جواب میں میرے سامان میں بند میرے کمرے میں پڑا تھا۔

میں نے بہنوں سے اجازت لی اور اپنے کمرے میں گئی۔ جب لوٹ کر آئی تو انہیں اپنی آنکھوں اور کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں علی کا زیرجامہ پہن کر چلی آئی تھی اور جب اس کے ساتھ منسلک ہدایت نامہ پڑھتے ہوئے دو کیلے زیرجامے کی خصوصی تھیلی میں اڑس لیے تو نورہ نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ پھر سب بہنیں ہنستی ہوئی لوٹ پوٹ ہو گئیں اور کمرے سے نکل گئیں، جبکہ ایک نے یہ بتانے میں کوئی عار نہیں جانی کہ اس کی پتلون گیلی ہو گئی ہے۔ ہماری ہنسی کے فوارے اس قدر بلند تھے کہ نورہ کے تین ملازم خاص دور واقع باغیچے سے بھاگے آئے کہ خدا جانے کیا حادثہ پیش آیا ہے۔

اسی اثنا میں فون کی گھنٹی بجی اور ہمیں اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ یہ منا کو سے سارہ کی بیٹی نشوہ کا فون تھا جو اپنی ماں سے بات کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی خالہ زاد امانی یعنی میری بیٹی کی شکایت کر رہی تھی۔ میری بیٹی امانی، اپنی کزن نشوہ کو نیکی کی تلقین کرتی اور برائیوں سے روکتی رہتی تھی۔ وہ اسے میک اپ کرنے، نیل پالش اور دھوپ کا چشمہ لگانے سے منع کرتی تھی۔ نشوہ کو یہ وعظ و نصیحت بالکل پسند نہیں تھی، چنانچہ اس نے فون پر اپنی ماں کو کہا کہ اگر کسی نے امانی کو نہ روکا تو وہ اپنے تین فرنچ دوستوں کو اس کے پیچھے

لگا دے گی جو سیاحوں سے بھرے علاقے میں اس کے کپڑے اتار دیں گے اور اس کے بدن پر صرف زیر جامہ رہنے دیں گے۔

میں کمرے سے باہر گئی اور کریم کو فون کیا اور اسے اپنی بیٹی اور اس کی خالہ زاد کے درمیان کشاکش سے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ اس نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا ہے کہ ریاض واپسی تک وہ ہر وقت امانی کو اپنے ساتھ رکھے گا کیونکہ اس روز ہماری بیٹی نے مونٹی کارلو میں ایک ہوٹل کے مینیجر سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ مردوں اور عورتوں کے لیے الگ الگ لفٹوں کا اہتمام کرے۔ کریم نے یہ بھی کہا کہ ریاض واپسی پر امانی کا نفسیاتی علاج کرایا جائے گا۔ جب میں دوبارہ کمرے میں آئی تو سب بہنیں سعودی عرب کی خاندانی قیادت کے خلاف ملک کے اندر جنگجویانہ بنیاد پرستی کے خطرے کے حوالے سے بحث کر رہی تھیں۔ ان کے شوہروں کو بھی اس پر تشویش تھی۔ میں اس بحث میں نہیں پڑی کیونکہ میری اپنی بیٹی انتہا پسند گروہ میں شامل تھی جو سلطنت کی مخالفت پر بری طرح تلا ہوا تھا۔

جب مسلم انتہا پسندی کا موضوع بور کرنے لگا تو ریما نے کہا اس کے پاس ایک اور کہانی ہے جو وہ سنانا چاہتی ہے۔ مجھے اس خدشے نے آلیا کہ کہیں وہ میرے کسی اور گناہ سے پردہ نہ اٹھا دے' البتہ اس نے یہ کہہ کر میرا خدشہ دور کر دیا کہ سلیم نے ایک اور شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

جہاں ہمارے ابو نے چار شادیاں کر کے ہماری ماں کو اذیت سے دوچار کیا تھا' وہاں ریما ہم میں سے پہلی بہن تھی۔ جس کا خاوند دوسری شادی کر رہا تھا۔ میرا دل سینے میں پھڑ کنے لگا اور آنکھوں میں آنسو امڈ آئے مگر ریما نے یہ کہہ کر ہمیں واویلا کرنے سے روک دیا کہ وہ ایک نظر انداز کی ہوئی بیوی کی حیثیت سے تب تک خوشی خوشی رہ سکتی ہے جب تک اسے بچوں سے جدا نہیں کیا جاتا۔ اس نے زبان سے اپنی خوشی کا اظہار کیا مگر اس کی آنکھیں ایک الگ سچائی بیان کر رہی تھیں۔ میں جانتی تھی کہ ریما نے اپنے شوہر سے سچی محبت کی ہے اور ایک وفادار بیوی ہونے کی حیثیت سے اس کو اس کا صلہ

نہیں ملا۔ تاہم اب اپنی بہن کی خوشی کی خاطر ہم سب نے اسے مبارکباد دی۔

نورہ نے اعلان کیا کہ ندا ایک بار پھر علی کی بیوی بن گئی ہے۔ ہمارے بھائی نے ایک دستاویز پر دستخط کر دیئے تھے اور اچھی خاصی دولت ندا کے حوالے کر دینے کے علاوہ اسے ہیروں اور جواہرات کی خریداری کے لیے پیرس کا دورہ بھی کروایا تھا۔ حلالہ کی مشکل سے نکلنے کے لیے اس نے اپنے ایک سعودی کزن کو آمادہ کر لیا تھا کہ وہ ندا سے نکاح کر کے اس سے ازدواجی تعلق استوار کیے بغیر طلاق دے دے۔ اس شرط کے پورا ہونے پر علی اور ندا نے پھر نکاح کر لیا تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو اپنے بھائی علی سے ہمدردی محسوس ہوئی، جس نے اپنے گناہوں کے کھاتے میں ایک اور گناہ کا اضافہ کر لیا تھا۔

شام ختم ہو رہی تھی، جب ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ نورہ کے ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ طاہانی کے لیے فون آیا ہے۔ طاہانی چلی گئی مگر جب دوسرے کمرے سے اس کی چیخ سنائی دی تو ہم سب بہنیں اس طرف لپکیں۔ وہ فون ہک پر رکھ کر زور زور سے رو رہی تھی۔ اسے چپ کرانے میں ہمیں کافی دیر لگی۔ اس نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا کہ سمیرا مر گئی ہے۔

ہم سب بے حس و حرکت ہو گئیں۔ اس خبر پر کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں انگلیوں پر ان سالوں کی تعداد گننے لگی جو اس بے چاری لڑکی نے ''زنانہ قید خانے'' میں بند رہ کر گزارے تھے۔ وہ پندرہ سال قید رہی تھی۔

سمیرا کے ماں باپ ایک کار حادثے میں ہلاک ہو گئے تھے، یوں اس کا چچا اس کا سرپرست بن گیا تھا۔ سمیرا ایک نوجوان سے محبت کرتی تھی۔ اس کے ہمراہ بھاگ گئی تھی۔ تب اسے چالاکی سے واپس سعودی عرب لایا گیا تھا اور ایک ایسے شخص سے اس کی شادی کر دی گئی تھی، جو اس کی پسند کا نہ تھا۔ جب سہاگ رات کو انکشاف ہوا کہ وہ پہلے ہی دوشیزگی گنوا چکی تھی تو چچا کے غصے کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ اس نے بھتیجی کو ''زنانہ قید خانہ'' میں ڈال دیا تھا۔ اس دوران کئی ایک نے کوشش کی تھی کہ خوبصورت اور خوش

مزاج سمیرا آزاد ہو جائے کیونکہ اس کی ابدی ارضی سزا اس کے گناہ سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن اس کا چچا نہیں مانا تھا۔

طاہانی سسکیاں لے رہی تھی۔ خاصی دیر بعد اس نے بتایا کہ سمیرا کو آج دفن کر دیا گیا ہے۔ سمیرا کی چچی نے فون پر بات کرتے ہوئے کہا تھا کہ تمام تر سختیوں کے باوجود سمیرا لینن کے سفید کفن میں لپٹی خوبصورت لگتی تھی۔ مجھے خلیل جبران کا ایک قول یاد آ گیا جو اس نے موت کے سوال پر کہا تھا...... "جب تم خاموشی کے دریا سے پیو گے تبھی تم فی الواقع گاؤ گے اور جب تم پہاڑ کی چوٹی پر پہنچو گے تب تم اوپر چڑھنے لگو گے اور جب زمین تمہارے جسم کو چھپا لے گی تو تم حقیقتاً رقص کرنے لگو گے۔"

میری تمام بہنوں اور میں نے مل کر ہاتھوں میں ہاتھ دے کر ایک زنجیر بنائی جو اس امر کی علامت تھی کہ ہم بہنیں اپنے خون کی نسبت سے زیادہ بہناپے کے رشتے میں مضبوطی سے جڑی ہیں۔ اس وقت میں نے کہا: "دنیا کو یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ سعودی عرب کی خواتین اس شعور کے ساتھ قوت پکڑ رہی ہیں کہ وہ حق پر ہیں۔"

(غیر ملکی زبانوں سے خواتین ادیبوں کے منتخب افسانوں کے اردو تراجم)
عورت کتھا
انتخاب و ترتیب
یاسر حبیب
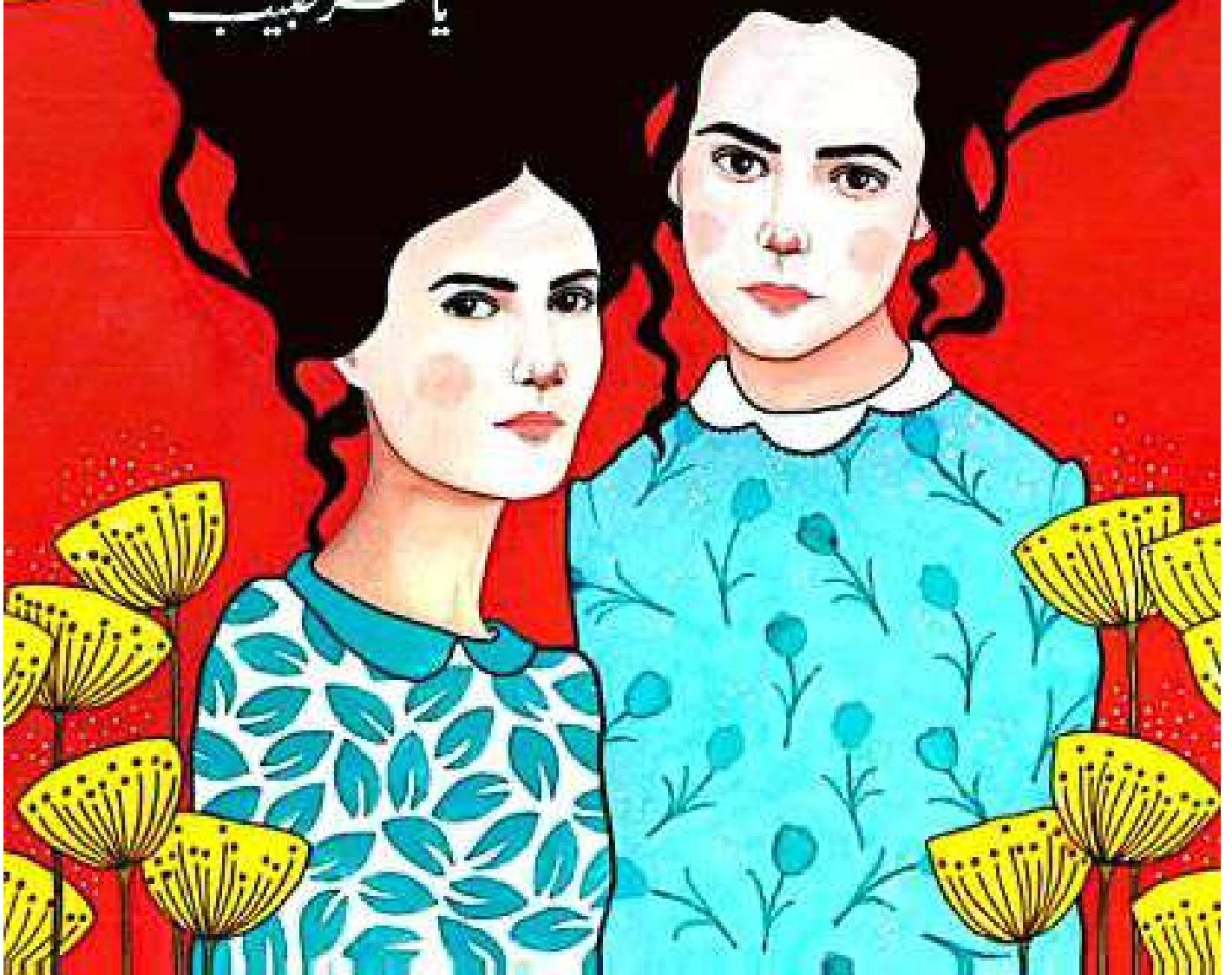
Writers

Africa

Fadila al-Faruq
Grace Ogot
Nawal El Saadawi
Mona Ragab
Leila Slimani
Rafiqat al-Tabi'a
Chimamanda Ngozi Adichie
Nadine Gordimer
Gcina Mhlophe
Nafila Dhahab

Asia

Selina Hossain
Feng Zhongpu
Anita Desai
Krishna Sobti
Devi Nangrani
Uma Devi
Alka sinha
Maitreyi Pushpa
Neena Paul
Mahadevi Verma
Nasira Sharma
Shobhaa De
Clara Ng
Mina Muhammadi
Sepideh Abraviz
Aliya Mamdouh
Hirabayashi Taiko
Layla Balabakki
Rukhsana Ahmad
Bina Shah
Sadia Shepard
Samiya Atut
Khayriya al-Saqqaf
Han Kang
Najiya Thamir
Mariam al-Saedi

South America

Lygia Fagundes Telles
Isabel Allende

Australia

Katharine Susannah Prichard
Katherine Mansfield

عورت کتھا - یہ کتاب معروف خواتین ادیبوں کے ۴۳ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ غیرملکی زبانوں کے ان افسانوں کے اردو تراجم ۲۷ ترجمہ نگاروں کی کاوشیں ہیں۔ ۴۳ کے قریب افسانے بالخصوص اس کتاب کے لیے ترجمہ کیے گئے ہیں۔ ان افسانوں کے ادیبوں کا تعلق براعظم افریقہ، ایشیا، جنوبی امریکا اور آسٹریلیا سے ہے۔ جن میں نوبل انعام یافتہ، مین بکر انٹرنیشنل انعام یافتہ، مین بکر انعام یافتہ اور دیگر معروف بین الاقوامی انعام حاصل کرنے والے ادیب بھی شامل ہیں۔ موضوع، اسلوب اور دور کے لحاظ سے مختلف افسانوں انتخاب کیا گیا ہے۔ کلاسک اور عصری ادیبوں کی تخلیق کا یہ انتخاب قارئین کو ضرور پسند آئے گا۔